جنون

PDFBOOKSFREE.PK

انورا حسن صدیقی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیش لفظ

''جنون''، نفس انسانی کے ان دہکتے ہوئے جہنموں کی کہانی ہے جن کی آگ کی لپٹوں سے زندگی کے بے شمار ہیولوں کی صورت گری عمل میں آتی ہے۔ یہ انفرادی نقطہ نظر سے پسند و ناپسند اور نیکی و بدی کے ان اضافی تصورات کی کہانی ہے جو کبھی تو مریضانہ مسرت اور اضطراب آمیز اطمینان کا سبب بنتے ہیں اور کبھی گزرانِ وقت کے ساتھ گہرے المیوں میں ڈھل کر ایسی پشیمانی کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں جس کی مکمل تلافی کی کوئی صورت نہیں ہوتی اور جس کے اثرات کو کم کرنے کے لیے طویل تزکیہ نفس کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ ایسے انسانی رشتوں کی کہانی ہے جو بے شمار نازک پیچ وخم سے گزرتے ہوئے زندگی کے پُرآشوب سفر میں اپنا راستہ بناتے چلے جاتے ہیں اور ہر موڑ پر ایک نئی جذباتی دنیا کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ بہت ساری الگ الگ باہمی متصادم اور خلش انگیز جذباتی دنیائیں ہیں جن سے مل کر ''جنون'' کی پوری کہانی وجود میں آتی ہے۔

یہ ان لوگوں کی بھی کہانی ہے جو اپنے ذاتی المیوں کی یورش سے اپنے وجود کو شکستہ ہونے سے بچاتے ہیں اور اپنے ذاتی المیوں کو اپنے سماجی شعور کا حصہ بنا کر ان سے عمومی زندگی کی تزئین وتہذیب کا کام لیتے ہیں۔ یہ تجسس، تلاش اور حقیقت تک پہنچنے کی سخت اور صبر آزما جدوجہد کی کہانی ہے جس میں کئی جگہ ایسے پڑاؤ آتے ہیں جہاں ہر چیز ختم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن عزم اور خرد پھر ایک نئے آغاز کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر منزل تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔

یہ بے لوثی اور حتی المقدور ایمان داری کے ساتھ کام کرنے والے بعض ایسے سرکاری اہل کاروں کی بھی کہانی ہے جو ایسے بھٹکے ہوئے انسانوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں جو بصورت دیگر مکمل نیستی کا ایک حصہ بن کر ختم ہو جاتے ہیں۔

اس طویل اور پیچیدہ کہانی میں جو مختلف کردار نظر آتے ہیں وہ وہی ہیں جن سے حقیقی زندگی میں ہمارا آئے دن واسطہ پڑتا رہتا ہے اور ان کے متنوع رویے ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

انور احسن صدیقی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چودہ انچ کا پرانا رنگین ٹی وی سیٹ وہ آخری شے تھا جسے مختار نے احتیاط کے ساتھ سوزوکی میں رکھا۔ صرف چار ماہ پہلے ہی اس نے یہ ٹی وی ساڑھے تین ہزار روپے میں ایک پڑوسی سے خریدا تھا، جس نے اب زیادہ بڑا ٹی وی لے لیا تھا اور پرانے ٹی وی کو بیچ دینا ضروری ہوگیا تھا۔

اس ٹی وی کو سوزوکی میں رکھنے کے بعد بھی سوزوکی میں کافی جگہ تھی۔ بھلا ایک چھوٹے سے کمرے کا سامان ہی کیا تھا۔ پائپ کے بنے ہوئے نواڑ کے فولڈنگ پلنگ کو موڑ کر سوزوکی کے اندر ایک کنارے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ یہی سب سے بڑی چیز تھی، جسے کمرے سے نکال کر سوزوکی میں رکھا جانا تھا۔ دو کرسیاں اور ایک چھوٹی سی میز بھلا کتنی جگہ لے سکتی تھیں اور باقی چیزیں تو ان سے بھی چھوٹی تھیں۔

''لو بھائی، اپنا تو آب و دانہ اٹھ گیا تمہارے گھر سے۔'' مختار نے سوزوکی میں رکھے ہوئے سامان پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے مسکرا کر فرقان سے کہا، جو گھر کے دروازے کے باہر سوزوکی کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔

''بھائی کہا سنا معاف کرنا۔'' فرقان کی آواز میں ہلکے سے دکھ کا شائبہ شامل تھا۔ ''ہم نے کوشش تو یہی کی کہ تم کو ہماری ذات سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ پھر بھی انجانے میں مجھ سے یا تمہاری بھابی سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو''۔

''ہاں بھیا۔'' دروازے میں کھڑی ہوئی فرقان کی بیوی زبیدہ نے فوراً ہی اپنے میاں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''کہا سنا معاف کرنا۔''

''ارے..... کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ؟'' مختار نے جلدی سے کہا۔ ''میرا تو یہاں جتنا بھی وقت گزرا، بہت اچھا گزرا۔ آپ لوگ تو میرے اپنوں کی طرح تھے۔''

''پھر آنا بھیا۔'' زبیدہ نے مختار سے کہا، جو فرقان سے گلے مل رہا تھا اور گلے ملنے کے بعد وہ سوزوکی میں سوار ہونے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ضرور آؤں گا بھابی۔'' مختار نے کہا۔ ''جب بھی ادھر کا پھیرا ہوگا، آپ لوگوں کے پاس ضرور آؤں گا۔''

مختار سوزوکی میں بیٹھ گیا اور سوزوکی وہاں سے روانہ ہوگئی۔

سوزوکی کے وہاں سے روانہ ہوتے ہی فرقان اور اس کی بیوی زبیدہ دونوں اپنے مکان کے اس کمرے میں داخل ہوگئے جس میں اب تک مختار کرایہ دار کے طور پر رہ رہا تھا۔

چھوٹا سا کمرہ بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔ اس میں ایک طرف دیوار میں جو الماری بنی ہوئی تھی، اس کے دونوں پٹ اس وقت کھلے ہوئے تھے۔ مختار نے اس میں سے اپنا سامان نکالنے کے بعد اس کو یوں ہی کھلا چھوڑ دیا تھا۔

فرقان اور اس کی بیوی زبیدہ، دونوں اداسی کے ساتھ اس خالی کمرے کو دیکھ رہے تھے۔ کسی انسانی وجود کے بغیر خالی در و دیوار کس قدر بے جان، مردہ اور بے معنی معلوم ہوتے ہیں اور خاص طور سے اس صورت میں جبکہ ان میں موجود انسانی وجود کے ساتھ بہت سے مفادات بھی وابستہ ہوں۔

''اب دیکھو، نیا کرایہ دار کب نصیب ہوتا ہے۔'' زبیدہ نے آہستہ سے اپنے شوہر سے کہا۔ ''مختار سے تو اتنے دنوں تک ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اچھا آدمی تھا۔ ہمیشہ کرایہ بھی وقت پر دیتا تھا اور کسی چیز کا مطالبہ بھی نہیں کرتا تھا۔''

''میں نے محلے میں کئی لوگوں سے کہہ تو دیا ہے۔'' فرقان نے کہا۔ ''کوئی نہ کوئی اچھا آدمی مل ہی جائے گا۔ بس یہ ہے کہ شاید کچھ وقت لگ جائے۔''

''وقت ہی تو اصل چیز ہے افضل کے ابا۔'' زبیدہ نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''وقت آدمی کو بھگاتا ہے اور آدمی کو وقت کے ساتھ بھاگنا پڑتا ہے۔ اس میں کہیں رکنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بس جہاں بھی ذرا سا رکے اور سمجھو کہ وقت تمہیں دھکا دیتا ہوا آگے نکل گیا۔ اب دیکھو نا، جتنے دن بھی یہ کمرہ خالی رہے گا اتنے دن برابر ہمارا نقصان ہوتا رہے گا۔''

''کوشش تو یہی ہوگی کہ نقصان کم سے کم ہو۔'' فرقان نے کہا۔ ''میں کچھ اور لوگوں سے بھی کہوں گا۔ کمرے کو جلد از جلد دوبارہ کرائے پر اٹھ جانا چاہئے۔''

وہ دونوں کمرے سے باہر نکل آئے اور انہوں نے اس میں باہر سے تالا ڈال دیا۔ کمرے کا اندرونی دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔

فرقان اور زبیدہ کورنگی کے اس کوارٹر میں برسوں سے رہتے چلے آرہے تھے۔ یہ

کوارٹر فرقان کی اپنی ملکیت تھا اور جائیداد کے نام پر اس کا اور اس کی بیوی کا واحد اثاثہ، جسے ان دونوں میاں بیوی نے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ ان کے دو بچے تھے ..... افضل اور ثوبیہ.....

فرقان ایک تجربہ کار مکینک تھا اور کورنگی میں ہی واقع ایک پرنٹنگ پریس میں کام کرتا تھا۔ اس نے ساتویں جماعت تک تعلیم پائی تھی۔ اردو لکھنا پڑھنا اچھی طرح جانتا تھا۔ انگریزی سے بھی معمولی واقفیت تھی۔ کام ایسا تھا جس میں کسی نہ کسی طور پر لکھنے پڑھنے سے وابستگی رہتی تھی۔

زبیدہ اپنے میاں سے زیادہ پڑھی لکھی تھی۔ اس نے میٹرک پاس کیا تھا۔ اس کو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا اور وہ کبھی کسی کلاس میں فیل نہیں ہوئی۔ گھر کی فضا میں اگرچہ تعلیمی حوصلہ افزائی کا کوئی عنصر موجود نہیں تھا، کیونکہ گھر میں کوئی پڑھا لکھا شخص نہیں تھا، اس کے باوجود تیزی سے بدلتی ہوئی عمومی معاشرتی فضا میں بچوں میں خود ہی تعلیم کا شوق بڑھ رہا تھا۔ زبیدہ کا باپ ایک راج مستری تھا اور اس کے اور بھی بچے تھے۔ زبیدہ سب سے بڑی تھی، اس نے زبیدہ کو میٹرک تک تو پڑھا دیا، لیکن اس کے بعد اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ زبیدہ کالج بھی جانا چاہتی تھی اور کم از کم بی اے کرنے کی خواہشمند تھی، لیکن اس کے پیچھے دوسرے چھوٹے بھائی بہنوں کی جو ایک لائن لگی ہوئی تھی وہ اس کے کالج جانے کی راہ میں مزاحم ہوگئی۔ زبیدہ آگے نہ پڑھ سکی اور اسے اپنی ماں کے ساتھ مل کر باقی بھائی بہنوں کو سنبھالنے اور گھرداری کے کاموں میں مصروف ہو جانا پڑا۔

چند سال کے بعد زبیدہ کی شادی ہوگئی۔

شادی کے بارے میں زبیدہ کے بہت سارے خواب تھے، جنہیں وہ بڑی احتیاط کے ساتھ سب سے چھپا چھپا کر رکھتی تھی، لیکن جب اس کی شادی طے ہوگئی تو پھر اسے ان خوابوں کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ ایک معمولی شکل وصورت کی غریب گھرانے کی معمولی تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ تاہم اس کے خوابوں نے یہاں تک تو ہمت کی تھی کہ وہ کم از کم بی اے پاس سفید پوش ملازم شوہر کا تصور کر سکے، لیکن قسمت اس پر کچھ زیادہ مہربان نہیں رہی۔ اس کی شادی ایک ایسے شخص کے ساتھ کر دی گئی جو میٹرک پاس بھی نہیں تھا۔ تاہم برسر روزگار تھا اور اتنی سکت رکھتا تھا کہ اپنے خاندان کی پرورش کر سکے۔ زبیدہ کے والدین زبیدہ کے کسی خواب میں شریک نہیں تھے۔ ان کو زبیدہ کے ساتھ اپنے ان بچوں کے بارے میں بھی سوچنا تھا جو زبیدہ کے پیچھے لائن لگائے کھڑے تھے اور سہولتوں کے محدود ذخیرے میں سے اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے حصے کے منتظر تھے۔

زبیدہ نے اپنی پرواز بہت اونچی تو کبھی بھی نہیں رکھی تھی اور اپنے آسمان کی حدود کو ہمیشہ سمٹا ہوا ہی رکھا تھا، تاہم شادی کے بعد اسے یہ آسمان کچھ اور زیادہ مختصر ہوتا ہوا نظر آیا۔

لیکن اس نے سارے حالات سے مفاہمت کر لی اور اپنی زندگی کو ناکام سوچ کے عذابوں سے ہم کنار نہیں ہونے دیا۔

فرقان نیم خواندہ ضرور تھا، لیکن پھر بھی اس کی آمدنی اچھی خاصی تھی۔ وہ ایک ماہر مکینک تھا اور اسے اچھے خاصے پیسے مل جاتے تھے۔ وہ بآسانی کسی بھی بی اے پاس کلرک یا ہیڈ کلرک سے بہت زیادہ کمائی کر لیتا تھا۔

اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس نے زبیدہ کو اپنے دل کی گہرائیوں سے پیار کیا تھا۔ اس نے زبیدہ سے صرف محبت ہی نہیں کی، اس نے اس کو عزت بھی دی تھی۔ زبیدہ اس سے زیادہ پڑھی لکھی تھی۔ بالعموم ایسے مرد جو اپنی بیویوں کے مقابلے میں کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں، وہ ایک قسم کے کمپلکس کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنی بیوی کے سامنے اپنی مردانہ انا کو مجروح ہوتا ہوا پاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اپنی بیوی سے ان کا رویہ جارحانہ اور درشت ہو جاتا ہے اور وہ دوسرے طریقوں سے اپنی بیوی پر اپنی بالادستی قائم کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں، لیکن فرقان کے ساتھ ایسا کچھ نہیں تھا بلکہ اس کے برخلاف وہ تو اس بات سے خوش تھا کہ اس کی بیوی اس سے زیادہ پڑھی لکھی ہے، اور وہ اپنے دوستوں میں اس بات کو فخریہ انداز میں بیان کرتا تھا۔ وہ اس امر کا اعتراف خود زبیدہ کے سامنے بھی کرتا تھا اور زبیدہ کے احساسات کچھ ملے جلے ہوتے تھے۔ اسے یہ بات پسند بھی آتی تھی اور ناپسند بھی۔ اپنے شوہر سے زیادہ تعلیم یافتہ ہونا کوئی ایسی اچھی بات بھی نہیں تھی۔

فرقان کو رنگی میں ایک کوارٹر میں رہتا تھا اور زبیدہ کو بھی یہیں آ کر رہنا پڑا۔ فرقان کا پرنٹنگ پریس اس کے مکان سے زیادہ دور نہیں تھا۔

فرقان کے ساتھ بس اس کی ایک خالہ رہتی تھیں۔ اس کے والدین یا اور کوئی بھائی بہن نہیں تھے۔ زبیدہ جب بیاہ کر کورنگی کے اس کوارٹر میں آئی تو اس نے یہاں فرقان کے علاوہ صرف خالہ کو ہی موجود پایا۔

شادی کے بعد زبیدہ اپنی تعلیم کا سلسلہ تو دوبارہ شروع نہیں کر سکی لیکن اس نے ایک اور میدان میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے علاقے میں قائم ایک چھوٹے سے پرائیویٹ پرائمری اسکول میں نوکری کر لی اور بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اگرچہ تنخواہ بہت

معمولی تھی، لیکن یہ کیا کم بات تھی کہ یہ میاں کی کمائی میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس چھوٹی سی رقم سے گھر کے وہ بہت سے اخراجات پورے ہو جاتے تھے جن کے لیے بصورت دیگر اگلے ماہ تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ زبیدہ کو اپنا یہ نیا تجربہ بہت ہی اچھا لگا۔

افضل پیدا ہوا تو زبیدہ کے لیے اپنی نوکری کے حوالے سے کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ خالہ موجود تھیں۔ وہ گھر کو تو سنبھالتی ہی تھیں، اب وہ گھر کے ساتھ ساتھ بچے کو بھی سنبھال لیتی تھیں۔ زبیدہ سکون سے نوکری کرتی رہی۔

افضل کی پیدائش کے دو سال بعد زبیدہ کی بیٹی ثوبیہ پیدا ہوئی۔ زبیدہ کا کام تو بہت زیادہ نہیں بڑھا، البتہ خالہ کا کام بہت بڑھ گیا۔ پہلے ایک بچے کی دیکھ بھال ان کے ذمے تھی، اب دو بچے ان کی ذمے داری بن گئے لیکن بیوہ اور بے سہارا خالہ، جن کا اس دنیا میں فرقان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، اس بار کو ہنسی خوشی برداشت کر رہی تھیں۔ اس گھر میں انہیں جو تحفظ اور طمانیت قلب حاصل تھی، اس کے عوض کی جانے والی مشقت بھی ان کے لیے راحت کا ذریعہ تھی اور ویسے بھی ان کی نہ تو کوئی تقسیم شدہ محبتیں تھیں، نہ تقسیم شدہ ذمہ داریاں۔ بس یہی گھر تھا، اس گھر کے لوگ تھے، اس گھر کے بچے تھے۔ تو وہ ان کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھیں، بلکہ سب کچھ کر رہی تھیں۔ مشقت کے ساتھ مسرت اور سکون قلب کا جو ایک احساس تھا وہ ان کے لیے ایک وحدت کی شکل رکھتا تھا۔ اس وحدت میں کہیں کوئی شگاف موجود نہیں تھا۔

پورا گھر جیسے نظم وضبط اور طے شدہ قواعد وضوابط کے ایک ڈھانچے میں خود بخود ڈھل گیا تھا۔ کسی کو کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی اور سارے کام خود بخود میکانکی انداز میں ہوتے چلے جاتے تھے۔ زبیدہ صبح کو اسکول چلی جاتی اور دوپہر تک واپس آ جاتی۔ پھر وہ بھی گھر اور بچوں کے کام کاج میں خالہ کے ساتھ ساتھ شریک ہو جاتی۔ شام تک کا وقت یوں گزر جاتا کہ کچھ پتہ ہی نہ چلتا اور پھر فرقان اپنے کام پر سے واپس آ جاتا۔ گھر کے سب افراد اکٹھے ہو جاتے۔ رات کا کھانا سب ساتھ مل کر ہی کھاتے تھے۔ اس وقت زبیدہ کو اپنا یہ چھوٹا سا گھر کسی جنت کی طرح خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ اس چھوٹی سی چہار دیواری میں بہت کچھ تھا۔ بے حد محبت کرنے والا، خیال رکھنے والا شوہر، دو پیارے پیارے جگر کے ٹکڑے، جن کے وجود سے اس گھر میں روشنی تھی اور ان بچوں کے بارے میں خواب ..... زبیدہ اب اپنے بارے میں شادی سے پہلے والے خواب تو نہیں دیکھتی تھی، کیونکہ وہ وقت تو اب گزر چکا تھا لیکن انسان خواب دیکھنا تو کسی حال میں بھی نہیں چھوڑتا۔ ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خواب کے اجزا بوسیدہ ہو کر منتشر ہو جاتے ہیں تو پھر کسی نئے خواب کے تانے بانے صورت پذیر ہونے لگتے ہیں اور یوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے خوابوں کا یہ طویل سلسلہ عمر بھر جاری رہتا ہے جس کے ہر مرحلے میں امید اور آرزو کا ایک خاص رنگ موجود ہوتا ہے، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

زبیدہ اب اپنے بارے میں نہیں، اپنے بچوں کے بارے میں خواب دیکھتی تھی۔ ایک بیٹا، ایک بیٹی جو اب اس کا سرمایہ حیات تھے۔ وہ خود تو زیادہ لکھ پڑھ نہیں سکی تھی۔ تقدیر نے اس کے لیے جو تعلیمی حد بندی کر دی تھی وہ میٹرک پر آ کر ختم ہو گئی تھی، لیکن وہ اپنے بچوں کے لیے ساری سرحدوں کو کھلا چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ اسے اپنے والدین کی اس کثیر العیالی کا بھی بخوبی احساس تھا جو اس کے مزید تعلیم کے حصول کی راہ میں آڑے آئی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے خاندان کو محدود رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا شوہر اپنی عقل مند بیوی کی زیادہ تر باتوں اور تجاویز کو بلا کسی چوں و چرا کے تسلیم کر لیتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کے اس فیصلے میں بخوشی شریک ہو گیا اور یوں ان کا خاندان مختصر ہی رہا۔ ایک مختصر سے خاندان کے ساتھ، جس میں بچوں کی تعداد صرف دو ہو، بہت اچھے اچھے اور خوبصورت خواب دیکھے جا سکتے ہیں اور محدود آمدنی کے باوجود ان میں کئی طرح کے رنگ بھرے جا سکتے ہیں۔ یہ مختصر سا خاندان ایک طے شدہ سانچے میں ڈھلی ہوئی زندگی گزار رہا تھا کہ اچانک سب کچھ بالکل بدل گیا۔

خالہ بیمار ہو گئیں لیکن انہوں نے زبیدہ اور فرقان کو بالکل پریشان نہیں کیا۔ وہ کسی کو بھی تیمارداری کی زحمت دیئے بغیر صرف ایک دن کی بیماری کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئیں، انہیں تو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ ابھی صرف گھریلو دواؤں کا استعمال ہی شروع ہوا تھا کہ خالہ نے دنیا سے رختِ سفر باندھ لیا۔

خالہ کے انتقال کے ساتھ ہی زبیدہ کے لیے اچانک ایسے مسائل پیدا ہو گئے جن کے بارے میں اس نے اب تک کبھی سنجیدگی کے ساتھ سوچا ہی نہیں تھا، کیونکہ خالہ موجود تھیں، وہ اتنی زیادہ بوڑھی بھی نہیں تھیں اور ان کی صحت بھی ٹھیک رہتی تھی۔ بس اچانک ہی سب کچھ ہو گیا اور وہ اپنے پیچھے مسائل و مشکلات کا ایک سلسلہ چھوڑ کر چل بسیں۔

دونوں بچے ابھی چھوٹے تھے اور انہیں دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ وہ گھر میں اکیلے نہیں رہ سکتے تھے۔ زبیدہ اور فرقان نے بہت سوچا۔ کسی کو ملازم رکھنے کی ان کی حیثیت نہیں تھی۔ دور پرے کی عمر رسیدہ رشتے دار خواتین کو چپکے چپکے کھنگالا گیا، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں نکلی جو خالہ کی طرح بے سہارا اور تنہا ہوتی اور ان لوگوں کے ساتھ آ کر رہ سکتی۔

خالہ کا بے سہارا اور بے وارث ہونا ہی ان کی سب سے بڑی خوبی تھی اور اس خوبی کے ساتھ وہ زبیدہ کے گھر میں ایسی ہنسی خوشی کے ساتھ دن گزار رہی تھیں جو صرف ان کے لیے ہی نہیں بلکہ اس خاندان کے دوسرے لوگوں کے لیے بھی پُرامن زندگی کا ایک حصہ بن چکی تھی۔

بہت جدوجہد کرنے کے بعد بھی جب کوئی راستہ نہیں نکل سکا تو پھر یہی فیصلہ کیا گیا کہ زبیدہ نوکری چھوڑ دے۔ محلے میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو آدھے دن کے لیے بچوں کو سنبھال سکے۔ چنانچہ زبیدہ نے اسکول کی نوکری چھوڑ دی۔

نوکری چھوڑنے کے ساتھ ہی اس فاضل آمدنی کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا جو زبیدہ کی تنخواہ کی صورت میں اس خاندان کو حاصل ہوتی تھی اور اس آمدنی کے ختم ہوتے ہیں کچھ تنگی کا احساس بھی شروع ہو گیا۔ بچوں کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ اخراجات میں اضافہ ہونا تھا۔

فرقان نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ کہیں پارٹ ٹائم کام تلاش کر لے، لیکن زبیدہ نے سختی کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ جتنا کام فرقان کر سکتا تھا، وہ کر رہا تھا۔ اس پر اس سے زیادہ بوجھ ڈالنا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ آخر اس کو بھی ایک انسان کی طرح زندہ رہنے کا حق حاصل تھا، مگر اس کے ساتھ ہی آمدنی کا کوئی متبادل راستہ تلاش کرنا بھی ضروری تھا۔

آخر زبیدہ نے ایک راستہ تلاش کر لیا۔ اس نے اپنے کوارٹر کے ایک کمرے کو باقی کوارٹر سے الگ کر کے کرائے پر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے جب فرقان کو اپنے اس فیصلے کے بارے میں بتایا تو وہ فوری طور پر اس بارے میں کچھ طے نہ کر سکا۔

''یہاں بہت سارے لوگوں نے اپنے کوارٹر کا ایک ایک کمرہ کرائے پر دے رکھا ہے۔'' زبیدہ نے اس سے کہا۔ ''اور کمرے کرائے پر فوراً ہی اٹھ بھی جاتے ہیں، اچھا خاصا کرایہ مل جاتا ہے۔ بس شروع میں تھوڑا سا خرچہ کرنا پڑتا ہے اور پھر مہینے کا اچھا خاصا کرایہ آنے لگتا ہے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو اکیلے رہتے ہیں اور انہیں کسی کمرے کی تلاش ہوتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر..... ہمارے لئے تو مکان چھوٹا ہو جائے گا۔''

''ابھی تو آسانی سے گزارہ ہو جائے گا۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''جب تک بچے بڑے نہیں ہو جاتے تب تک کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ جب بچے بڑے ہو جائیں گے پھر دیکھا جائے گا۔ تب میں شاید دوبارہ کوئی نوکری کر لوں۔''

چنانچہ زبیدہ کی تجویز پر عمل شروع کر دیا گیا۔ کچھ پیسہ لگا کر کوارٹر کے ایک کمرے میں چھوٹا سا غسل خانہ بنوا دیا گیا اور گیس کا ایک کنکشن دے کر ایک چھوٹے سے چبوترے پر ایک گیس کا چولہا لگوا دیا گیا۔ کمرے میں الماری پہلے سے ہی دیوار کے اندر بنی ہوئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علاقے میں اس قسم کے کمرے بہت سے لوگوں نے بنوا رکھے تھے اور یہ آسانی سے کرائے پر اٹھ جاتے تھے۔ کورنگی کا انڈسٹریل ایریا بہت بڑا تھا۔ جہاں کام کرنے کے لیے اکثر لوگ دور دور سے آیا کرتے تھے جن میں سے بعض کا یہاں گھر بار نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ اس علاقے میں کوئی کمرہ کرائے پر لے لیتے تھے۔

فرقان اور زبیدہ نے کمرے کا ایک دروازہ باہر کے رخ پر رکھا اور ایک دروازہ اندر کی جانب، تاکہ اندر سے بھی بوقتِ ضرورت آمد و رفت ہو سکے۔

انہیں کرائے دار کی تلاش میں زیادہ نہیں بھٹکنا پڑا۔ فرقان کے پریس میں ہی کام کرنے والے محمود نامی ایک آدمی نے وہ کمرہ فوراً کرائے پر لے لیا۔ محمود فورمین تھا اور اسے اچھے خاصے پیسے مل جاتے تھے۔ وہ رحیم یار خاں کا رہنے والا تھا اور کراچی میں بسلسلہ روزگار تنہا رہتا تھا۔ ابھی وہ جس جگہ رہ رہا تھا، وہ اس کے پریس سے بہت دور تھی۔ فرقان کا گھر تو اتنا زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے فوراً ہی وہ کمرہ کرائے پر لے کر وہاں رہنا شروع کر دیا۔

زبیدہ کی گم شدہ آمدنی کسی طور پر دوبارہ شروع ہو گئی اور جلد ہی اسے محسوس ہوا کہ آمدنی کا یہ ذریعہ اپنے اندر ایک منفرد کشش رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے حصول کے لیے اسے اور اس کے شوہر کو کافی بڑی قربانی دینی پڑ رہی تھی، ان کی رہائش سکڑ گئی تھی، انہیں اپنے دونوں بچوں کے ساتھ خاصی چھوٹی جگہ میں گزارہ کرنا پڑتا تھا اور پھر ابتدا میں کمرے کی تیاری میں پیسے بھی کافی خرچ ہو گئے تھے۔ لیکن بہر حال فوراً ہی آمدنی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔

محمود سے انہیں یا ان سے محمود کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد محمود نے خود ہی یہ تجویز بھی پیش کی کہ اگر وہ لوگ اسے صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا بھی دے دیا کریں تو وہ علیحدہ سے رقم ادا کرنے کو تیار ہے۔ زبیدہ اس کے لیے آمادہ ہو گئی۔ اس کے لیے کچھ زیادہ ناشتہ تیار کر دینا اور کچھ زیادہ کھانا پکا دینا بالکل مشکل نہیں تھا اور اس محنت اور لاگت کے نتیجے میں کچھ حاصل ہی ہو رہا تھا۔

محمود تقریباً ایک سال تک اس کمرے میں رہائش پذیر رہا اور اس کے بعد وہ واپس اپنے گھر رحیم یار خاں چلا گیا۔ اس کے بھائیوں نے وہاں کوئی اور کام شروع کر دیا تھا جس کے لیے انہیں محمود کی ضرورت تھی۔

محمود کے جانے کے بعد ان کا یہ کمرہ بہ مشکل آدھے مہینے خالی پڑا رہا ہو گا۔ محمود کے جاتے ہی فرقان اور زبیدہ دونوں نے نئے کرائے دار کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں۔

دو ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ نئے کرایہ دار آ گئے۔

یہ دو میاں بیوی تھے۔ اصغر اور حمیدہ..... اصغر پاور لوم کا کاریگر تھا اور لورنگی کے ہی کسی چھوٹے سے کارخانے میں ملازم تھا۔ اس کی بیوی حمیدہ گھر میں کپڑے سینے کا کام کرتی تھی۔ اس کے پاس پائیدان والی سلائی کی ایک مشین تھی جس کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر وہ سارا سارا دن کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ کرتی رہتی تھی۔ ان دونوں کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، تاہم ان کے ابھی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ آنے والے وقتوں کے لیے خود کو تیار کر رہے تھے۔ حمیدہ کے لیے گیس کا وہ چولہا جو سیمنٹ کے ایک چھوٹے سے چبوترے پر لگا ہوا تھا پورے باورچی خانے کا کام دیتا تھا اور اس سے اس کی ساری ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔

اصغر اور حمیدہ ڈیڑھ سال تک رہے۔ اس کے بعد وہ وہاں سے نیو کراچی چلے گئے۔ اصغر کو نیو کراچی میں کوئی زیادہ اچھی نوکری مل گئی تھی۔

پھر تیسرا کرایہ دار مختار تھا۔

مختار اکیلا تھا اور وہ بھی کورنگی کے انڈسٹریل ایریا میں کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ وہ بے حد ہنس مکھ، باتونی اور خوش مزاج انسان تھا اور اس نے زبیدہ کو اپنی بڑی بہن بنا رکھا تھا۔ وہ ناشتے اور رات کے کھانے میں اس گھر کا شریک تھا، محمود کی طرح، اور اس کے لیے الگ سے پیسے دیتا تھا۔

فرقان اور زبیدہ اب اپنے سکڑے ہوئے کوارٹر میں رہنے کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ انہیں کسی خاص تکلیف کا احساس نہیں ہوتا تھا اور اگر کبھی یہ احساس ہوتا بھی تھا تو اس آمدنی کی قوت اسے زائل کر دیتی تھی جو انہیں اس تکلیف کے عوض حاصل ہو رہی تھی۔

مختار کے ساتھ سارے معاملات بہت اچھے جا رہے تھے اور اسے یہاں رہتے ہوئے کوئی سال بھر کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ان دونوں کو اس بات کا یقین تھا کہ مختار بھی جلدی یہاں سے نہیں جائے گا۔ اس کے والدین سرجانی ٹاؤن میں رہتے تھے اور وہ خود یہاں کورنگی میں کام کرتا اور یہیں کرائے کے کمرے میں رہتا تھا۔

پھر ہوا یوں کو اس کے باپ نے ایک چھوٹی سی دکان کھول لی، جو کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اچھی خاصی چلنے لگی۔ اس نے مختار سے کہا کہ وہ بھی کام چھوڑ کر اس کے پاس آ جائے اور دکان کے کام میں اس کی مدد کرے۔ اس کے خیال میں اس میں آمدنی کے بڑھنے کے امکانات زیادہ تھے۔ مختار نے خود بھی اس خیال کو پسند کیا اور اس نے سرجانی ٹاؤن اپنے والدین کے پاس منتقل ہو جانے کا فیصلہ کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مختار چلا گیا۔ گزشتہ ساڑھے تین سال کے دوران یہ تیسرا کرایہ دار تھا۔

بچے بڑے ہو رہے تھے۔ دونوں اسکول جاتے تھے۔ ان کی ضروریات بھی بڑھ رہی تھیں۔ آمدنی کی ضرورت تھی۔ زبیدہ نے گھر پر کچھ بچوں کو پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس سے کچھ معمولی سی فالتو آمدنی ہو جاتی تھی۔ تاہم کمرے کے کرائے سے جو مستقل آمدنی کا ایک ذریعہ تھا، محروم نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ کمرے کو آباد رہنا چاہئے تھا۔

فرقان نے مختار کے جانے سے پہلے ہی محلے میں کئی لوگوں سے کرائے دار کے لیے کہہ رکھا تھا۔ اپنے پریس میں بھی اس نے لوگوں کو بتا رکھا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اس کے گھر میں کرائے کے لیے ایک کمرہ خالی ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا تھا، لیکن ابھی تک کوئی نیا کرایہ دار نہیں ملا تھا۔ دونوں میاں بیوی خاصے پریشان تھے۔ ان کا اچھا خاصا چلتا ہوا میٹر رک گیا تھا اور وہ اس کو جلد از جلد دوبارہ چالو کروا دینا چاہتے تھے، لیکن اس میٹر کا چلنا یا رک جانا ان کے اپنے بس میں نہیں تھا۔

اس روز رات کا کھانا کھانے کے بعد فرقان حسب معمول گھر سے باہر نکلا تا کہ کچھ دیر محلے والوں کے ساتھ کسی مکان کے آگے چبوترے پر بیٹھ کر گپ شپ کرنے میں گزارے۔ کئی مکانوں کے آگے ایسے چبوترے بنے ہوئے تھے اور ان میں سے اکثر پر محلے کی عورتیں اپنے فرصت کے اوقات میں آ کر بیٹھتی تھیں۔ مردوں کی محفلوں کے چبوترے الگ اور عورتوں کی بیٹھکیں الگ تھیں۔ عورتوں کی بیٹھکوں میں تیز آواز میں ہونے والی گفتگو اکثر اوقات بالکل ہلکی اور مدھم سرگوشیوں میں ڈھل جاتی تھی اور زبان کھولنے سے پہلے، اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر محتاط انداز میں دیکھ کر یہ تسلی کر لی جاتی تھی کہ آس پاس کہیں کوئی ایسا شخص تو موجود نہیں ہے جس کے لیے ان پُراسرار اور خفیہ سرگوشیوں کا سننا نامناسب ہو۔ انہی چبوتروں پر کبھی کبھی لڑائی کے مورچے بھی جمتے تھے اور غصے میں بھری عورتیں ایک دوسرے پر چیخ چلا کر اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لیتی تھیں اور اگلے دن پھر اسی اپنائیت کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب بیٹھی ہوئی نظر آتی تھیں۔

مردوں کی محفلوں میں گھریلو معاملات اور محلے اور شہر کے امور سے لے کر قومی اور بین الاقوامی مسائل پر بڑے زور وشور کے ساتھ گفتگو ہوتی تھی۔ افسروں، حاکموں، حکمرانوں اور سیاست دانوں کی بھرپور مذمت کی جاتی تھی اور انہیں عوام کا دشمن اور بدعنوان قرار دیا جاتا تھا۔ سخت سے سخت زبان استعمال کر کے اور طرح طرح کی گالیاں دے کر دل کے پھپھولے پھوڑے جاتے تھے۔ بات نلوں میں پانی نہ آنے یا بہت کم آنے اور

ٹرانسپورٹ کے کرایوں اور اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافے سے شروع ہوتی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے حکومت کے سارے ایوان اس کی زد میں آ جاتے تھے۔ یہ ساری باتیں وہ ہوتی تھیں جن میں ریاکاری، منافقت، موقع پرستی اور مصلحت اندیشی کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ جو کچھ دل و دماغ محسوس کرتے تھے، وہی زبان پر آ کر الفاظ کی صورت میں فضا میں بکھر جاتا تھا۔ سب ہی بولنے والے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر، اپنے اپنے دل کی بات صاف صاف کہہ ڈالتے تھے اور کسی قسم کی پردہ پوشی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہ شعور کی وہ سچائی تھی جو ان کے وجود کا ایک لازمی حصہ تھی لیکن جسے وہ ان لوگوں کے اندر تلاش نہیں کر پاتے تھے جن کے ہاتھوں میں ان کی تقدیر تھی۔

فرقان بھی اپنی گلی میں ایک چبوترے پر رات کے وقت جمنے والی ان محفلوں کا حصہ تھا اور تقریباً روزانہ ہی تھوڑا بہت وقت وہاں گزارتا تھا۔

اس روز جیسے ہی وہ اس چبوترے کے پاس پہنچا، شمشاد نے اس سے مخاطب ہو کر فوراً پوچھا۔ ''ارے وہ..... کوئی آیا تمہارے پاس؟''

''میرے پاس؟ کون؟ کس لئے؟'' فرقان نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے..... وہی..... کمرہ کرایہ پر لینے کے لیے؟'' اس کے پڑوسی شمشاد نے کہا۔

''نہیں تو.....'' فرقان نے کہا۔ ''ابھی تک تو کوئی نہیں آیا۔ ویسے میں نے اپنے دفتر میں بھی کئی لوگوں سے کہہ رکھا ہے۔''

''میں نے ایک آدمی کو بھیجا تھا تمہارے پاس۔'' شمشاد نے کہا۔ ''بھیجا کیا، مطلب یہ کہ تمہارا پتہ بتایا تھا۔ اسے کرائے کے لیے ایک کمرے کی تلاش تھی۔''

''اچھا؟'' فرقان نے فوراً ہی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کون آدمی ہے؟ کیا کرتا ہے؟''

''میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' شمشاد نے کہا۔ ''آج دوپہر کو وہ ہمارے کارخانے کے قریب ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد بیرے سے پوچھ رہا تھا کہ ادھرا کیلے آدمی کے لیے کوئی کمرہ کرائے پر مل جائے گا۔ میں نے اس کی بات سن لی اور اس سے کہا کہ اگر وہ کورنگی میں چاہے تو اسے کمرہ مل سکتا ہے۔ وہ شاید لانڈھی میں کہیں کام کرتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر رہنے کے لیے اچھی جگہ مل جائے تو پھر روزانہ کورنگی سے لانڈھی آنا جانا کوئی ایسا زیادہ مشکل کام بھی نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے پتہ پوچھا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں جاؤں گا۔ میں نے سمجھا شاید آیا ہو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں..... آج ابھی تک تو نہیں آیا۔'' فرقان نے کہا۔ ''شاید..... کل ول آئے..... یا شاید نہ آئے۔ کمرہ تو اسے لانڈھی میں بھی مل سکتا ہے۔''

''ابا۔'' اچانک قریبی گھر سے ایک بچہ بڑے مضطرب انداز میں چلاتا ہوا باہر آیا۔ ''پانی آ گیا ہے..... اماں کہہ رہی ہیں جلدی سے آ کر نہا لو۔''

''لو بھئی..... شکر ہے خدا کا۔'' شمشاد نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آج تین دن کے بعد پانی کی شکل دکھائی دی ہے۔''

پانی کی آمد کی خوشخبری کے ساتھ ہی یہ محفل تقریباً برخاست ہوگئی۔ زیادہ تر لوگ اٹھ اٹھ کر اپنے کوارٹروں میں پانی بھرنے اور نہانے دھونے کے لئے چلے گئے۔ گرمیوں کے دن تھے اور علاقے میں بعض اوقات کئی کئی دن پانی کا ناغہ ہو جاتا تھا۔ لوگ برسوں سے طرح طرح کے جن عذابوں کو جھیلنے کے عادی ہو چکے تھے، انہی میں سے ایک عذاب پانی کا بھی تھا۔

پانی کی قلت اگرچہ علاقے کا ایک مشترکہ مسئلہ تھی، تاہم فرقان اور زبیدہ نے اپنے کرایہ دار کی پانی کی ضروریات کا ہمیشہ بہت زیادہ خیال رکھا تھا۔ اس سلسلے میں زبیدہ بہت محتاط اور دانش مندانہ رویہ اختیار کرتی تھی۔ ایسا نہ ہو کرائے دار پانی کی پریشانی کے باعث گھبرا کر کمرہ چھوڑ کر بھاگ جائے۔ اس خیال کے تحت وہ اپنی ضروریات میں بوقت ضرورت قطع برید کر لیتی تھی، لیکن کرائے دار کو پانی کی تکلیف نہیں ہونے دیتی تھی۔ ویسے اس کے اب تک کے تمام کرایہ دار اس معاملے میں بہت تعاون کرتے تھے۔ پانی کی کمی کی صورت میں وہ دوسری گلی میں لگے ہوئے نل سے بالٹیاں بھر کر لے آتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا مالک مکان کے پاس کوئی حل نہیں ہے۔

فرقان دو ایک آدمیوں کے ساتھ جو وہاں باقی رہ گئے تھے، کافی دیر تک بیٹھا ہوا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ وہ دراصل اس امید میں بیٹھا ہوا تھا کہ شاید وہ آدمی کمرے کی تلاش میں یہاں تک آئے، تو اس کو مکان تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہ پیش آئے، لیکن جب کافی دیر گزر گئی اور اگلی کی رونق بھی کم ہونے لگی تو وہ گھر واپس آ گیا اور اس نے زبیدہ کو اس نامعلوم شخص کے بارے میں بتایا، جس کا ذکر شمشاد نے کیا تھا۔

''لانڈھی میں کام کرنے والا بھلا یہاں کمرہ کیوں لے گا؟'' زبیدہ نے قدرے مایوسی کے ساتھ کہا۔ ''اسے وہیں کوئی نہ کوئی جگہ مل جائے گی۔''

''لانڈھی سے کورنگی اور کورنگی سے لانڈھی روزانہ ہزاروں لوگ کام کے سلسلے میں آتے جاتے ہیں۔'' فرقان امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ''شاید وہ شخص اِدھر

آئے۔ ویسے بھی، عام طور سے اکیلے آدمی کو ہر شخص اپنے مکان میں رکھنے کے لیے تیار بھی نہیں ہوتا۔ خاص طور سے جس گھر میں سیانی لڑکیاں موجود ہوں۔ ہماری ثوبیہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔''

وہ آدمی اگلے روز واقعی آ گیا۔

فرقان کو کام پر سے آئے ہوئے کافی دیر گزر گئی تھی، جب کسی نے دروازے پر دستک دی۔ فرقان نے جا کر دروازہ کھولا تو وہاں ایک اجنبی کو کھڑے ہوئے پایا۔ پہلی نظر میں اسے دیکھ کر فرقان ٹھٹک گیا۔

وہ درمیانہ عمر کا ایک آدمی تھا اور اپنی شکل اور حلیے سے سخت پریشان حال اور تھکا ماندہ نظر آ رہا تھا۔

''مجھے کسی نے بتایا ہے کہ تمہارے گھر میں کرائے کے لیے ایک کمرہ خالی ہے۔'' آنے والے نے کہا۔ ''میں وہ کمرہ کرائے پر لینا چاہتا ہوں۔''

''کیا نام ہے تمہارا اور کہاں سے آئے ہو؟'' فرقان نے غور سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ڈرگ کالونی سے آیا ہوں۔'' اس نے صرف مختصر سا جواب دینے پر اکتفا کیا۔

''مجھے کمرہ چاہئے، ملے گا؟''

اس کے لب و لہجے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زیادہ بات چیت نہ کرنا چاہتا ہو اور فوری طور پر یہ جان لینا چاہتا ہو کہ اسے کمرہ مل سکے گا یا نہیں۔

اسی وقت گلی میں سے گزرنے والے ایک لڑکے کو آواز دے کر فرقان نے اس سے کہا کہ وہ ذرا شمشاد کے دروازے پر دستک دے کر اس کو بلا لائے۔ شمشاد فوراً ہی آ گیا۔

''ہاں.....'' شمشاد نے اس آدمی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے کل لانڈھی کے ہوٹل میں ملے تھے نا؟ میں نے تم کو یہاں کا پتہ بتایا تھا۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

''فرید۔'' اس شخص نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

شمشاد کے آنے کے بعد اس امر کی تو تصدیق ہو گئی تھی کہ یہ وہی آدمی ہے جو شمشاد کو لانڈھی میں ملا تھا۔ اب اس سے مزید پوچھ گچھ کی جا سکتی تھی۔

''تم نے لانڈھی میں ہی کوئی کمرہ کیوں تلاش نہیں کر لیا؟'' فرقان نے اس سے پوچھا۔

''کیا تھا۔'' فرید نے کہا۔ ''نہیں ملا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ابھی کہاں رہ رہے ہو؟'' شمشاد نے پوچھا۔

''ڈرگ کالونی میں۔'' اس نے کہا۔

''کوئی اور بھی ساتھ مین ہے؟'' فرقان نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے کہا۔

شمشاد اور فرقان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کچھ عجیب سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے لیے الفاظ بھی پیسوں کی طرح ہوں، جن کو خرچ کرتے ہوئے وہ نہایت درجہ احتیاط کا مظاہرہ کر رہا ہو۔ وہ اتنا کم بول رہا تھا کہ اس کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا ہی دشوار تھا۔

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' شمشاد نے پوچھا۔

''پنجاب کا۔'' اس نے شہر کا نام نہیں بتایا۔

''کوئی تمہاری ضمانت دینے والا ہے؟'' فرقان نے پوچھا۔ ''کسی کو جانتے ہو جو تمہاری ضمانت دے؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''مگر میں کرایہ وقت پر دوں گا۔''

اگلے چند سوالات میں فرید نے اپنے بارے میں محض اتنا مزید بتایا کہ وہ لانڈھی کے کسی چھوٹے سے کارخانے میں مشین کے ذریعے کپڑے پر کڑھائی کا کام کرتا ہے، اکیلا ہے اور اسے رہنے کے لیے ایک کمرہ چاہئے۔ اس نے کارخانے کا نام اور پتہ بھی بتا دیا۔

فرقان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس شخص کو کیا جواب دے۔ اسے یہ آدمی ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ کچھ بیزار اور برہم سا لگتا تھا۔ اپنے بارے میں کچھ زیادہ بتانے کے لیے تیار ہی نہیں تھا اور سوالوں کے مختصر ترین جواب دے رہا تھا۔

فرقان نے شمشاد کو ایک طرف لے جا کر اس سے مشورہ کیا۔ فرقان کو کرائے دار کی سخت اور فوری ضرورت تھی۔ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ اس کا نقصان ہو رہا تھا۔

''اسے دے دو یار۔'' شمشاد نے کہا۔ ''یہاں کوئی بدمعاشی تھوڑی کر سکے گا۔ بھرا پُرا محلّہ ہے۔ مار مار کے جان نکال لیں گے اگر کوئی ایسی ویسی حرکت کرے گا۔ کچھ دن رکھ کر دیکھو..... اگر آدمی ٹھیک نہ لگے تو نکال باہر کرنا، اس میں کیا مشکل ہے؟''

''چلو ٹھیک ہے۔'' فرقان نے کہا۔ ''پہلے اس کو کرایہ بتاتے ہیں، پتہ نہیں دے گا بھی یا نہیں.....''

دونوں فرید کے پاس واپس آ گئے، جو بالکل ہی لاتعلقی کے انداز میں اس طرح کھڑا

ہوا تھا جیسے اس دنیا سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

فرید کے پاس آ کر فرقان نے اس کو ماہانہ کرایہ بتایا۔ ''دو ماہ کا کرایہ ایڈوانس دینا ہو گا۔''

بغیر کچھ کہے سنے فرید نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور رقم گن کر فرقان کے حوالے کر دی۔ اس نے کمرہ دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر نہیں کی۔ صرف غسل خانے کے بارے میں پوچھا۔ فرقان نے اس کو بتایا کہ کمرے میں غسل خانہ بھی ہے اور گیس کا چولہا بھی ہے۔ وہاں کھانا بھی پکایا جا سکتا ہے۔

''تم اگر چاہو تو اس گھر سے تم کو ناشتہ اور رات کا کھانا بھی مل سکتا ہے۔'' شمشاد نے اس سے کہا۔ ''لیکن اس کے لیے تم کو الگ سے.....''

''نہیں..... نہیں چاہئے۔'' فرید نے شمشاد کی بات کاٹتے ہوئے مختصراً کہا۔

''ایک بات یاد رکھنا استاد۔'' شمشاد نے اس کو تیز اور چبھتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''یہ شریفوں کا محلّہ ہے۔ سب بال بچے دار لوگ رہتے ہیں ادھر..... کوئی ایسی ویسی بات نہ ہونے پائے۔ ہم لوگ کسی آدمی کو ضمانت کے بغیر محلے میں کرایہ پر جگہ نہیں دیتے لیکن تم کافی پریشان معلوم ہوتے ہو۔ اس لیے تم کو جگہ دے دیتے ہیں۔''

''میں کل شام کو آ جاؤں گا۔'' فرید نے ان لمبی چوڑی باتوں کے جواب میں صرف یہ مختصر سا جملہ کہا اور اس کا جواب سنے بغیر ہی وہاں سے چل پڑا۔

''یار عجیب آدمی ہے۔'' فرقان نے اسے جاتا دیکھ کر کہا۔ ''اس میں تو ذرا سی بھی آدمیت نہیں معلوم ہوتی۔''

''ارے، تمہاری بلا سے۔'' شمشاد نے کہا۔ ''تم کو اس سے کون سی رشتے داری کرنی ہے؟ ٹھیک رہے تو رکھنا، گڑبڑ کرے تو نکال باہر کرنا۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ اس محلے میں باہر سے آنے والے کس کی مجال ہے جو ہم لوگوں کے ساتھ کوئی گڑبڑ کر سکے۔''

''بس یار، تم ہی لوگوں کا تو بھروسہ ہے۔'' فرقان نے کہا۔ ''ہم سب ایک دوسرے کے بھروسے کے ساتھ ہی زندہ ہیں۔''

''بالکل.....'' شمشاد نے زور دے کر کہا۔ ''ہم سب ایک دوسرے کے بھروسے کے سہارے ہی تو زندہ ہیں۔''

شمشاد اپنے گھر چلا گیا اور فرقان نے گھر میں آ کر زبیدہ کو یہ خوشخبری سنائی کہ کمرے کے لیے کرایہ دار مل گیا ہے۔ فرید نے ایڈوانس کی جو رقم دی تھی، وہ فرقان نے نکال کر اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیوی کے ہاتھ میں دے دی۔ اس نے زبیدہ کو بتایا کہ یہ وہی آدمی ہے جو شمشاد کو لانڈھی میں ملا تھا..... اور اس کی بات چیت کی تمام تفصیل بتادی۔

''تعجب ہے۔'' زبیدہ نے خوش ہونے میں ذرا تامل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ شخص لانڈھی میں کام کرتا ہے اور اس کو لانڈھی میں کوئی کمرہ نہیں ملا۔ یہ رہنے کے لیے کمرہ کورنگی میں کرائے پر لے رہا ہے۔''

''ہم نے اس سے یہ پوچھا تھا۔'' فرقان نے کہا۔ ''اس نے بتایا کہ اسے لانڈھی میں کوئی کمرہ نہیں مل سکا۔''

''خیر..... ٹھیک ہے۔'' زبیدہ نے محتاط انداز میں کہا۔ ''آ گیا ہے اور کرایہ بھی پیشگی دے رہا ہے تو پھر آجانے دو..... لیکن شروع شروع میں ذرا سنبھل کر رہنا ہوگا۔ ہم اسے بغیر کسی ضمانت کے رکھ رہے ہیں اور وہ ہمارے لئے بالکل اجنبی ہے جبکہ پچھلے تینوں کرایہ دار کسی نہ کسی حوالے سے اور کسی نہ کسی ضمانت پر آئے تھے۔''

''ہمیں اس سے زیادہ سروکار نہیں رکھنا ہے۔'' فرقان نے کہا۔ ''وہ کھانے وغیرہ میں بھی شریک نہیں ہوگا۔''

اگلے دن شام کو فرید اپنا سامان لے کر آ گیا۔ اس کا سامان محض ٹین کے ایک پرانے بکس اور ایک بستر بند پر مشتمل تھا۔ ٹین کے بکس کو رسی سے باندھا گیا تھا اور بستر بند کے گرد بھی رسی بندھی ہوئی تھی۔ ان دو چیزوں کے علاوہ اس کے پاس اور کچھ نہیں تھا۔

''کیوں؟ کوئی چارپائی وغیرہ.....؟''

''کل لاؤں گا۔'' فرید نے فرقان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

زبیدہ نے دن میں کمرے کی صفائی کر دی تھی اور الماری کو بھی صاف کر دیا تھا۔ فرید نے اپنا سامان کمرے میں رکھ دیا۔

کمرے کا ایک دروازہ گھر کے اندر کھلتا تھا۔ اس دروازے سے زبیدہ نے کمرے میں آ کر اپنے نئے کرائے دار سے ملاقات کی۔

''یہ میری بیوی زبیدہ ہیں۔'' فرقان نے اس کا زبیدہ سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں اتفاق سے کسی وقت موجود نہ ہوں تو تم باہر کے دروازے پر آ کر کرایہ ان کو دے سکتے ہو۔''

فرید نے ایک سرسری سی نظر زبیدہ پر ڈالی اور آہستہ سے گردن ہلا دی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دل سے یہ چاہتا تھا کہ وہ لوگ وہاں سے چلے جائیں تاکہ وہ اپنا سامان وغیرہ

ٹھیک کر سکے۔ زبیدہ تو فوراً ہی وہاں سے چلی گئی۔ فرقان البتہ اس کو کمرے میں موجود سہولتوں کے بارے میں بتاتا رہا جسے فرید نے بڑی بے دلی کے ساتھ سنا۔ ذرا دیر بعد فرقان بھی وہاں سے چلا آیا۔ اسے اپنا نیا کرایہ دار ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

☆======☆======☆

فرید نے اس کمرے میں کرایہ دار کے طور پر رہنا شروع کر دیا۔ فرقان اور زبیدہ کو اس کی اپنے گھر کے ایک حصے میں موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ صبح ہی کو گھر سے نکل جاتا تھا اور کسی سے بات چیت کئے بغیر غائب ہو جاتا تھا۔ رات کو وہ چراغ جلنے کے بعد آتا اور سیدھا اپنے کمرے میں گھس جاتا۔ پھر وہ اگلے دن صبح کو ہی وہاں سے باہر نکلتا تھا۔ وہ کسی سے بھی ملتا جلتا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ کسی سے صاحب سلامت بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے اس عجیب و غریب رویے نے اس کو لوگوں کے درمیان کسی قدر مشتبہ بنا دیا تھا۔ اس نے محلے کے چبوتروں پر ہونے والی مردانہ بیٹھکوں میں بھی کبھی حصہ نہیں لیا۔

کمرے کا درمیانی دروازہ سختی کے ساتھ بند رہا اور اس نے کبھی بھی اس کو کھول کر فرقان اور زبیدہ کے گھر میں آنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔

فرید نے اپنے مالک مکان سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ جب ایک ماہ پورا ہو گیا تو اس نے خاموشی سے ایک ماہ کا کرایہ بغیر مانگے فرقان کے حوالے کر دیا۔ دو ماہ کا جو پیشگی کرایہ اس نے دیا تھا وہ جمع رہا۔ کرایہ لیتے وقت فرقان نے اس سے پوچھا کہ اسے کوئی تکلیف تو نہیں ہے تو اس کے جواب میں اس نے صرف نفی میں سر ہلا دیا۔ فرقان اس سے مزید باتیں کرنا چاہتا تھا، لیکن اس نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ فوراً ہی وہاں سے چلا گیا۔

فرید گلی محلے میں نہ تو کسی سے ملتا جلتا تھا، نہ کسی سے بات چیت کرتا تھا، حتیٰ کہ وہ کسی سے دعا سلام بھی نہیں کرتا تھا۔ اگر کوئی خود سے اس کو سلام کرتا تھا تو وہ بڑی بے دلی کے ساتھ جواب دے دیتا تھا، لیکن سلام کرنے میں خود کبھی پہل نہیں کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک بیزاری، برہمی اور خشونت کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ کسی شخص نے کبھی اس کو ہنستے ہوئے تو دور کی بات ہے، مسکراتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔

کورنگی جیسے علاقے میں جہاں کی گلیوں میں چھوٹے چھوٹے کوارٹروں میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے کی سانسیں تک گنتے رہتے ہیں، فرید کا طرز زندگی لوگوں کے لیے حیرت انگیز بلکہ بڑی حد تک تشویش انگیز بھی تھا اور پُرتجسس بھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن حیدر علی نامی پڑوسی کے لیے اس میں ان سب باتوں کے علاوہ ایک اور چیز بھی شامل تھی.....اور یہ تھا ایک نامعلوم خوف!

حیدر علی اس گلی میں آگے چل کر ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ وہ کورنگی میں ہی چمڑے کی مصنوعات بنانے والے ایک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ جہاں سے واپس آنے کے بعد وہ اکثر شام کے وقت اپنے گھر کے باہر بنے ہوئے چھوٹے سے چبوترے پر بیٹھ جاتا تھا اور گلی سے گزرنے والے لوگوں سے دعا سلام اور اِدھر اُدھر کی مختصر بات چیت کرتا رہتا تھا۔ حیدر علی طبعاً بہت خوش مزاج اور ملنسار آدمی تھا۔ اس کی آج تک محلے میں کسی سے تُو تُو، میں میں نہیں ہوئی تھی جبکہ پڑوسیوں میں تُو تُو، میں میں، اور معمولی معمولی باتوں پر تکرار ایک عام سی بات تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس قسم کی تکرار عام طور پر کوئی سنگین صورت اختیار نہیں کرتی تھی اور جلد ہی فریقین سب کچھ بھلا کر پھر ایک ہو جاتے تھے، لیکن حیدر علی تو ایسا نرم مزاج آدمی تھا کہ کسی سے کبھی تیز اور جارحانہ لہجے میں بات بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ نرمی اور خوشدلی کا ایک تاثر موجود رہتا تھا، جو اس کی شخصیت کے اندرونی حسن کا آئینہ دار تھا، لیکن جب سے فرید نامی اس شخص نے فرقان کے کوارٹر کے کمرے میں کرایہ دار کے طور پر رہنا شروع کیا تھا، تب سے حیدر علی ایک عجیب وغریب الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

وہ فرید نامی اس شخص کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ اب سے پہلے تو اس نے کبھی اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی اور اسے پورا یقین تھا کہ فرید بھی اس کو قطعی نہیں جانتا ہوگا، کیونکہ اس کے اور فرید کے درمیان کوئی بھی ایسی قدر مشترک موجود نہیں تھی جو ان دونوں کو کسی بھی زاویے سے ایک دوسرے ساتھ جوڑتی، لیکن اس کے باوجود حیدر علی صاف طور پر یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کو دیکھتے ہی فرید کی کیفیت میں ایک واضح تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔

فرید جب اس کی طرف دیکھتا تھا، تو نہ جانے کیوں، اس کے چہرے کے نقوش جیسے مسخ ہونے لگتے تھے، سارے اعصاب تن جاتے تھے اور اس کا ہمیشہ پتھر کی طرح سخت رہنے والا چہرہ اور بھی زیادہ سخت ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکلنے لگتی تھیں اور ان میں سرخی عود کر آتی تھی۔

شروع شروع میں تو حیدر علی نے اس کو صرف واہمہ سمجھ کر ٹالنے کی کوشش کی اور اس نے دل ہی دل میں اپنی ہنسی بھی اڑائی۔ ''بھلا اس کو مجھ سے کیا لینا دینا ہے؟ مجھ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کیوں خون اترے گا ہم دونوں تو ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں ہیں۔''

لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے، ویسے ویسے اس کا یہ شک یقین میں بدلتا گیا۔ ویسے

تو فرید کے چہرے پر ہمیشہ ایک تناؤ کی سی کیفیت طاری رہتی تھی، نرمی اور شگفتگی کا کوئی تاثر کسی نے بھی کبھی نہیں دیکھا تھا، لیکن جب فرید، حیدر علی کی طرف دیکھتا تھا تو اس کا چہرہ اور بھی زیادہ بھیانک ہو جاتا تھا۔ اس کی رنگت سیاہ پڑنے لگتی تھی اور تنے ہوئے اعصاب اور بھی زیادہ تن جاتے تھے۔

جیسے جیسے حیدر علی کو اس حقیقت کا احساس ہوتا گیا، ویسے ویسے اس کے دل میں ایک نامعلوم قسم کا خوف پیدا ہونے لگا۔ آخر یہ اجنبی شخص اسے کیوں اس قدر ناپسند کرتا ہے، جبکہ اس کا اس سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا؟

یہ بات اتنی عجیب اور ساتھ ہی اس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی کہ وہ کسی سے اس کا ذکر بھی کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ سننے والا یقیناً اس پر ہنسے گا اور اس کا مذاق اڑائے گا۔

فرید نے آج تک اس سے کوئی بات کرنا تو درکنار اس سے دعا سلام بھی نہیں کی تھی۔ جب بھی اس کا حیدر علی سے آمنا سامنا ہوتا، حیدر علی کا ہاتھ خود ہی سلام کے لیے اٹھ جاتا اور فرید سر کے ہلکے سے اشارے سے جواب دے کر آگے بڑھ جاتا، لیکن ان مختصر سے لمحات میں بھی جتنی دیر فرید کی نگاہیں حیدر علی کے چہرے پر جمی رہتیں، حیدر علی کو ان سے خون ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا۔ تاہم حیدر علی نے کبھی کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ دراصل وہ یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکا کہ آیا اسے یہ بات کسی سے کہنی چاہیے یا نہیں۔

محلے کے کسی بھی شخص کو فرید سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس نے کسی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا اور نہ ہی کسی سے کوئی لڑائی جھگڑا وغیرہ کیا تھا۔ وہ اس طرح اس محلے میں رہتا تھا جیسے یہاں کے کسی گھر یا کسی شخص سے کوئی تعلق نہ ہو، بالکل الگ تھلگ اور بیگانہ سا.....

فرقان اور زبیدہ اکثر اس کے بارے میں سوچتے تھے اور آپس میں باتیں بھی کرتے تھے۔

''ہمارے اس سے پہلے والے جو کرائے دار تھے، وہ سارے کے سارے کتنے اچھے اور ملنسار لوگ تھے۔'' فرقان نے کہا۔ ''وہ سب تو ہمارے ساتھ اس طرح رہتے تھے جیسے ہمارے ہی خاندان کا ایک حصہ ہوں۔''

''مختار کو تو یہاں سے جانے کا بہت افسوس تھا۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اگر اس کے باپ کا اصرار نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی یہاں سے نہ جاتا۔ وہ تو کہتا تھا کہ اس کو اپنے گھر سے زیادہ آرام یہاں ملتا تھا، لیکن باپ نے دکان کر لی تھی تو پھر اس کو جانا ہی پڑا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''وہ سب ہی بہت اچھے لوگ تھے اور ان میں سے کسی نے بھی ہم کو کوئی تکلیف نہیں دی۔'' فرقان نے کہا۔

''تکلیف تو اس نے بھی کوئی نہیں دی۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''نہ ہم کو اور نہ کسی اور کو..... بس اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتا اور نہ یہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کے معاملات میں دخل دے۔ الگ الگ لوگ الگ الگ طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بس وہ کرایہ برابر دیتا رہے۔''

فرقان نے فرید کو کمرہ کرائے پر دینے کے بعد اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرلی تھیں۔ یہ معلومات اس نے اپنے پڑوسی شمشاد کے ذریعے حاصل کی تھیں جو لانڈھی میں کام کرتا تھا اور وہیں فرید سے اس کی ملاقات ہوتی تھی۔ شمشاد نے اپنے طور پر تحقیق کر کے اس امر کی تصدیق کرلی تھی کہ فرقان لانڈھی کے ایک چھوٹے سے کارخانے میں مشین سے کپڑوں پر کڑھائی کا کام کرتا تھا۔ وہ کڑھائی کا بہت اچھا کاریگر تھا اور جس کارخانے مین وہ کام کرتا تھا، وہاں کے مالکان اس کو بہت پسند کرتے تھے کیونکہ وہ اپنا کام بڑی خوبی اور پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتا تھا۔ شمشاد اس کے بارے میں وہاں سے اور زیادہ معلومات حاصل نہیں کرسکا تھا، تاہم اتنا معلوم ہو جانا ہی کافی تھا۔ اس نے کبھی کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہیں کی تھی اور یہ کہ وہ ایک مکمل طور سے قابل اعتماد کارکن تھا۔

فرقان اور زبیدہ کو پابندی کے ساتھ اپنے کمرے کا کرایہ مل رہا تھا اور انہیں اپنے کرائے دار سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ ان کا کمرہ آباد تھا۔ کرایہ آرہا تھا تو پھر پریشانی کی کیا بات تھی بھلا؟

ان دونوں کو اپنے پڑوسی حیدر علی کے دل میں پلنے والے اس نامعلوم خوف کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا، جس کے متعلق حیدر علی نے کسی سے بھی کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔

اس گلی کی ایک دیرینہ روایت یہ چلی آرہی تھی کہ ہر سال محرم کی نویں تاریخ کو رات کے وقت حلیم کی دیگ پکتی تھی۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ گلی کے ہر گھر سے چندہ اکٹھا کیا جاتا تھا اور لوگ خوشی خوشی چندہ دیتے تھے۔ پھر محرم کی نو تاریخ کو رات کے وقت حلیم پکتی تھی اور صبح کو وہ سارے محلے میں تقسیم کی جاتی تھی۔

ہر سال کی طرح اس سال بھی حلیم کا اہتمام کیا گیا اور اس کے لیے محلے کے گھروں سے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کردی گئی۔ چندہ جمع کرنے کی ذمہ داری جن کئی لوگوں پر عائد ہوتی تھی ان میں شمشاد بھی شامل تھا۔ شمشاد فرقان کے گھر بھی چندہ وصول کرنے کے

لیے آیا اور فرقان نے اس کو چندہ دے دیا۔

''یار، اس چریا سے بھی چندہ مانگوں یا نہ مانگوں؟'' شمشاد نے فرقان سے سوال کیا۔

''وہی تمہارے بد دماغ کرایہ دار سے؟''

''مانگو، کیوں نہیں مانگو۔'' فرقان نے کہا۔ ''گلی کے سب لوگ اس میں شامل ہیں، تو وہ کیوں نہ شامل ہو؟ پوچھ کر دیکھ لو، اکیلا آدمی ہے اس کو زیادہ رقم دینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ حلیم البتہ اس کو ذرا زیادہ دے دینا''۔

''ارے حلیم تو ہم اس کو اس سے چندہ لئے بغیر بھی دے دیں گے۔'' شمشاد نے کہا۔ ''حلیم کی کیا بات ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ کم بخت محلے کے کسی کام میں شریک تو ہو..... اپنے آپ کو اس جگہ کا ایک حصہ تو سمجھے..... کسی سے کچھ بات چیت تو کرے''۔

''ہاں۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''اسی لیے تم اس سے چندہ ضرور مانگو شمشاد بھائی۔''

شمشاد اس روز رات کو فرید کے کمرے پر پہنچا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ فرید نے دستک دی۔ اس کے جواب میں کچھ دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ شمشاد نے اپنے سامنے فرید کو کھڑے پایا۔ فرید نے کچھ کہا نہیں بلکہ سوالیہ نظروں سے شمشاد کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں سرد اور خشک تھیں اور ان میں کسی قسم کی خیر مقدمی گرم جوشی شامل نہیں تھی۔

شمشاد نے اس کو جلدی جلدی حلیم کے چندے کے بارے میں بتایا اور ابھی وہ اپنی بات پوری کر بھی نہیں پایا تھا کہ فرید اندر کی طرف پلٹ گیا۔ اس نے اپنی الماری کھولی اور اس میں سے کچھ رقم نکال کر دروازے کے پاس آکر شمشاد کے حوالے کردی۔ اس نے شمشاد سے ایک بار بھی کمرے اندر آنے کو نہیں کہا۔

''شکریہ بھائی۔'' شمشاد نے اپنے ہاتھ میں موجود کاغذ پر اس کا نام اور اس کی دی ہوئی رقم کو لکھتے ہوئے کہا۔ ''نو تاریخ کی رات کو حلیم پکے گی۔ صبح تک دیگ تیار ہو جائے گی۔ فجر کے وقت برتن لے کر آجانا اور اپنے حصے کی حلیم لے جانا''۔

فرید نے اپنی زبان سے کچھ بھی نہیں کہا۔ شمشاد کے دروازے سے ہٹتے ہی اس نے جلدی سے دروازہ دوبارہ اندر سے بند کرلیا۔

محرم کی نو تاریخ کی رات کو گلی میں سرِ شام سے ہی غیر معمولی ہنگامے کا آغاز ہو چکا تھا۔ گلی میں جشن کا سا سماں تھا۔

فرید کام پر سے آنے کے بعد جب ایک بار اپنے کمرے میں گھستا تھا تو پھر بالعموم وہ اگلی صبح کو ہی وہاں سے باہر نکلتا تھا۔ رات کا کھانا وہ باہر سے کھا کر آتا تھا اور پھر اپنے کمرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بند ہو جاتا تھا۔

اس روز بھی وہ معمول کے مطابق تقریباً اپنے مقررہ وقت پر گلی میں داخل ہوا اور اس سارے ہنگامے اور شور وغل سے بالکل بے نیاز جو حلیم پکنے کے سلسلے میں گلی میں برپا تھا، اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے نظر اٹھا کر ان لوگوں کی طرف دیکھا بھی نہیں جو دیگ کے اردگرد جمع تھے، لیکن لوگوں نے تو اسے دیکھ لیا تھا۔

''فرید.....'' ایک شخص نے آواز لگائی۔ ''صبح فجر کے وقت آجانا برتن لے کر..... اپنے حصے کی حلیم لے جانا۔''

''دیر نہ کرنا۔'' کسی دوسرے نے کہا۔ ''ورنہ دیگ خالی ہو جائے گی۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔

فرید نے ان دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا اور آہستہ سے گردن ہلا دی۔

اس وقت فرید کی نظر حیدر علی پر پڑی جو لوگوں کے درمیان موجود تھا، لیکن اس نے فرید سے مخاطب ہو کر کوئی بات نہیں کی تھی۔ فرید چلتے چلتے بس ایک لمحے کو ذرا سا رکا، اور اس نے حیدر علی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں نہ جانے ایسی کون سی بات تھی کہ حیدر علی کو اپنے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے ایسا لگا جیسے فرید کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں اور اس کا چہرہ بالکل سیاہ ہو گیا ہے۔

فرید چند لمحوں سے زیادہ نہیں رکا ہوگا، لیکن ان لمحوں کے دوران حیدر علی نے وہ محسوس کر لیا جو کوئی اور شخص محسوس نہیں کر سکا تھا۔ اس کے بعد فرید تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں طرف چل دیا۔ اس نے خود کو گلی میں ہونے والے اس ہنگامے سے، جس میں ہر کوارٹر کا کوئی نہ کوئی فرد شریک تھا، اپنے آپ کو بالکل لاتعلق رکھا تھا۔

فرید اپنے کمرے میں داخل ہو گیا اور اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

رات کے آخری پہر میں حلیم کی دیگ پک کر تیار ہو گئی۔ ساری رات کئی جوان باری باری حلیم گھونٹتے رہے تھے اور اس طرح اس کی تیاری میں بہت سے لوگوں کا ہاتھ تھا۔ کئی گھروں میں عورتیں بھی جاگتی رہی تھیں اور اپنے آپ کو حلیم پکنے کی پیش رفت سے باخبر رکھے ہوئے تھیں۔

فجر کی اذان سے پہلے ہی حلیم کی تقسیم شروع ہو گئی۔ چندہ دینے والے لوگ اپنے اپنے گھروں سے برتن لے کر آنے لگے اور انہیں ان کے حصے کے مطابق حلیم دی جانے لگی۔

حلیم کی تقسیم کے اس ہنگامے میں کسی کو اس بات کا دھیان بھی نہیں آیا کہ فرید اپنا حصہ

لینے کے لیے نہیں آیا ہے۔ دیگ تیزی سے خالی ہوتی جا رہی تھی۔

اچانک شمشاد کو اس بات کا خیال آ گیا کہ اب دیگ بالکل خالی ہونے والی ہے اور فرید اب تک نہیں آیا ہے۔ اس نے ایک لڑکے کو فرید کی طرف دوڑایا۔

''اس سے کہنا کہ جلدی سے برتن لے کر آجائے۔'' شمشاد نے لڑکے کو ہدایت دی۔ ''اور ہم لوگ اب یہاں سے اٹھنے والے ہیں، کام ختم ہو رہا ہے۔''

وہ لڑکا تیزی سے بھاگتا ہوا فرید کے کمرے کے دروازے پر پہنچا اور زور زور سے دستک دینے لگا۔ ذرا دیر کے بعد فرید آنکھیں ملتا ہوا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اس نے خاصی خشمگیں نظروں سے اس لڑکے کو دیکھا۔

''شمشاد بھائی کہہ رہے ہیں کہ آپ برتن لے کر جلدی سے آجائیے اور حلیم لے لیجیے۔'' لڑکے نے جلدی جلدی بولنا شروع کیا۔ ''وہ کہہ رہے ہیں کہ.....''

''نہیں چاہئے ہے۔'' فرید نے لڑکے کی بات کاٹ کر کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

لڑکا حیران نظروں سے دیکھتا ہوا چند لمحوں تک وہاں کھڑا رہا اور پھر واپس آ گیا۔

اس نے شمشاد کے پاس آ کر بتایا کہ فرید نے اس کی پوری بات سنے بغیر ہی یہ کہہ کر دروازہ بند کر لیا کہ نہیں چاہئے۔

''پاگل ہے۔'' وہاں موجود ایک پڑوسی نے کہا۔ ''باؤلا کہیں کا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ایک اور شخص بولا۔ ''اس کے پیسے واپس کر دیں گے۔''

''کیوں؟ کیوں واپس کر دیں گے پیسے؟'' ایک اور شخص نے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے کوئی زبردستی تو نہیں لئے تھے۔ اس نے اپنی مرضی سے دیئے تھے اور وہ تو خرچ بھی ہو گئے۔ اگر وہ اپنا حصہ لینے نہیں آیا تو ہم کیا کریں؟''

تھوڑی دیر میں دیگ خالی ہو گئی، چولہا بجھا دیا گیا۔ جلی ہوئی لکڑیاں عارضی طور پر بنائے گئے سیمنٹ کے بلاکوں کے چولہے میں پڑی رہ گئیں۔ چولہا سیمنٹ کے جن بلاکوں کو اوپر نیچے رکھ کر بنایا گیا تھا، ان میں دو ایک آدھے بلاک کے ٹکڑے بھی شامل تھے۔

یہ سارا اہتمام جس جگہ کیا گیا تھا، وہ حیدر علی کے گھر کے بالکل قریب تھی۔ کئی لوگوں نے تو حیدر علی کے گھر کے آگے بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھ کر حلیم کھائی تھی۔ اس چبوترے پر رات بھر رونق رہی تھی۔

مگر اب یہ چبوترہ خالی تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔

اگلے دن محرم کی دس تاریخ تھی اور سب کی چھٹی تھی۔ سارا کاروبار بند تھا، مگر فرید اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روز بھی صبح کو کہیں نکل گیا اور شام ڈھلے واپس آیا۔ کسی کو اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت تھی اور نہ حوصلہ کہ وہ سارا دن کہاں رہا اور کیا کرتا رہا۔ کسی کو اس سے دلچسپی بھی نہیں تھی۔

اس سے اگلے روز زندگی اپنے معمول پر واپس آ گئی۔ صبح ہی صبح روزانہ کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ فرید بھی اپنے کام پر جانے کے لیے گھر سے نکلا۔ اس وقت فرقان بھی اپنے گھر سے نکل رہا تھا۔ فرقان نے حسب معمول سلام کرنے میں پہل کی۔ فرید نے بے دلی کے ساتھ سر ہلا کر اس کے سلام کا جواب دیا اور چلا گیا۔ فرقان اسے روک کر یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے حلیم لینے سے کیوں انکار کر دیا تھا۔ مگر اس نے فرقان کو اس کا موقع ہی نہیں دیا۔

''جانے یہ کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔'' فرقان نے سخت بیزاری کے ساتھ سوچا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ کسی جنگل سے پکڑ کر لایا گیا ہے۔''

اسی روز شام کو حیدر علی اپنے مکان کے آگے چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔ حلیم پکانے کے لیے اس روز جو جولہا بنایا گیا تھا، اس کے بلاک ابھی تک وہاں پڑے ہوئے تھے۔ جس آدمی کے پاس سے یہ بلاک آئے تھے، وہ ابھی ان کو اٹھا کر نہیں لے گیا تھا۔

حیدر علی اس وقت اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر گلی کے تقریباً وسط میں ابرار اور محبوب نامی دو پڑوسی کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اسی وقت گلی کے سرے پر سے فرید نمودار ہوا۔

فرید کو اپنے کمرے تک پہنچنے کے لیے حیدر علی کے گھر کے سامنے سے گزرنا ضروری تھا۔ وہ روزانہ ہی دن میں دو بار حیدر علی کے گھر کے سامنے سے گزرتا تھا۔ ایک بار صبح کو، ایک بار شام کو، کبھی کبھار شام کے وقت اسے حیدر علی بھی اپنے گھر کے دروازے کے باہر گلی میں نظر آ جاتا تھا۔

اس روز حیدر علی چبوترے پر اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ فرید جب اس کے قریب آیا تو حیدر علی نے اس کو دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ اپنے اس نامعلوم خوف کو شکست دینا چاہتا تھا جو حیدر علی کو دیکھ کر اس پر طاری ہو جاتا تھا اور جس کے لیے وہ اپنے آپ کو مجبور کرنا چاہتا تھا کہ وہ اسے اپنا وہم سمجھے۔

فرید کو دیکھ کر حیدر علی کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس سے اگلے چند لمحوں کے اندر ایک قیامت برپا ہو گئی۔

حیدر علی نے مسکرا کر فرید کی طرف دیکھا، اور ابھی اس کا ہاتھ سلام کے لئے اٹھنے ہی

والا تھا کہ فرید ایک دم غضبناک ہو گیا۔ اس کے حلق سے ایک نہایت مکروہ اور بھیانک آواز بلند ہوئی اور اس نے لپک کر ایک میٹر لمبا سریے کا ٹکڑا جس سے چولہے کی آگ ٹھیک کی گئی تھی اور جو ابھی تک چولہے کے پاس پڑا تھا، کسی وحشی کی طرح جھپٹ کر اٹھا لیا اور پوری طاقت سے حیدر علی کے سر پر پے در پے وار کرتا گیا۔

ایک دردناک چیخ حیدر علی کے حلق سے نکلی اور ساتھ ہی اس کے سر سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ اس کے سر سے نکلنے والے خون کا رنگ صرف سرخ ہی نہیں تھا، اس میں سفیدی بھی شامل تھی۔ سفیدی حیدر علی کے اس بھیجے کی تھی جو کھوپڑی ٹوٹنے کے ساتھ ہی پھٹ کر باہر نکل پڑا تھا۔

جیسے ہی حیدر علی کے حلق سے وہ کربناک چیخ بلند ہوئی، ویسے ہی گلی کے وسط میں کھڑے ہوئے ابرار اور محبوب کی نظریں اس طرف اٹھ گئی تھیں اور ان دونوں نے ایک ساتھ اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ فرید سریا اپنے ہاتھ میں پکڑے حیدر علی کی طرف جھپٹ رہا ہے اور قبل اس کے کہ وہ دونوں دوڑ کر قریب پہنچ سکیں اور فرید کو اس کے اگلے قدم سے روک سکیں، فرید اپنا اگلا قدم اٹھا چکا تھا۔ اس نے پوری قوت سے سریے کے وار حیدر علی کے سر پر کرنے شروع کر دیئے تھے۔

''ابے مار دیا، مار دیا، مار دیا۔'' ابرار بری طرح چیخا۔ اس کی چیخ فرید کے حلق سے نکلنے والی چیخ کے چند ہی لمحوں کے بعد سنائی دی تھی اور تقریباً فوراً ہی اس میں محبوب کی چیخ بھی شامل ہو گئی۔ وہ دونوں برق رفتاری سے اپنی جگہ سے بھاگے اور آن کی آن میں فرید کے سر پر پہنچ گئے۔

فرید سریے کا ٹکڑا ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ ان دونوں کو اپنی طرف جھپٹتے دیکھ کر اس نے وہ سریا ہاتھ سے چھوڑ دیا اور وہ خود خاموشی سے اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

''ابے یہ کیا کر ڈالا سؤر کے بچے؟'' ابرار نے بری طرح دھاڑتے ہوئے فرید کو دبوچنے کی کوشش کی، لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ فرید نے نہ تو کوئی مزاحمت کی اور نہ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ وہ کسی بت کی طرح اپنی جگہ پر خاموشی سے کھڑا رہا۔

ابرار اور محبوب نے اپنی آنکھوں سے فرید کو حیدر علی کے سر پر سریے کے وار کرتے دیکھا تھا، لیکن صرف ان دونوں نے ہی نہیں کچھ اور لوگ بھی تھے جنہوں نے دیکھا تھا۔

بالکل سامنے والے مکان کی کھڑکی میں مجیب چاچا کھڑے ہوئے تھے۔ مجیب چاچا محلے کے بزرگوں میں سے تھے اور لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک کمرے کی کھڑکی سے اس پوری واردات کو دیکھا اور پھر وہ بھی چیختے چلاتے جلدی سے اپنے گھر سے نکل کر باہر آ گئے۔

گلی میں ایک زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا۔ زبیدہ اس وقت اپنے گھر میں باورچی خانے میں تھی۔ وہ شور کی آوازیں سن کر باہر آ گئی اور فرقان سے، جو صحن میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا، کہنے لگی کہ وہ ذرا باہر جا کر دیکھے تو کہ یہ شور کیسا ہے۔

''ہاں، کچھ گڑبڑ سی معلوم ہو رہی ہے۔'' فرقان نے تائید کی اور وہ پلنگ سے اٹھ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

بہت سے گھروں سے لوگ باہر نکل آئے تھے۔ ابرار نے ایک اور آدمی کی مدد سے فرید کو پکڑ رکھا تھا۔ محبوب اور مجیب چاچا خون میں لت پت حیدر علی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حیدر علی کے سر سے خون فوارے کی طرح بہہ رہا تھا اور محبوب اور مجیب چاچا کے کپڑے اس خون سے سرخ ہوئے جا رہے تھے۔

اسی وقت شور کی آواز سن کر حیدر علی کی بیوی زرینہ گھر سے باہر نکلی اور اس نے جب یہ دلخراش منظر دیکھا تو اس کے حلق سے نکلنے والی فلک شگاف چیخ فضا کو چیرتی چلی گئی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

جلدی سے ایک چارپائی لائی گئی اور اس پر حیدر علی کو لٹا دیا گیا۔

''ہسپتال لے چلو..... ہسپتال لے چلو۔'' کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہو رہی تھیں۔

''پولیس کو خبر کر دو..... ارے جلدی سے فون کرو۔'' کوئی چلایا۔ ''بنن بھائی کی دکان سے فون کر دو۔'' فوراً ہی دو آدمی بنن حلوائی کی دکان کی طرف بھاگے۔ جہاں فون موجود تھا۔

مجیب چاچا کی تجربہ کار نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ حیدر علی کو ہسپتال لے جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اس کی لاش کی چیر پھاڑ کی جائے۔ حیدر علی کے سر سے خون فوارے کی طرح باہر نکل نکل کر بہہ رہا تھا اور اس صورت میں انسان کے زندہ بچ جانے کا بھلا کیا سوال پیدا ہوتا تھا۔

فرقان نے شدید بدحواسی اور سراسیمگی کے عالم میں گھر کے اندر واپس آ کر زبیدہ سے کہا۔ ''غضب ہو گیا۔ ہمارے کرائے دار فرید نے حیدر علی کا خون کر دیا ہے۔''

''یا اللہ خیر.....'' زبیدہ ایک دم چلاتی ہوئی باہر کی طرف بھاگی۔ خود فرقان بھی دوبارہ باہر کی طرف جا رہا تھا۔

''اسے کیوں مارا سؤر کی اولاد؟'' ابرار نے فرید کے منہ پر ایک تھپڑ مارتے ہوئے

کہا۔ ''کیوں مارا تُو نے اس کو؟ اس نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ کیوں مارا تُو نے اس کو پاگل کے بچے؟''

کسی گھر سے فوری طور پر رسی آ گئی تھی اور فرید کے دونوں ہاتھوں کو رسی میں جکڑ دیا گیا تھا۔ ابرار کے علاوہ دو آدمی بھی اسے پکڑے ہوئے تھے، لیکن فرید نے وہاں سے ہلنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ وہ بالکل خاموشی سے وہاں کھڑا رہا۔ لوگوں نے رسی کے دوسرے سرے کو چارپائی کے پائے کے ساتھ باندھ دیا تھا۔

گلی کے سارے لوگ، جن میں مرد اور عورتیں اور بچے شامل تھے، اپنے اپنے گھروں سے نکل کر، بھاگ بھاگ کر فرید کے گھر کے سامنے جمع ہو رہے تھے اور ایک زبردست چیخ پکار مچی ہوئی تھی، ہر نیا آنے والا دریافت حال کے لیے کسی ایسے شخص سے رجوع کرتا تھا جو وہاں پہلے سے موجود تھا اور ساتھ ہی جب اس کی نظر حیدر علی کے ٹوٹے پھوٹے خون آلود چہرے پر پڑتی تھی تو وہ ایک دم جیسے بے حال ہو جاتا تھا۔ حیدر علی کا چہرہ تو جیسے ناقابل شناخت ہو گیا تھا۔

تھانہ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا اور ایمبولینس کے آنے سے پہلے ہی پولیس کی موبائل آن پہنچی۔ لوگوں نے ایمبولینس کے لیے بھی فون کر دیا تھا۔

پولیس والوں نے آنے کے ساتھ ہی سارے لوگوں کو وہاں سے ہٹایا۔ پولیس افسر نے حیدر علی کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور اس نے تاسف کے گہرے احساس کے ساتھ کہا۔ ''یہ..... یہ تو مر چکا ہے۔''

زرینہ نے نیم بے ہوشی کے عالم میں یہ الفاظ سنے۔ وہ دروازے میں کھڑی ہوئی تھی اور کئی عورتیں اسے سنبھالے ہوئے تھیں۔ ورنہ وہ گر پڑتی۔ پولیس افسر کی بات سن کر اس کے حلق سے درد میں ڈوبی ہوئی چیخ نکلی۔ ''نہیں..... نہیں..... ارے ایسا نہ کہو..... ایسا نہ کہو.....''

پولیس افسر نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اس قسم کی تجربات سے بار بار گزرتے رہنے کے بعد شاید اس کے لیے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہی تھی اور نالہ شیون کی ایسی دردناک آوازیں اس کے دل میں کسی بھی ترحم آمیز احساس کو نہیں جگاتی تھیں۔ وہ فوراً ہی فرید کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو رسیوں سے بندھا ہوا چارپائی کے پاس کھڑا تھا۔

''اس نے مارا ہے۔'' ابرار نے پولیس افسر سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ اس وقت بھی فرید کی گردن پکڑے ہوئے تھے۔ ''اس نے مارا ہے صاحب..... ہماری نظروں کے سامنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مارا ہے۔''

''کیوں؟ تُو نے مارا ہے؟'' پولیس افسر نے فرید کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں مارا ہے؟''

فرید نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے پولیس افسر کو گھورتا رہا۔

''ٹھیک ہے۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''تجھ سے تو اچھی طرح پوچھ لیں گے..... اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک حوالدار کو حکم دیا کہ ملزم کو ہتھکڑی لگا دی جائے۔

فرید کو ہتھکڑی لگا دی گئی اور موقع واردات پر معمول کی کارروائی کا آغاز ہو گیا۔ اس دوران ایمبولینس بھی آ گئی اور کچھ دیر بعد لاش کو اس ایمبولینس میں پولیس کی نگرانی میں ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ پولیس کے فوٹو گرافر نے لاش کی تصویریں وغیرہ لے لی تھیں اور باقی کارروائی کی جا رہی تھی۔

کم از کم تین عینی شاہد تو ایسے موجود تھے جنہوں نے اس واردات کو بالکل واضح طور پر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ حیدر علی کو ہلاک کرنے والا فرید تھا اور یہ کہ فرید نے اچانک ہی سریے کا ٹکڑا اٹھا کر حیدر علی کے سر پر مسلسل مارا تھا، جبکہ حیدر علی کو اس حملے کی توقع تھی اور نہ وہ اس کے لیے تیار تھا۔ ان تین کے علاوہ ایک خاصی بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو اس واقعے کے فوراً بعد شور سن کر بھاگتے ہوئے وہاں آ گئے تھے اور انہوں نے قتل کے اس منظر کے آخری حصے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ حیدر علی اپنے پھٹے ہوئے سر کے ساتھ خون میں نہایا پڑا تھا اور اس کے سامنے فرید کھڑا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں سریا تھامے ہوئے۔

فرقان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ زندگی میں کبھی بھی ایسی خطرناک صورت حال سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ اس کا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن یہ عذاب کیا کم تھا کہ فرید اس کا کرایہ دار تھا۔

ملزم کو تھانے لے جانے سے پہلے، پولیس افسر نے اس سب سے پہلے سرسری طور پر ملزم سے پوچھ گچھ کی، لیکن ملزم کا رویہ بہت ہی عجیب و غریب تھا۔ اس نے صحت جرم سے انکار نہیں کیا، لیکن جب پولیس افسر نے اس سے یہ پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو اس نے اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کی۔ پولیس افسر نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ اسے یقین تھا کہ تھانے لے جانے کے بعد وہ اس کی زبان سے سب کچھ اگلوا لے گا۔ وہ بڑے بڑے بدمعاشوں کی زبانیں کھلوانے کا ڈھنگ خوب جانتا تھا۔

پولیس افسر نے عینی شاہدوں کے بیان لئے، ان میں اہم ترین اور بنیادی اہمیت کے حامل تین افراد تھے۔ ابرار، محبوب، اور چاچا مجیب۔

''ان دونوں کی آپس میں کوئی دشمنی تھی؟'' پولیس افسر نے عینی شاہدوں سے پوچھا۔ ''کوئی جھگڑا تھا ان کے درمیان؟''

''ارے نہیں صاحب۔'' مجیب چاچا نے سختی کے ساتھ تردید کرتے ہوئے کہا۔ ''بھلا حیدر علی کسی سے کیا جھگڑا کرتا؟ میں اس محلے میں پچھلے بیس سال سے رہ رہا ہوں اور حیدر علی پندرہ سال سے رہ رہا تھا۔ آج تک حیدر علی کا کسی سے جھگڑا نہیں ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ اکثر گھروں کے لوگ کبھی کبھار ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، لیکن حیدر علی کی کسی سے کبھی بھی لڑائی نہیں ہوئی۔''

''لڑائی ہمیشہ دوطرفہ ہی نہیں ہوتی۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''یہ کبھی کبھی یک طرفہ بھی تو ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مقتول کو قاتل سے کوئی دشمنی نہ ہو، لیکن قاتل کو مقتول سے دشمنی ہو۔ اسے کوئی ایسی شکایت ہو جس کا مقتول کو علم ہی نہ ہو۔''

''ہمیں تو صاحب ایسی کوئی بات نہیں معلوم۔'' مجیب چاچا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور..... کسی اور کو بھی شاید ایسی کوئی بات نہیں معلوم۔''

فرقان سے پوچھ گچھ کی باری آئی تو فرقان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ اس شخص کے بارے میں پولیس کو کیا بتائے؟ وہ تو اس کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کس شہر کا رہنے والا تھا، سوائے اس کے کہ اس نے خود کو پنجاب کا رہنے والا بتایا تھا۔ وہ کب سے کراچی میں تھا؟ کس کی ضمانت یا سفارش پر اسے کمرہ کرائے پر دیا گیا؟ یہ سارے بڑے پریشان کن سوالات تھے۔ تاہم فرقان کو کسی حد تک اپنے محلے والوں کا سہارا تھا۔ اسے بھروسہ تھا کہ محلے کے تمام لوگ اس کے بیان کی حمایت کریں اور اس امر کی تصدیق کریں گے کہ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پولیس افسر نے فرقان سے کافی تفصیلی پوچھ گچھ کی، لیکن فرقان کے پاس بتانے کے لیے بہت زیادہ نہیں تھا۔ اس کے پاس جو کچھ تھا وہ اس نے بلا کم و کاست پولیس افسر کو بتا دیا۔ تینوں عینی گواہوں کی طرح اس نے بھی اس امر کی پوری طرح سے توثیق کی کہ مقتول اور قاتل کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں تھا۔

''وہ تو محلے میں کسی سے بات بھی نہیں کرتا تھا صاحب۔'' فرقان نے فرید کے بارے میں کہا۔ ''اس کا کسی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ دعا سلام تک نہیں کرتا تھا کسی سے۔ سب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوگوں کو اس کے اس رویے پر تعجب تھا.....''

''تو تم نے ایسے آدمی کو اپنا کرایہ دار کیوں بنایا؟'' پولیس افسر نے فرقان کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''اس نے آج تک میرے گھر والوں کو یا محلے کے کسی بھی شخص کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی صاحب۔'' فرقان نے سنبھل کر کہا۔ ''اگر وہ محلے کے کسی بھی شخص سے کوئی جھگڑا کرتا تو میں اس کو کھڑے کھڑے نکال باہر کرتا، لیکن اس نے کبھی ایسا نہیں کیا صاحب۔ اس نے تو محلے میں کسی سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھا۔''

''تو کیا یہ پاگل ہے؟'' پولیس افسر نے پوچھا۔ ''اس نے اس سے پہلے کبھی کوئی ایسی حرکت، کی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اس کا دماغی توازن درست نہیں ہے؟''

''نہیں جناب!'' فرقان نے فوراً کہا۔ ''یہ بالکل پاگل نہیں ہے اور اس نے آج تک کوئی ایسی حرکت نہیں کی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اس کا دماغی توازن خراب ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔''

''تو پھر ہم اس کو تھانے لے جا کر اور ٹھیک کر دیں گے۔'' پولیس افسر نے فرید کی طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''اور تم لوگوں کو بھی تھانے بلایا جائے گا۔'' اس نے فرقان کے علاوہ عینی گواہوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں کے تفصیلی بیان تھانے میں ریکارڈ کئے جائیں گے۔ اس کے بعد ہی کارروائی آگے بڑھے گی۔''

پولیس قاتل فرید کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے چلی گئی۔ گلی میں ایک ہیجانی اور ماتمی فضا طاری تھی۔ حیدر علی کا چھوٹا سا گھر عورتوں سے بھرا ہوا تھا اور وہاں سے حیدر علی کی بیوی زرینہ کی وحشت ناک چیخیں بلند ہو کر ساری گلی کی فضا میں گھل رہی تھیں۔ زرینہ کے ساتھ بہت سی دوسری عورتیں بھی رو رہی تھیں۔ زرینہ کے گھر میں تل دھرنے کو جگہ نہیں رہی تھی۔

مرد مقتول کے گھر کے دروازے کے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ پڑوسیوں نے اپنے اپنے گھروں سے چارپائیاں نکال کر باہر گلی میں ڈال دی تھیں۔ بہت سے لوگ ان پر بیٹھ گئے تھے۔

''یہ اچانک اس کو ہوا کیا؟'' ابرار دوسرے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ ''میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔ حیدر علی تو بالکل خاموشی کے ساتھ اپنے گھر کے چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ادھر سے گزر رہا تھا۔ حیدر علی نے اس سے کوئی بات بھی نہیں کی۔ کچھ کیا بھی نہیں۔ بس شاید ہاتھ اٹھا کر سلام کرنا چاہا

تھا کہ اس کم بخت نے ایک چیخ مار کر سریا اٹھا لیا اور حیدر علی کا سر پھاڑ دیا۔ حیدر علی بے چارہ تو سانس بھی نہیں لے سکا۔''

''اور اس نے بھاگنے کی بھی کوشش نہیں کی۔'' محبوب نے کہا۔ ''حیدر علی کو زخمی کرنے کے بعد وہ اسی طرح کھڑا رہا گویا اس بات کا انتظار کر رہا ہو کہ کوئی آئے اور اس کو پکڑ لے۔''

''مجھے تو یہ شروع سے ہی کوئی خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔'' ایک نوجوان شخص بولا۔ ''اس کے طور طریق ٹھیک نہیں لگتے تھے۔''

''ابے کیوں بے فضول بکواس کرتا ہے؟'' مجیب چاچا نے کرخت لہجے میں اس کو ڈانٹا۔ ''اس نے کون سا ایسا کام کیا تھا کہ وہ خطرناک آدمی لگتا؟ ابے، اگر پولیس والوں کے سامنے یہ بات کہہ دی تو دن بھر تجھے تھانے میں بٹھا کر سوال جواب کرتے رہیں گے؟''

نوجوان آدمی ایک دم سہم گیا۔ وہ گھبرا کر بولا۔ ''نہیں نہیں مجیب چاچا، میرا یہ مطلب نہیں تھا..... میں تو.....''

''مطلب تمہارا جو کچھ بھی ہو۔'' مجیب چاچا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''سوچ سمجھ کر بات زبان سے نکالا کرو..... پولیس والے ایسی باتوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جینا دوبھر کر دیں گے وہ تمہارا بھی اور دوسروں کا بھی.....''

''مجیب چاچا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' محبوب نے کہا۔ ''وہ اتنے دنوں سے اس محلے میں رہ رہا تھا۔ اس نے تو کبھی آنکھ اٹھا کر بھی کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ پھر تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ شروع سے ہی ایک خطرناک آدمی لگتا تھا؟''

''ہو سکتا ہے، اس پر کوئی سایہ ہو۔'' دین محمد نے قدرے پُراسرار انداز میں سرگوشی میں کہا۔

''خدا کے واسطے دینو۔'' ایک اور شخص نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔ ''یہ تم اپنے بھوت پریت اور آسیب کے قصے اپنے ہی پاس رکھو۔''

''ارے تو پھر اس نے کیوں مار دیا حیدر علی کو؟'' دین محمد اتنی آسانی سے شکست قبول کرنے والا نہیں تھا۔ ''کوئی لڑائی جھگڑا نہیں، کوئی تکرار نہیں، بس ایک دم سے سریا اٹھایا اور مار دیا..... اور وہ پاگل بھی نہیں ہے۔ ضرور کسی آسیب کا سایہ ہے اس پر.....''

''وہ پولیس والے معلوم کر لیں گے۔'' محبوب نے بیزاری سے کہا۔ ''پولیس والوں کو آسیب اتارنا خوب آتا ہے۔''

زبیدہ بھی ان عورتوں میں شامل تھی جو اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئی تھیں اور وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کافی دیر تک مقتول کے گھر کے دروازے میں دوسری عورتوں کے ساتھ کھڑی رہی تھی اور جب پولیس والے لوگوں سے اور خاص طور پر فرقان سے، سوال جواب کر رہے تھے تو وہ بڑے غور سے ایک ایک لفظ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی طرف سے کچھ زیادہ ہی پریشان تھی۔ قاتل اس کے مکان میں کرایہ دار تھا۔ خدا جانے پولیس والے اس کے میاں کے ساتھ کیا کریں۔ وہ دل ہی دل میں ان رشتے داروں اور جاننے والوں کے نام یاد کرنے اور انہیں دہرانے کی کوشش کر رہی تھی جن کی پولیس میں کوئی جان پہچان تھی، یا جو کسی قدر اثر ورسوخ کے حامل تھے..... نہ جانے کب ضرورت پڑ جائے۔ اس کے دل میں خوف کی تیز وتند لہریں اٹھ رہی تھیں۔

پولیس والوں نے وہاں سے جانے سے پہلے اس کمرے کی اچھی طرح تلاشی بھی لی تھی جس میں فرید رہتا تھا۔ اس کمرے میں کم ترین اور معمولی ترین سامان پایا جاتا تھا۔ روزمرہ کے استعمال کی محض چند چیزوں کے علاوہ جن میں کپڑے، جوتے، تولیہ، صابن، ٹوتھ پیسٹ، ریزر، برش وغیرہ شامل تھے اور کچھ نہیں تھا۔ البتہ الماری کے ایک خانے میں کچھ رقم بھی موجود تھی، لیکن یہ کچھ اتنی زیادہ نہیں تھی۔ وہاں سے جاتے وقت پولیس والوں نے اس کمرے کے دروازے میں باہر سے تالا لگا دیا تھا اور فرقان کو سختی کے ساتھ ہدایت کر دی تھی کہ اس تالے کو کھولا نہ جائے۔ فرقان نے انہیں یقین دلایا تھا کہ کوئی بھی اس دروازے کو ہاتھ نہیں لگائے گا اور اب وہ کمرہ بند ہو چکا تھا۔

کافی دیر کے بعد فرقان اور زبیدہ اپنے گھر میں واپس آئے۔ بچوں کو کھانا دینا تھا اور خود بھی کھانا کھانا تھا، لیکن دونوں بہت زیادہ پریشان اور خوفزدہ تھے۔ کھانا کھانے کو ان کا جی بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

اس اچانک اور غیر متوقع افتاد کے نتیجے میں فرقان اور زبیدہ کے لیے بڑے مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ قاتل کا مالک مکان ہونے کا ''جرم'' تو اپنی جگہ پر تھا ہی۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی پریشانیاں تھیں۔ ان میں سب سے بڑی پریشانی تو یہ تھی کہ پولیس والوں نے کمرے کو سیل کر دیا تھا اور اب خدا جانے اسے کب تک اسی طرح سیل رہنا تھا۔ زبیدہ کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے پوچھا۔ فرقان کو بھی ایسے کسی معاملے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے پریشانی کے ساتھ کہا۔ ''کسی سے پوچھنا پڑے گا۔ ویسے ایک بات تو میں جانتا ہوں۔ اگر ہمارے کمرے کا تالا کھل بھی جائے تو شاید بہت عرصے

تک کوئی شخص یہاں کرائے دار کے طور پر نہیں آئے گا۔ کوئی جگہ اگر ایک بار بدنام ہو جائے تو پھر اس کو ٹھیک کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے''۔

☆======☆======☆

فرید کو تھانے لے آیا گیا۔ وہ بالکل خاموش اور پُرسکون رہا۔ راستے میں پولیس والوں نے اس سے کچھ بات کرنے کی کوشش کی، لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس خاموش بیٹھا رہا۔ پولیس والے بھی تنگ آ کر خاموش ہو گئے۔

اور اب وہ تھانے کے ایک کمرے میں پولیس افسر کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت، بے جان اور ہر قسم کے تاثرات سے یکسر عاری معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ کسی زندہ انسان کا چہرہ ہی نہیں ہے۔

پولیس افسر اس کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''تم نے حیدر علی کے سر پر سریا مار کر اسے ہلاک کیا؟'' پولیس افسر نے اس پوچھا۔

''جی ہاں۔'' فرید نے فوراً بلا تامل، پُرسکون انداز میں جواب دیا۔ اس کے اعتراف کا یہ انداز خاصا حیران کن تھا۔

''کیوں؟'' پولیس افسر نے پوچھا۔ ''تم نے اس کو کیوں ہلاک کیا؟''

''کیونکہ میں اس سے نفرت کرتا تھا۔'' فرید نے اسی لب ولہجے میں جواب دیا۔

''تم اس سے نفرت کرتے تھے؟'' پولیس افسر نے تیز اور چبھتی ہوئی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہو گی، نفرت کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے؟ کیا وجہ تھی؟ تم اس سے نفرت کیوں کرتے تھے؟''

فرید نے اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح پتھر بنا خاموش بیٹھا رہا۔

''تم جواب کیوں نہیں دیتے؟'' پولیس افسر نے نرمی سے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ اب جبکہ ملزم نے بولنا شروع کر دیا ہے تو اس کیس کو آسانی سے سلجھایا جا سکے گا۔ ملزم اقبال جرم تو پہلے ہی کر چکا تھا اور اگر نہ بھی کرتا تو بھی اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا، کیونکہ اس کے جرم کے کئی عینی شاہد موجود تھے، تاہم ملزم نے اپنی زبان سے اعتراف جرم کر لیا تھا اور اس طرح ایک بہت بڑی رکاوٹ دور ہو گئی تھی۔ اب صرف ان اسباب کا پتہ لگانے کی ضرورت تھی جو اس عجیب وغریب نوعیت کے جرم کی تہ میں کارفرما تھے۔

''تم اس سے کیوں نفرت کرتے تھے؟'' قدرے توقف کے بعد پولیس افسر نے اپنا سوال دہرایا۔ ''نفرت کی وجہ کیا تھی؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش بیٹھا خلا میں اس طرح گھورتا رہا جیسے یہ سوال اس سے نہیں کسی اور سے کیا جا رہا ہو۔

''کیا تمہارا اس سے کوئی جھگڑا ہوا تھا؟'' تھوڑی دیر رک کر پولیس افسر نے دوبارہ نرمی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' فرید نے مختصر سا جواب دیا۔

''اس نے تم کو کوئی نقصان پہنچایا تھا؟'' پولیس افسر نے اپنی جرح جاری رکھی۔

''تمہاری کوئی چیز چھین لی تھی یا چرا لی تھی؟''

''نہیں۔'' فرید نے جواب دیا۔

''تو پھر تمہیں شاید اس بات کا اندیشہ تھا کہ وہ تم کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہے؟ اس لیے تم نے پہلے ہی اس کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا؟''

''نہیں۔'' فرید نے پولیس افسر کے چہرے کے طرف دیکھے بغیر خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی نہیں۔'' پولیس افسر نے اپنے ابھرتے ہوئے غصے کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے خاصے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو یہ بھی نہ سہی۔ اگر تم سے دشمنی نہ تھی تو تمہارے کسی دوست یا رشتے دار وغیرہ کے ساتھ اس کی کوئی دشمنی ہو گی؟''

''نہیں۔'' فرید نے جواب دیا۔

اچانک پولیس افسر کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور وہ ایک دم جیسے پھٹ پڑا۔

ابے، یہ بھی نہیں، وہ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں تو تُو نے اس کو کیوں مار ڈالا گدھے کے بچے؟ آدمی کو قتل کر دینا مذاق سمجھ رکھا ہے اُلو کی اولاد؟ کمینے اتنے جوتے ماروں گا کہ عقل ٹھکانے آ جائے گی۔ سیدھی طرح بتا دے، کیوں مارا تُو نے اس آدمی کو؟''

فرید کی زبان بدستور بند رہی اور اس کا تاثرات سے عاری چہرہ بالکل پتھر کی طرح سخت رہا۔

''حوالدار۔'' پولیس افسر زور سے دھاڑا اور اس کی دھاڑ سنتے ہی کمرے میں ایک حوالدار داخل ہوا اور زور سے سلیوٹ کر کے ایک طرف باادب کھڑا ہو گیا۔

''اس حرامی کو لے جاؤ اور ذرا تھوڑا سا گرم کر دو اس کو۔ اس کا دماغ بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے اور اس نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ ذرا گرمی آ جائے گی تو دماغ چل پڑے گا۔ پھر یہ سب کچھ بتائے گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے حوالدار کو آنکھ ماری۔ حوالدار اس طے شدہ

اشارے کا مطلب جانتا تھا، یعنی ابھی ملزم پر زیادہ تشدد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، صرف سختی کے ساتھ پوچھ گچھ کی جائے اور دو چار تھپڑوں، گھونسوں اور لاتوں سے زیادہ کی خوراک نہ دی جائے۔ کیونکہ ملزم نے اس حد تک تو تعاون کیا تھا کہ اس نے اپنا جرم تسلیم کر لیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ اس نے مقتول کو اس لیے ہلاک کیا کیونکہ وہ اس سے نفرت کرتا تھا، لیکن اس سے آگے کچھ بتانے پر وہ تیار نہیں تھا۔ تاہم امید کی جا سکتی تھی کہ وہ بتائے گا اور بہت زیادہ تشدد کے بغیر ہی بتائے گا۔

پولیس افسر کی بات ابھی پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایس آئی اشرف علی کمرے میں داخل ہوا۔

کچھ دن پہلے ڈی ایس پی غلام نبی کا تبادلہ ہو گیا تھا اور اب وہ جس علاقے کا ڈی ایس پی تھا، کورنگی کا علاقہ بھی اس میں شامل تھا۔ ڈی ایس پی غلام نبی تبادلہ ہونے کے بعد جب اس علاقے میں آیا تو اس نے اپنی ذاتی کوششوں سے ایس آئی اشرف کا تبادلہ بھی اس علاقے میں کروا لیا۔ وہ اشرف علی پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا اور اسے اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ خود اشرف علی کی بھی یہی خواہش ہوتی تھی کہ اسے ڈی ایس پی غلام نبی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے۔ غلام نبی کے ساتھ کام کرنے میں اسے معاملاتِ زندگی کو بہت سے مختلف اور منفرد زاویوں سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا تھا۔

ایس آئی اشرف علی کمرے میں داخل ہوا تو اے ایس آئی جواد حسین اس کو دیکھتے ہی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اسے سلیوٹ کیا۔ اس وقت حوالدار اور فرید کمرے کے اندر ہی موجود تھے۔

''کیا ہو رہا ہے جواد حسین؟'' اشرف علی نے مسکراتے ہوئے خوشدلی کے ساتھ جواد حسین سے پوچھا۔ اس نے کمرے میں ایک ملزم اور حوالدار فیروز خاں کو دیکھ لیا تھا۔

''ایک ملزم ہے سر۔'' جواد حسین نے فرید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''عجیب و غریب آدمی ہے۔ ایک شخص کے سر پر سریا مار کر اسے ہلاک کر دیا۔ ویسے تو کئی چشم دید گواہ موجود ہیں سر، یہ اقبالی مجرم ہے۔ اسے موقع واردات سے پکڑا گیا ہے۔ اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر یہ قتل کی وجہ نہیں بتاتا۔ یہ کہتا ہے کہ اس کو مقتول سے نفرت تھی۔''

اشرف علی کو یہ معاملہ بڑا عجیب سا لگا۔ اس کی تہہ میں ضرور کچھ نہ کچھ ہو گا۔

''مقتول سے نفرت تھی۔'' اشرف علی نے غور سے فرید کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کے خدوخال اور اتار چڑھاؤ پر نظریں جما دیں۔ ''مگر کیوں نفرت تھی؟ کس بات پر جھگڑا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا؟''

''یہ اس بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔'' جواد حسین نے کہا۔ ''کہتا ہے نہ کوئی دشمنی تھی، نہ کوئی جھگڑا تھا، نہ کوئی مخالفت تھی۔'' اور اس کے بعد جواد حسین نے اشرف علی کو اس واردات کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ بتا دیا۔ حوالدار اس وقت تک ملزم کو لے کر کمرے سے باہر نہیں گیا اور وہیں رکا رہا۔

اشرف علی کو یہ ساری باتیں سن کر سخت حیرت ہوئی۔ اس شخص نے بلا کسی اشتعال کے سر یا چبوترے پر بیٹھے ہوئے شخص کے سر پر دے مارا تھا اور سارے معاملے کو یہ کہہ کر ختم کر دینا چاہتا تھا کہ اس کو مقتول سے نفرت تھی۔ اشرف علی نے ملزم سے خود سوال جواب شروع کر دیے، لیکن ملزم نے اس کو وہی جوابات دیئے جو وہ پہلے دے چکا تھا۔

''ٹھیک ہے، لے جا کر بند کر دو۔'' اشرف علی نے حوالدار سے کہا۔ ''اس سے تفصیلی تفتیش بعد میں کریں گے۔''

حوالدار فرید کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔

''اس کیس کے سلسلے میں جلد بازی سے کام مت لو۔'' اشرف علی نے اپنے ماتحت کو سمجھایا۔ ''یہ شخص اس وقت شدید ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ یہ کچھ دیر پہلے ہی ایک بھیانک جرم کر چکا ہے۔ اس کے دماغ کو ذرا ٹھنڈا ہونے اور اسے سوچنے سمجھنے کے قابل ہونے کا موقع دو۔ اس وقت اسے مت چھیڑو۔ ہم کل صبح اس سے بات کریں گے۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' جواد حسین نے کہا۔

اشرف علی نے جواد حسین سے اس کیس کی ساری تفصیلات پوچھ لیں اور عینی گواہوں وغیرہ کے بارے میں بھی جان لیا۔

''ان کو تھانے بلا کر ان کے تفصیلی بیانات لینے ہیں۔'' جواد حسین نے کہا۔

''لے لینا۔'' اشرف علی نے کہا۔ ''جیسا کہ تم بتا رہے ہو، وہ سب اسی گلی کے رہنے والے لوگ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کہیں بھاگ کر نہیں جائے گا۔''

''یہ آدمی میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے سر۔'' جواد حسین نے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ کوئی بہت ہی پہنچا ہوا ہے۔ کوئی ایک نمبر کا بدمعاش ہے۔ شاید کرائے کا قاتل..... ممکن ہے اس نے کسی سے پیسے لے کر اس شخص کو قتل کر دیا ہو۔''

''اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔'' اشرف علی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بہر حال، جو بھی حقیقت ہوگی وہ سامنے آ جائے گی۔ کل صبح کو ہم اس سے بات کریں گے۔ تب تک کے

لیے اسے اکیلا چھوڑ دو۔''

اگلی صبح کو تھانے کے ایک کمرے میں فرید سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سے پوچھ گچھ کرنے والوں میں ایس آئی اشرف علی اور اے ایس آئی جواد حسین دونوں شامل تھے۔ اشرف علی اس عجیب و غریب کیس کی پیش رفت سے اپنے آپ کو پوری طرح واقف رکھنا چاہتا تھا۔

اشرف علی کی حیرت اس وقت دو چند ہوگئی جب فرید نے اپنے بارے میں کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔ اپنا اور اپنے باپ کا نام بتانے کے علاوہ اس نے اور کچھ نہیں بتایا۔ وہ کہاں کا رہنے والا تھا، اس کے گاؤں یا شہر کا کیا نام تھا، اس کا خاندان کہاں اقامت پذیر تھا اور اس کے خاندان میں اور کون کون لوگ تھے، اس نے ان سارے سوالوں کے جواب میں صرف خاموشی اختیار کی۔ وہ لوگ اس سے پوچھ پوچھ کر پریشان ہو گئے، لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ پولیس والوں کو اس کے بارے میں بس وہی کچھ معلوم ہو سکا جو اور دوسرے لوگوں کو بھی معلوم تھا۔ دوسرے لوگوں کو اس کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ وہ مشینوں کے ذریعے کپڑے پر کڑھائی کا کام کرتا ہے اور لانڈھی کے ایک چھوٹے سے کارخانے کے ساتھ وابستہ ہے۔ اپنے جرم کا واضح اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی واحد دلیل یہ تھی کہ وہ مقتول سے نفرت کرتا تھا۔ ہزار پوچھنے کے باوجود اس نے اس نفرت کی کوئی وجہ نہیں بیان کی۔ تشدد کی دھمکیاں بھی اس کے رویے میں کوئی نرمی پیدا نہ کر سکیں۔ اس کا چہرہ یوں ہی پتھر کی طرح سخت رہا جیسے اس میں کوئی جان ہی نہ ہو۔ اشرف علی نے اس کو واپس حوالات میں بھجوا دیا۔

''دیکھو جواد حسین۔'' اشرف علی نے کہا۔ ''جہاں تک اس کو سزا دلوانے کا تعلق ہے تو اس کیس کی صورت حال کے پیش نظر وہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ تین خالص عینی گواہ موجود ہیں اور ان کے علاوہ بہت سے دیگر گواہ بھی موجود ہیں۔ یہ خود بھی اقبالی مجرم ہے۔ لہٰذا ہمیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ ہم یہ کیس ہار جائیں گے۔ اس کو سزا دلانے کے لیے ہمارے پاس بہت مواد موجود ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس جرم کے سبب کو دریافت کریں اور وہ اس لیے کہ جیسا کہ تم نے خدشہ ظاہر کیا ہے، یہ کہیں کرائے کا قاتل تو نہیں ہے اور اس نے کسی کے اشارے پر، کسی سے رقم وغیرہ لے کر تو اس شخص کو نہیں مارا ہے۔''

''یہ خیال میرے دماغ میں ہے سر۔'' جواد حسین نے کہا۔ ''لیکن پورا واقعہ جس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انداز سے پیش آیا ہے، اس کی روشنی میں کچھ بھی سمجھنا مشکل ہے۔''

''مجرم جب اقبال جرم کرلے تو پھر اس کے ساتھ مار پیٹ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔'' اشرف علی نے کہا۔ ''پھر اسے دوسرے طریقوں سے رام کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ یہ کچھ زیادہ ہی الجھا ہوا کیس ہے اور ہمیں اس کے بارے میں ڈپٹی صاحب کو بتا دینا چاہئے۔ ہم آئندہ اس سلسلے میں جو بھی کارروائی کریں، وہ ڈپٹی صاحب کے مشورے سے ہی کریں۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' جواد حسین نے کہا۔ ''آپ انہیں بتا دیجئے، پھر ہم ان کی ہدایات کے مطابق ہی کام کریں گے۔''

ڈی ایس پی غلام نبی کو جب اس عجیب وغریب کیس کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے فوری طور پر اس میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس نے اشرف علی اور جواد حسین دونوں کی تفصیلی بات سنی اور تمام متعلقہ کاغذات کا بھی معائنہ کیا۔

''میں اس شخص سے ملنا چاہتا ہوں۔'' غلام نبی نے کہا۔ ''اس کو بلواؤ۔ میں خود بھی اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

ملزم فرید کو ایک بار پھر پولیس افسروں کے سامنے لایا گیا۔ ڈی ایس پی غلام نبی نے نئے سرے سے اس سے سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا، لیکن کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوا۔ فرید نے نہ تو اپنے بارے میں، اپنے خاندان کے بارے میں یا اپنے سابقہ گھر کے بارے میں کچھ بتایا اور نہ ہی یہ بتایا کہ اس نے حیدر علی کو کیوں قتل کیا تھا۔ اس کے پاس اس سوال کا صرف ایک ہی جواب تھا۔ ''میں اس سے نفرت کرتا تھا۔''

''تم جانتے ہو کہ پولیس والوں کو زبان کھلوانے کے دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔'' غلام نبی نے کافی سمجھانے کے بعد ناکامی کی صورت میں اس کے ساتھ قدرے جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ ''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ مار پیٹ کی جائے؟''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' فرید نے اس کی طرف دیکھے بغیر خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میں نے قتل کیا ہے۔ آپ لوگ مجھے پھانسی دے دیجئے، میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

''پھانسی تو تم کو ہوگی اور ضرور ہوگی۔'' ڈی ایس پی غلام نبی نے کہا۔ ''لیکن اگر تم یہ سچ سچ بتا دو کہ تم نے اس شخص کو قتل کیوں کیا، تو ہوسکتا ہے کہ قانون اصل وجہ جاننے کے بعد تمہارے ساتھ کچھ رعایت برتے۔''

''ہاں۔'' اشرف علی نے کہا۔ ''تمہارے ساتھ رعایت ہوسکتی ہے۔ صاحب کی بات کو دھیان سے سنو اور یہ بتاؤ کہ تم نے اس آدمی کو کیوں قتل کیا.....''

''کیونکہ میں اس سے نفرت کرتا تھا۔'' فرید نے کہا اور اس کے بعد اس نے خاموشی اختیار کرلی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔

ڈی ایس پی غلام نبی نے اس کو واپس حوالات میں بھجوا دیا۔

''کیا اس سے ملاقات کے لیے کوئی شخص تھانے آیا؟'' غلام نبی نے ان دونوں سے پوچھا۔ ''کسی نے اس کی خیر خبر لی؟''

''جی نہیں سر۔'' جواد حسین نے جواب دیا۔ ''اس سے ملنے یا اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے کے لیے کوئی نہیں آیا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہاں اس کا کوئی نہیں ہے۔'' غلام نبی نے کہا۔

''محلے والے بھی یہی کہتے ہیں کہ انہوں نے کبھی کسی کو بھی اس کے گھر آتے جاتے نہیں دیکھا۔'' جواد حسین نے کہا۔

''اچھا تو اب ایک بات سن لو۔'' غلام نبی نے کہا۔ ''اس کا کوئی امکان نہیں نظر آتا کہ یہ کوئی کرائے کا قاتل ہو، اور اس نے کسی سے پیسے لے کر حیدر علی کو قتل کیا ہو۔ کوئی آدمی کرائے کا قتل اس لیے کرتا ہے کہ اس کے بدلے میں اسے بھاری رقم ملے گی۔ وہ قتل اس لیے نہیں کرتا کہ اس کے بدلے میں اسے پھانسی کا پھندا ملے۔ پھر بھی..... تم لوگ اپنے طور پر اس کی اچھی طرح تفتیش کرلو۔ سب سے پہلے تو اس بات کا پتہ لگاؤ کہ مقتول حیدر علی کس قسم کا آدمی تھا۔ اس کے کیسے لوگوں سے مراسم تھے۔ کیا وہ کسی گینگ کا آدمی تو نہیں تھا کہ اسے بدمعاشوں کی باہمی دشمنی میں نشانہ بنایا گیا ہو۔ بالکل خاموشی کے ساتھ مقتول کے بارے میں ساری تفتیش کرلو۔ اس کے گھر والوں کو یا اس کے دوستوں وغیرہ کو اس کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلنے پائے اور دریں اثناء اس بات پر بھی نظر رکھو کہ آیا کوئی اس سے ملنے کے لیے تھانے آتا ہے یا نہیں، اور میں اشرف علی تم کو اس کیس کا تفتیشی افسر مقرر کرتا ہوں۔ سارا کام تمہاری نگرانی میں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' اشرف علی نے کہا۔

''میں جواد حسین کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ ہم دونوں مل کر اس کیس پر کام کریں گے۔ جواد حسین کو اس کے بارے میں پوری معلومات حاصل ہیں۔''

''بس پھر کام شروع کردو۔'' اس نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس ابتدائی تفتیش کا خاموش اور خفیہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ حیدر علی کے بارے میں جو بھی معلومات حاصل ہوئیں، ان کے مطابق وہ کورنگی کے ایک کوارٹر میں رہنے والا معمولی قسم کا، غریب طبقے کا آدمی تھا۔ نہ تو اس کا کوئی پولیس ریکارڈ تھا اور نہ ہی محلے میں کبھی کسی کو اس سے کوئی شکایت پیدا ہوئی تھی۔ وہ تو بہت ہی خلیق اور ملنسار آدمی تھا۔ وہ کورنگی میں ہی چمڑے کی چیزیں بنانے والے ایک چھوٹے سے کارخانے میں کام کرتا تھا اور اس کارخانے میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس نے اس کے خلاف کوئی بات بتائی ہو۔ وہ ایک ہر دلعزیز، سیدھا سادا سا انسان تھا۔ اس کی بیوی زرینہ بھی ایک غریب خاندان کی عورت تھی اور وہ لوگ بھی مشکوک کردار کے حامل نہیں تھے۔

اس امر کی اچھی طرح تفتیش کر لی گئی اور اس کی رپورٹ ڈی ایس پی غلام نبی کو پہنچا دی گئی۔ مقتول حیدر علی نہ تو کوئی جرائم پیشہ آدمی تھا اور نہ ہی اس کا کسی جرائم پیشہ گروہ سے کوئی تعلق تھا۔

''چنانچہ اب ہم اس امکان کو رد کرتے ہیں کہ مقتول کوئی جرائم پیشہ شخص تھا جسے جرائم پیشہ لوگوں کے کسی جھگڑے میں قتل کیا گیا ہو۔'' ڈی ایس پی غلام نبی نے کہا۔ ''تاہم، اس امر کا امکان اب بھی موجود ہے، اس کو کسی کرائے کے قاتل کے ذریعے ہی قتل کروایا گیا ہو، اور اس کے قتل سے کوئی خاص فائدہ حاصل کیا جانا مقصود ہو۔ تو اب اس امر کی تفصیلی تفتیش کرو کہ حیدر علی کے قتل سے کن کن لوگوں کو کس کس قسم کے فائدے حاصل ہو سکتے تھے۔ اس شخص کے بارے میں معلوم کرو جس کو حیدر علی کے قتل سے سب سے زیادہ فائدہ پہنچنے کا امکان ہو۔''

اس تازہ تفتیش کے نتیجے میں جو باتیں سامنے آئیں ان کے مطابق کورنگی کا وہ کوارٹر جس میں حیدر علی اپنی بیوی اور اکلوتی بیٹی کے ساتھ مقیم تھا، اس کا واحد اثاثہ تھا، لیکن یہ اثاثہ صرف اس کا نہیں تھا بلکہ اس میں اس کا بڑا بھائی اکبر علی بھی شریک تھا۔ یہ کوارٹر ان دونوں بھائیوں کے والدین کا تھا اور وہ دونوں اس کے وارث تھے۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی کا بڑا بھائی اکبر علی حیدر آباد میں رہتا تھا۔ اس کے مالی حالات بہت اچھے تھے۔ وہ وہاں چوڑیوں کے ایک کارخانے کا مالک تھا، لیکن اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے کراچی میں کورنگی کا یہ کوارٹر اپنے چھوٹے بھائی کو دے دیا تھا اور وہ اس میں اپنے حق سے دستبردار ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی نے بھی اس کے اس فیصلے سے اتفاق کیا تھا۔

چنانچہ اس چھوٹے سے کوارٹر کے علاوہ مرحوم حیدر علی کا کوئی اور اثاثہ نہیں تھا۔ وہ

محنت مزدوری کرنے والا ایک عام محنت کش انسان تھا اور اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کی خاطر اس کو قتل کر دیا جاتا اور اس چیز پر قبضہ جمانے کی کوشش کی جاتی۔ کوئی بھی ایسا شخص موجود نہیں تھا جس کو حیدر علی کے قتل سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا۔

''قتل کی ان وارداتوں کو چھوڑ کر، جو کسی قسم کے وقتی اشتعال کا نتیجہ ہوں، کوئی بھی قتل ایسا نہیں ہوتا جس کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک کارفرما نہ ہوتا ہو۔'' ڈی ایس غلام نبی نے کہا۔

''اسی لئے تفتیش کے دوران سب سے پہلے وجہ قتل کو تلاش کرنے پر توجہ دی جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ موجودہ کیس میں قتل بالکل واضح اور ثابت ہے اور ملزم کو بآسانی سزا ہو جائے گی، لیکن ہمارا کام صرف ملزم کو سزا دلانے تک محدود نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی جاننا چاہئے کہ اس شخص نے قتل کیوں کیا، یہ ایک بظاہر ناقابل فہم انسانی رویے کا معاملہ ہے، لیکن ہمیں اس کو سمجھے بغیر ملزم کو پھانسی کے حوالے نہیں کر دینا چاہئے۔ کسی انسان کے مخصوص حالات کو سمجھنا اور اس کی مدد کرنے کی کوشش کرنا، سزا دلوانے سے زیادہ اہم، مشکل اور پیچیدہ کام ہے اور عام طور پر سے ہم پولیس کے لوگ اس کام کے بارے میں سوچتے ہی نہیں ہیں۔ ہم گواہوں، شہادتوں اور ثبوتوں کی بنا پر ملزم کو سزا دلوا دینے کو ہی اپنے کام کی معراج سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ ہے، وہ یہ کہ حقیقی اسباب تلاش کرنا اور الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔'' جواد حسین نے فوری اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اور ایس آئی صاحب بھی یہی بات کر رہے تھے کہ یہ کیس بالکل سیدھا سادہ ہے اور ملزم کو آسانی سے سزا ہو جائے گی، لیکن، میں اس قتل کی وجہ ضرور معلوم کرنی چاہئے۔''

''بالکل ٹھیک۔'' ڈی ایس پی غلام نبی نے کہا۔ ''دیکھو، ہم لوگ دو اہم امکانات کا جائزہ لے چکے ہیں اور اس ٹھوس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ملزم نے یہ قتل نہ تو کسی پیشہ ورانہ بدمعاشی کے طور پر کیا ہے اور نہ ہی اس نے کرائے کے قاتل کے طور پر، کسی اور کا آلہ کار بن کر یہ قتل کیا ہے۔ یہ بات واضح ہو چکی ہے اور یہ تو شروع سے ہی واضح ہے کہ ملزم اور مقتول کی بظاہر نہ کوئی دشمنی تھی اور نہ ان کے درمیان کبھی کوئی چھوٹا یا بڑا جھگڑا ہوا تھا۔ تو اب ہم ایک تیسرے امکان کا جائزہ لیں گے۔''

''وہ کیا سر؟'' اشرف علی نے بے تابی کے ساتھ پوچھا۔

''جواد حسین، تم نے تو مقتول کی بیوی کو دیکھا ہو گا؟'' غلام نبی نے جواب دینے کے بجائے جواد حسین سے ایک عجیب و غریب قسم کا سوال کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جی ہاں سر۔'' جواد حسین نے فوراً جواب دیا۔ ''صرف دیکھا ہی نہیں ہے، اس سے گفتگو بھی کی ہے اپنے سامنے بٹھا کر..... میں نے تو اس کا پورا بیان لیا ہے۔''

''وہ دیکھنے میں کیسی ہے؟'' غلام نبی نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے..... مقتول غلام حیدر ایک جوان آدمی تھا تو اس کی بیوی بھی جوان ہی ہونی چاہئے۔''

''جی ہاں سر۔'' جواد حسین نے فوراً جواب دیا۔ اب لمحے میں ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ''وہ جوان بھی ہے اور خاصی اچھی شکل کی بھی ہے۔ میں آپ کا مطب سمجھ رہا ہوں سر۔''

''ہم اس بات کے امکان کو رد نہیں کر سکتے۔'' غلام نبی نے کہا۔ ''اس چکر میں بھی کتنے ہی قتل ہوا کرتے ہیں اور ایک حقیقت یہ ہے کہ شہری علاقوں میں اس قسم کے قتل، خواہ وہ مردوں کے ہوں یا عورتوں کے۔ بیشتر ین بہت غریب اور کم آمدنی والے خاندان ہی ہوتے ہیں۔ خوشحال، متوسط طبقے کے لوگوں اور امیر طبقوں میں اس قسم کے قتل کی وارداتوں کا اوسط بہت کم ہے۔''

''اس کی وجہ سر.....؟''

''اس کی ایک نہیں کئی وجوہات ہیں۔'' غلام نبی نے ایس آئی اشرف علی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''سب سے پہلی وجہ تو تعلیم کی کمی ہے جس کے باعث لوگوں کے دلوں میں کشادگی اور وسعت پیدا نہیں ہوتی اور دوسری وجہ غربت کے باعث تشکیل پانے والا فرسٹریشن، ڈپریشن اور خشونت پر مبنی وہ رویہ ہے جو ایک قسم کے احساسِ محرومی کی علامت ہوتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جہالت اور غربت جب آپس میں مل جائیں تو وہ عام طور سے سنگ دلی، تنگ نظری اور بے حسی کو جنم دیتی ہیں۔ خیر یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ اب ہم کو اگلے مرحلے میں یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا ملزم فرید کا مقتول کی بیوی سے کوئی تعلق تھا یا اسے مقتول کی بیوی سے کوئی دلچسپی تھی۔ اس بات کا بہت ہوشیاری کے ساتھ پتہ لگانا ہوگا۔''

''لیکن یہ کام مشکل ہے سر۔'' اشرف علی نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''ہم کسی عورت سے.....''

''نہیں نہیں، بالکل نہیں۔'' غلام نبی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی مرد اس سلسلے میں مقتول کی بیوی زرینہ سے کوئی بات کرے گا اور نہ کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہم اس کام کے لیے کسی عورت کو استعمال کریں گے..... اور وہ بھی براہِ راست نہیں۔''

''براہِ راست نہیں؟'' جواد حسین نے وضاحت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر..... کس طرح؟''

اس کے جواب میں غلام نبی ان دونوں کو بتانے لگا کہ اب کیا کرنا ہے۔

''ہاں سر۔'' جواد حسین نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی یہ تجویز بہت عمدہ ہے۔ اس طرح یقیناً ہم لوگ کچھ زیادہ کامیابی حاصل کر لیں گے۔''

''یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ ہم لوگ سوچ رہے ہیں اس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہو۔'' غلام نبی نے کہا۔ ''ہم محض ایک امکان کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس امکان کے غلط ثابت ہو جانے کے بعد کچھ دوسرے راستے اختیار کرنے پڑیں گے۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' اشرف علی نے کہا۔ ''پھر اس پر کام شروع کر دیتے ہیں۔ اس امکان کو بھی دیکھ لیں تو پھر آگے کی دیکھیں گے۔''

''اقبالی مجرم پر تشدد بے معنی ہے۔'' غلام نبی نے کہا۔ ''وہ تو خود ہی مرنے کے لیے تیار ہے۔ اسے آپ اور کتنا ماریں گے؟ اس سے حاصل کچھ نہیں ہو سکتا۔''

☆======☆======☆

دن کے تقریباً دس بجے ہوں گے۔ فرقان اپنے کام پر گیا ہوا تھا۔ بچے اسکول میں تھے اور زبیدہ اپنے گھر میں اکیلی تھی۔ وہ سبزی کاٹ کر ہانڈی چڑھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ بچے ڈیڑھ بجے تک اسکول سے واپس آ جاتے تھے اور انہیں آتے ہی کھانے کی طلب ہوتی تھی۔ زبیدہ کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ بچوں کے گھر آنے سے پہلے پہلے کھانا پوری طرح سے تیار ہو جائے۔ ویسے اتفاقی طور پر دیر ہو جانے کی صورت میں وہ کھانے پینے کی دوسری چیزیں بھی تیار رکھتی تھی تاکہ بچوں کو انتظار نہ کرنا پڑے۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

کون ہو سکتا تھا؟ شاید کوئی پڑوسن کسی کام کے لیے یا کوئی چیز مانگنے کے لیے.....

زبیدہ باورچی خانے سے نکل کر دروازے کے پاس گئی۔ اس نے جب دروازہ کھولا تو اپنے سامنے دو عورتوں کو کھڑا پایا۔ دونوں عورتیں خوش لباس تھیں اور وضع قطع سے تعلیم یافتہ معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک تو ادھیڑ عمر کی عورت تھی اور دوسری نوجوان تھی لیکن دونوں ہی عورتیں زبیدہ کے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ اس نے اس سے پہلے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''جی..... فرمائیے؟'' زبیدہ نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ ''کس سے ملنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے؟''

''آپ زبیدہ ہیں نا؟ فرقان کی بیوی؟'' عمر رسیدہ عورت نے نرم اور خوشگوار لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' زبیدہ نے قدرے تعجب کے ساتھ کہا۔ ''میں زبیدہ ہوں، فرقان کی بیوی..... لیکن آپ لوگ کون ہیں؟''

''ہمیں آپ ہی سے ملنا ہے۔'' ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔

زبیدہ کچھ پریشان سی ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں بالکل اکیلی تھی اور یہ دونوں نامعلوم عورتیں اس کے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ آج کل بھلا کس پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا؟

''لیکن..... میں تو آپ کو نہیں جانتی۔'' زبیدہ نے ذرا سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''آپ کہاں سے آئی ہیں اور مجھ سے کیا کام ہے؟ کس نے بھیجا ہے آپ کو؟''

جواب میں عمر رسیدہ عورت نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے ایک کارڈ نکالا اور زبیدہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس کارڈ پر اس عورت کی تصویر چسپاں تھی لیکن تصویر میں وہ عورت سادہ کپڑوں میں ملبوس نہیں تھی۔ اس کے جسم پر لیڈی پولیس کی وردی تھی۔

''میرا نام خالدہ مکرم ہے اور میں پولیس میں سب انسپکٹر ہوں۔'' معمر عورت نے کہا۔ اس کے لہجے میں یکبارگی قدرے تحکمانہ انداز پیدا ہو گیا تھا۔ ''مجھے آپ سے ضروری بات کرنا ہے۔''

''اندر آ جائیے۔'' زبیدہ نے کہا۔ پولیس والوں یا پولیس والیوں کا اس کے گھر آنا زبیدہ کے لیے اگرچہ کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی، تاہم اس کے دل پر ایک خوف طاری ہو گیا۔ اس کم بخت کرائے دار نے اس کے خاندان کی پُرسکون زندگی میں ایک قیامت برپا کر دی تھی۔ اس کی اور اس کے شوہر کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ فرقان کو کئی بار تھانے بلوایا جا چکا تھا، جہاں اسے گھنٹوں بیٹھا رہنا پڑتا۔ فرید خود تو جرم کر کے تھانے میں بند ہو گیا تھا اور ان لوگوں کو جن کا اس جرم سے کوئی تعلق نہیں تھا، ایک عذاب میں مبتلا کر گیا تھا..... اور اب یہ ایک نئی مصیبت..... اب پولیس والیاں گھر میں آ رہی تھیں۔

دونوں عورتیں اندر آ گئیں اور زبیدہ نے انہیں کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ کمرے میں ایک چھوٹا سا صوفہ موجود تھا۔ اس کے ساتھ دو سادہ کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

سب انسپکٹر لیس خالدہ مکرم نے اس دوسری نوجوان عورت کا تعارف کروانے کی

ضرورت نہیں محسوس کی جو اس کے ساتھ موجود تھی۔ صرف اتنا کہا۔ ''یہ میرے ساتھ ہیں۔ ان کا نام ماریہ ہے۔''

ماریہ نے آہستہ سے گردن ہلا دی اور زبیدہ نے اس کی طرف محتاط نظروں سے دیکھا۔

''میں..... آپ لوگوں کے لیے چائے کا پانی رکھ دوں..... بس ایک منٹ.....'' اور وہ کمرے سے باہر جانے لگی۔

''نہیں۔'' خالدہ مکرم نے اس کو سختی کے ساتھ منع کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' خالدہ اب ''آپ'' سے ''تم'' پر آ گئی تھی۔

''جی..... جی..... کہیے۔'' زبیدہ سہم کر رک گئی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''یہ بات تو تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارے کرائے دار فرید کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔'' خالدہ مکرم نے تیز نظروں سے زبیدہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اس نے اپنے پڑوسی حیدر علی کا خون کر دیا، یہ بات درست ہے کہ تمہارے میاں فرقان کا بظاہر اس قتل کی واردات سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس کا کرایہ دار تھا۔'' خالدہ کی نظروں کی چبھن میں اور اس کے لہجے میں تیکھے پن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ''اس نے ایک ایسے شخص کو کمرہ کرائے پر کیوں دیا جو مشکوک کردار کا تھا؟''

''نہیں نہیں انسپکٹر صاحبہ۔'' زبیدہ گھبرا کر بولی۔ ''انہوں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ آدمی..... وہ..... فرید..... وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ وہ تو کسی سے بولتا بھی نہیں تھا۔ اس کے کردار میں.....''

''سنو بی بی۔'' خالدہ مکرم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''معاملے کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارے کرائے دار نے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ اس وجہ سے تمہارے میاں کے لیے بھی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ وہ تو شکر کرو کہ پولیس نے ابھی تک تمہارے میاں کو پکڑ کر اندر نہیں کر دیا۔ ابھی تک صرف تفتیش چل رہی ہے۔''

''مگر..... میرے میاں نے کیا کیا ہے؟'' خوف، رنج اور پریشانی کے عالم میں زبیدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میرے میاں کا اس میں کیا قصور ہے، انسپکٹر صاحبہ؟ وہ تو فرید کو ٹھیک سے نہیں جانتا تھا۔ وہ شمشاد بھائی کو لانڈھی میں.....''

''وہ سارا قصہ مجھے معلوم ہے۔'' خالدہ مکرم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا تمہارے میاں نے اس کو کمرہ کرائے پر دینے سے پہلے یہ معلوم کرلیا تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے، کب کراچی آیا، کس خاندان کا ہے، اس کے خاندان کے باقی لوگ کہاں ہیں وغیرہ وغیرہ؟''

''اس نے یہ تو بتایا تھا کہ وہ پنجاب کا رہنے والا ہے۔'' زبیدہ نے کمزور آواز میں کہا۔ ''لیکن اس سے زیادہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''کیا تمہارے میاں نے اس جگہ سے اس کے بارے میں کوئی انکوائری کی تھی جہاں وہ پہلے رہتا تھا؟''

خالدہ مکرم ڈی ایس پی غلام نبی کی ہدایات پر پوری طرح عمل کر رہی تھی اور اس کے پڑھائے ہوئے سبق کو حرف بہ حرف دہرا کر زبیدہ کو زیادہ سے زیادہ پریشان اور خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو کچھ معلوم کرنا تھا، اس کے لیے زبیدہ کو ڈرانا دھمکانا بہت ضروری تھا۔

''وہ..... ڈرگ کالونی میں کہیں رہتا تھا۔'' زبیدہ نے کمزور آواز میں کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے میاں نے فرید سے نہ تو اس بارے میں کوئی تفصیلات پوچھی تھیں اور نہ ہی کبھی ڈرگ کالونی جا کر اس کے بتائے ہوئے پتے پر اس کے بارے میں کوئی تفتیش کی تھی۔

''ڈرگ کالونی.....'' خالدہ مکرم نے منہ بنا کر کہا۔ ''ڈرگ کالونی میں کہاں؟ ارے بھئی، ڈرگ کالونی تو خود ایک بڑا سا شہر ہے۔ کیا کسی شخص کے بارے میں جاننے کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ڈرگ کالونی میں رہتا ہے؟''

زبیدہ کو پسینے آ رہے تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اور اس کے میاں نے فرید کو اپنے گھر میں رکھ کر کوئی جرم کیا تھا جس کے باعث فرید کے خوفناک جرم میں ان کو شامل سمجھا جا رہا تھا۔

''دیکھو زبیدہ..... تمہارا شوہر اس وقت مشکل میں ہے۔'' خالدہ مکرم نے اس کو گہری نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اس کیس کے باعث اسے بہت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ قتل کا معاملہ ہے۔ ایک آدمی کی جان گئی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بہت سنگین مسئلہ ہے۔ تمہیں اپنے شوہر کو بچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تمہیں اس کی مدد کرنی چاہئے۔''

''میں..... میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں انسپکٹر صاحبہ۔'' زبیدہ نے تیزی سے کہا۔ ''خدا کے لیے..... مجھے بتایئے..... میں ان کی مدد کس طرح کر سکتی ہوں۔ دیکھئے، ہم بہت معمولی حیثیت کے لوگ ہیں۔ غریب ہیں، بس کسی طرح سے زندگی کی گاڑی کھینچ

رہے ہیں۔ ہم کوئی لمبی چوڑی رقم.....''

''افوہ.....'' خالدہ نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم میرا مطلب بالکل غلط سمجھ رہی ہو۔ تم سے کوئی رشوت نہیں مانگ رہا ہے۔ ایسا خیال بھی اپنے دل میں مت لانا۔''

''تو پھر؟'' زبیدہ چونک کر بولی۔ ''پھر انسپکٹر صاحبہ؟ پھر میں کیا کر سکتی ہوں؟''

''یہ بتاؤ کہ فرید نے حیدر علی کو کیوں مارا؟' خالدہ مکرم نے اپنی تیز اور چبھتی ہوئی نظریں زبیدہ کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ''دونوں کے درمیان جھگڑے کی وجہ کیا تھی؟''

''جھگڑا؟ جھگڑا کیسا انسپکٹر صاحبہ؟'' زبیدہ نے کہا۔ ''ان کے درمیان تو کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ بلکہ فرید کا تو محلے میں بھی کبھی کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔''

''چلو مان لیا۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''تو پھر اس نے حیدر علی کو کیوں قتل کیا؟ اور پورے محلے میں سے اس نے حیدر علی کو ہی کیوں قتل کیا؟ اگر اس کی کسی سے بھی دشمنی نہیں تھی تو اس نے خاص طور پر حیدر علی کو ہی کیوں نشانہ بنایا؟''

''اس بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا انسپکٹر صاحبہ۔'' زبیدہ نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ''پولیس والے میرے میاں سے، محلے کے دوسرے لوگوں سے اور خود حیدر علی کی بیوہ زرینہ سے، کتنی بار یہ سوال کر چکے ہیں، لیکن اس سوال کا جواب تو کسی کے پاس ہے ہی نہیں۔ صرف فرید ہی اس کا جواب دے سکتا ہے۔''

''دیکھو زبیدہ۔'' خالدہ مکرم کی آواز مدھم ہو گئی۔ ''تم عورت ہو اور عورتیں ایسی باتوں کو مردوں کے مقابلے میں بہت جلدی سمجھ لیتی ہیں۔ مرد کی نظر دھوکا کھا جاتی ہے۔ مگر عورت کی نظر دھوکا نہیں کھاتی۔ میں تم سے رازداری کے ساتھ ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں اور اگر تم اپنے میاں کو مشکلات سے بچانا چاہتی ہو تو اس کا ذکر کسی اور سے ہرگز نہ کرنا اور صرف اپنے تئیں میرے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرنا۔ کیا مقتول کی بیوی زرینہ اور فرید کے درمیان کسی قسم کے تعلقات تھے؟ کیا فرید نے حیدر علی کو اس لئے قتل کر دیا کہ وہ اس کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا؟''

''نہیں نہیں انسپکٹر صاحبہ۔'' زبیدہ ایک دم گھبرا کر بولی۔ ''ایسی ویسی تو کوئی بات نہیں تھی۔ فرید تو زرینہ کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ محلے کی کسی بھی عورت سے اس کی سلام دعا نہیں تھی۔ وہ تو مردوں سے بھی نہیں ملتا تھا۔ عورتوں سے بھلا کیا ملتا؟ اور جہاں تک زرینہ کا تعلق ہے تو.....''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''دیکھو...... دیکھو۔'' خالدہ مکرم نے ہاتھ اٹھا کر اس کو مزید بولنے سے روکتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام مت لو...... ہم خدانخواستہ کسی پر الزام نہیں لگا رہے ہیں، نہ کسی کے کردار پر شک کر رہے ہیں لیکن جب معاملہ ایک بے گناہ آدمی کے قتل کا ہوتا ہے تو پھر ہر طرح کے امکانات کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ کسی بھی چیز کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اب تم کو اس سلسلے میں اصل حقیقت کا پتہ لگانا ہے۔''

''مگر...... میں...... کیسے......؟'' زبیدہ بری طرح الجھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کر سکتی تھی اور ''اصل حقیقت'' کا پتہ لگانے کے لیے اس کو کیا کرنا چاہئے تھا، جبکہ اس کے خیال اور یقین کے مطابق ''اصل حقیقت'' یہی تھی کہ ایسی کوئی بات سرے سے موجود نہیں تھی۔

''میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''اس کے لیے تمہیں بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے کام لینا ہوگا، لیکن تمہیں حقیقت معلوم کرنا ہے تاکہ تمہارے میاں کی جان چھوٹے۔'' اور اس کے بعد وہ زبیدہ کو سمجھانے لگی کہ اس کو کیا کرنا ہے۔ زبیدہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی بات سن رہی تھی۔

''اور یہ ایک آخری بات......'' خالدہ نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد زبیدہ سے کہا۔ ''پولیس کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر تم نے جھوٹ سے کام لیا اور پولیس کو گمراہ کرنے کی کوشش کی تو تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا اور تم سے زیادہ خرابی کا سامنا تمہارے میاں کو کرنا پڑے گا۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔''

''نہیں نہیں، آپ اطمینان رکھیں انسپکٹر صاحبہ۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''میں آپ سے کوئی غلط بات نہیں کہوں گی۔ صرف وہی کہوں گی جو سچ ہے۔''

''میں تمہارے گھر وردی میں بھی آ سکتی تھی۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''لیکن میں صرف اس وجہ سے سادہ کپڑوں میں آئی کہ مجھے وردی میں دیکھ کر سارے محلے میں شور مچ جاتا کہ فرقان کے گھر لیڈی پولیس آئی ہے۔ اس سے تمہاری مشکلات میں اضافہ ہوتا۔ اب کسی کو نہیں معلوم کہ تمہارے پاس لیڈی پولیس آئی تھی اور کوئی کام تمہارے سپرد کیا گیا ہے۔ ہم نے تمہاری عزت کا خیال رکھا ہے۔ اب تم بھی اپنی عزت کا خیال رکھو۔''

''میں ایسا ہی کروں گی جیسا کہ آپ کہہ رہی ہیں۔'' زبیدہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''سوائے اپنے میاں کے، اور کسی سے اس بات کا ذکر مت کرنا۔'' خالدہ مکرم نے

اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ہفتے دس دن کے بعد تمہارے پاس دوبارہ آؤں گی۔ شاید اس وقت تک تم کچھ کام کر چکی ہوگی۔''

دونوں عورتیں وہاں سے چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد زبیدہ جلدی جلدی اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ کھانا پکانے کا کام ادھورا پڑا رہ گیا تھا۔ ان دونوں عورتوں نے آ کر اس کا دماغ خراب کر دیا تھا اور اب اس کا ذہن اس قدر منتشر ہو رہا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ چھوڑے ہوئے، ادھورے کام کا از سر نو آغاز کہاں سے کرے۔ سب کچھ گڈمڈ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس تازہ پریشانی نے اس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ خدا نہ کرے کہ فرقان کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔ اس کا اور بچوں کا وہ ایک واحد سہارا تھا۔ اگر خدانخواستہ اس کو کچھ ہوگیا تو...... اس خیال سے ہی اس پر لرزہ طاری ہونے لگا۔ خدا! اس کے میاں کی جان کی خیر رکھے۔

غلام نبی کے منصوبے کے تحت، فرقان کی بیوی زبیدہ کو ایک کام سے لگا دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی فرید کے بارے میں چھان بین کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کر دیا گیا۔

☆======☆======☆

لانڈھی میں کپڑوں پر مشینوں سے کڑھائی کا کام کرنے والے اس کارخانے کے مالک کا نام مراد علی تھا۔ فرید اس کے کارخانے میں کپڑوں پر کڑھائی کا کام کرتا تھا۔

جب فرید نے حیدر علی کو قتل کر ڈالا، تو اس کے فوری بعد فرید کے سلسلے میں کی جانے والی تفتیش کے دوران جواد حسین نے اپنے ایک ماتحت کو لانڈھی کے اس کارخانے میں بھی بھیجا تھا تاکہ وہ وہاں سے فرید کے کوائف حاصل کرے، لیکن کارخانے کے مالک مراد علی کو اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ پہلے کہیں ڈرگ کالونی میں رہتا تھا اور پھر اس نے کورنگی میں کوئی کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔

''میں اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔'' مراد علی نے پولیس والوں کو بتایا تھا۔ ''البتہ ایک بات میں ضرور جانتا ہوں...... اور وہ یہ کہ وہ نہ صرف ایک بہت اچھا کاریگر تھا، بلکہ بہت ذمہ دار بھی تھا۔ اس کے کام میں رتی برابر خرابی نہیں ہوتی تھی اور اگر ہوتی بھی تو وہ بغیر کہے، خود ہی اسے درست کر لیا کرتا تھا۔ میں اس کے کام سے بہت مطمئن تھا۔ خدا معلوم، اسے بیٹھے بٹھائے کیا ہوا کہ اس نے ایک آدمی کو مار ڈالا۔''

پولیس والے سرسری پوچھ گچھ کے بعد واپس چلے آئے تھے۔ کارخانے سے اس کے بارے [illegible] معلوم ہو سکتی تھی، سوائے اس کے کہ وہ بہت ہی کم گو اور کم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آمیز انسان تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ، اپنی دنیا میں گم رہتا تھا اور اپنے بارے میں کبھی بھی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ چونکہ وہ کسی سے بھی اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا تھا، اس لیے دوسرے کاریگر بھی اس کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے اور اس کے معاملات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

اس روز جب اے ایس آئی جواد حسین لانڈھی میں مراد علی کے کارخانے میں پہنچا اور اس نے مراد علی کو بتایا کہ وہ فرید کے کیس کی تفتیش کے سلسلے میں اس کے پاس آیا ہے، تو مراد علی کو تعجب ہوا۔

''پہلے بھی پولیس کے لوگ آئے تھے اور ہم فرید کے بارے میں جو کچھ جانتے تھے، وہ ہم نے ان کو بتا دیا تھا۔'' مراد علی نے اے ایس آئی سے کہا۔ ''اب.....''

''وہ میں جانتا ہوں۔'' جواد حسین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اس سلسلے میں مزید تفتیش کرنی ہے۔''

مزید تفتیش کا آغاز مراد علی سے ہوا اور پھر دوسرے تمام کاریگروں سے فرداً فرداً بہت تفصیلی بات چیت کی گئی۔

معلوم ہوا کہ فرید پچھلے دو سال سے اس کارخانے میں کام کر رہا تھا۔ اس عرصے کے دوران کبھی ایک بار بھی کوئی شخص اس سے ملنے کے لیے کارخانے نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں یہ بتایا تھا کہ اس کا تعلق پنجاب سے ہے لیکن اس عرصے میں وہ کبھی ایک بار بھی چھٹی لے کر پنجاب نہیں گیا تھا۔ اس کارخانے میں کام کرنے سے پہلے وہ ڈرگ کالونی کے کسی کارخانے میں کام کرتا تھا، لیکن وہ کارخانہ بند ہو گیا اور اسے دوسری ملازمت یہاں لانڈھی کے اس کارخانے میں ملی۔ اس کے پاس شناختی کارڈ نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے بنوایا ہی نہیں۔

جواد حسین اب ان خطوط پر تفتیش کر رہا تھا جو ڈی ایس پی غلام نبی نے متعین کیے تھے اور جن کے مطابق سب سے زیادہ ضروری بات یہ تھی کہ اس شخص کے گھر اور خاندان کا پتہ لگایا جائے۔

کارخانے میں نوکری کرنے کے لیے رجسٹر میں اندراج کی غرض سے اس نے اپنے والد کا نام حمید لکھوایا تھا۔ فرید الحسن ولد حمید الحسن..... لیکن پتہ کراچی کی ڈرگ کالونی کا لکھوایا تھا۔

جواد حسین نے سب سے زیادہ تفصیلی گفتگو امتیاز علی نامی کاریگر سے کی، جو فرید کے

برابر ہی کام کرتا تھا۔ جواد حسین نے اس سے کہا کہ وہ اپنے دماغ پر اچھی طرح زور دے کر بتائے کہ کیا کبھی فرید نے اپنے خاندان یا گھر کے بارے میں اس سے کوئی بات کہی تھی۔

جواد حسین کے اصرار پر امتیاز علی کافی دیر تک سوچتا رہا اور اپنے دماغ پر زور دیتا رہا۔

''صاحب، وہ چریا تو اپنے بارے میں کبھی کوئی بات ہی نہیں کرتا، لیکن مجھے ایسا یاد پڑتا ہے کہ ایک بار اس نے کہا تھا کہ اس کا گھر چکوال میں بسوں کے اڈے کے قریب کہیں تھا۔ ہاں..... صاحب..... مجھے یاد آ رہا ہے..... اس نے یہی کہا تھا۔''

''چکوال میں بسوں کے اڈے کے قریب۔'' جواد حسین نے اپنے اندرونی ہیجان پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کیا اس نے اپنے خاندان وغیرہ کے بارے میں کچھ اور بھی بتایا؟''

''جی نہیں.....'' امتیاز علی نے کہا۔ ''مجھے ایسا کچھ یاد نہیں پڑتا۔''

''اچھا..... کیا اس کی کسی بات سے تم کو اندازہ ہوا کہ اس کو اپنے شہر چکوال سے نکلے ہوئے کتنا زمانہ گزر گیا؟'' جواد حسین نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' امتیاز علی نے کہا، ایک دو بار میں نے اس سے پوچھا تھا لیکن اس کا تو جواب ہی بہت عجیب تھا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے یاد نہیں، اس کی ہر چیز ہی بہت عجیب تھی صاحب۔''

''تمہیں اس کی باتوں سے کبھی اس بات کا اندازہ ہو سکا کہ وہ کراچی میں کتنے عرصے سے ہے یا اس سے پہلے وہ کہاں تھا؟'' جواد حسین نے پوچھا۔

امتیاز علی کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ''بہت سوچتا ہوں سر، تو بس ایک بات سمجھ میں آتی ہے، اور وہ یہ کہ وہ بہت لمبے عرصے سے اپنے گھر سے دور تھا۔ یہ اس نے تو نہیں بتایا سر..... یہ میرا اندازہ ہے۔ میں اس کے بارے میں ایسا محسوس کرتا ہوں۔''

''کبھی اس نے تم کو کسی عورت میں اپنی دلچسپی کے بارے میں کچھ بتایا؟'' جواد حسین نے پوچھا۔ ''تم کو یا اور کسی کاریگر کو؟ کسی عورت سے اس کا کوئی معاملہ وملہ تھا؟''

''نہیں سر۔'' امتیاز علی نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اگر چاہتا تو شادی بھی کر سکتا تھا۔ اچھے خاصے پیسے کماتا تھا۔ آخر ہم لوگ بھی اتنا ہی کماتے ہیں اور بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' جواد حسین نے کہا۔ ''تم اس کے برابر میں بیٹھ کر کام کرتے تھے اور تمہارا اس کا دن بھر کا ساتھ رہتا تھا۔ تم سے اس نے اور بھی باتیں کی ہوں گی۔ اپنے دماغ پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زور دیتے رہنا اور اگر کوئی ایسی بات یاد آجائے، جو تمہیں ابھی یاد نہ آرہی ہو تو مجھے فون کرنا۔ میں تمہیں اپنا نمبر دے رہا ہوں۔ میں تمہیں تھانے نہیں بلواؤں گا، بلکہ خود تمہارے پاس آؤں گا۔''

''نہیں سر، میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔'' امتیاز علی نے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا سر کہ فرید نے ایسا کیوں کیا۔ وہ تو ایسا آدمی تھا کہ شاید اس نے کبھی لال بیگ کو بھی نہ مارا ہو۔ پھر اس نے ایک آدمی کو کیسے مار دیا۔''

''یہی تو اصل سوال ہے امتیاز، جس کا جواب ہم تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' جواد حسین نے کہا۔ ''اور اس کے لیے تم جیسے لوگوں کی مدد چاہئے جو اس کے زیادہ قریب تھے۔''

''لیکن وہ خود کسی کے قریب نہیں تھا سر.....'' امتیاز علی نے کہا۔ ''ہم سب لوگوں نے اس کے قریب ہونے کی کوشش کی تھی مگر وہ دور ہی ہوتا گیا۔''

''ٹھیک ہے امتیاز علی۔'' جواد حسین نے کہا۔ ''اگر کوئی بات یاد آجائے، یا کسی اور ذریعے سے کوئی نئی بات معلوم ہو جائے تو ضرور بتانا۔''

☆======☆======☆

زبیدہ کو اگرچہ اس بات کا پورا یقین تھا کہ مقتول حیدر علی کی بیوی زرینہ اور قاتل فرید کے درمیان دور دور تک کسی قسم کے مراسم نہیں تھے، تاہم پولیس والوں کی طرف سے اس سلسلے میں شک ظاہر کرنے کی وجہ سے اس کے اپنے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں کچھ شبہات جنم لینے لگے تھے اور اب وہ خود اپنے شبہات کو بھی دور کرنے کی غرض سے اس کام کو انجام دینا چاہتی تھی، جو پولیس سب انسپکٹر لیس خالدہ مکرم کی جانب سے اس کو سونپا گیا تھا۔ ان دونوں عورتوں کے جانے کے بعد وہ بڑی دیر تک اس ساری صورت حال پر غور کرتی رہی۔ یہ ایک ایسی بات تھی جو اس کے دماغ کے کسی گوشے میں کبھی نہیں آئی تھی اور نہ آسکتی تھی، کیونکہ اس کی سرے سے کوئی بنیاد موجود نہیں تھی۔

''میں اب تک تو صرف اپنے ذہن سے سوچتی رہی ہوں۔'' اس نے دل میں سوچا۔ ''لیکن دوسرے لوگوں کے پاس بھی اپنا ذہن موجود ہے، اور وہ اس سے سوچتے ہیں اور ان کی سوچ کا انداز مختلف بھی ہو سکتا ہے۔''

اس رات کو جب فرقان اپنے کام پر سے واپس آیا تو زبیدہ نے اس کو پولیس والیوں کی آمد اور ان کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ فرقان یہ سب کچھ

سن کر سناٹے میں آ گیا۔

''نہیں..... یہ ناممکن ہے!'' اس نے پُرزور انداز میں کہا۔ ''ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ بھلا کسی سے کیا پیار کرے گا..... آدم بیزار.....''

''خیال تو میرا بھی یہی ہے۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''لیکن اس معاملے کو اس کے انجام تک تو پہنچانا ہی ہوگا۔ پولیس والی جو کام میرے سپرد کر گئی ہے، اسے تو پورا کرنا ہی ہوگا، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اوپر کوئی بات آجائے۔ ارے ہم نہ لینے میں نہ دینے میں..... خواہ مخواہ ہماری مٹی پلید ہو رہی ہے اس چکر میں.....'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''مجھے کچھ نہیں ہوگا، تم اطمینان رکھو۔'' فرقان نے اپنی پریشان حال بیوی کو ایسے لب و لہجے میں تسلی دینے کی کوشش کی، جس میں اطمینان کا کوئی عنصر بھی شامل نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوفزدہ تھا۔ یہ پولیس کا معاملہ تھا اور پولیس والے تو کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ وہ راہ چلتے لوگوں کو لوٹ سکتے ہیں، وہ گھروں، دکانوں اور بینکوں میں ڈاکے ڈال سکتے ہیں، وہ کاریں اور موٹر سائیکلیں چھین سکتے ہیں اور وہ کسی بھی شخص کو جعلی مقابلے میں گولی مار سکتے ہیں، یا حوالات میں بند کر کے مار مار کے ہلاک کر سکتے ہیں اور پھر خودکشی یا دل کے دورے سے مرنے کا کیس بنا سکتے ہیں۔ پولیس والے تو پولیس والے ہیں، وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ان سے بڑی طاقت بھلا کس کی ہے؟

''ہم نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔'' فرقان آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ''مگر اب جیسا ان پولیس والیوں نے تم سے کہا ہے، ویسا ہی کرو..... میرا یا تمہارا اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ اچھا ہے ان لوگوں کا شک دور ہو جائے گا۔ اس شریف عورت کی جان بھی چھوٹ جائے گی..... پھر کبھی کوئی اس قسم کی بات نہیں سوچے گا اس کے بارے میں.....''

''ہاں۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''مجھے یہ کام تو بہرحال کرنا ہوگا۔ میں تم کو کسی مصیبت میں گھرا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی۔''

اس رات وہ دونوں پریشان حال میاں بیوی سونے سے پہلے بہت دیر تک اس معاملے کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔

زبیدہ کو زرینہ کے معمولات کا اچھی طرح سے علم تھا۔ زرینہ عدت میں تھی اور گھر سے باہر کہیں نہیں آتی جاتی تھی۔ وہ کسی غیر مرد سے ملاقات یا کلام بھی نہیں کرتی تھی۔ عدت کی پوری مدت کے لیے وہ اس چھوٹے سے کوارٹر میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ زبیدہ کو زرینہ کے پاس ایسے وقت میں جانا تھا۔ جب زرینہ کے پاس محلے کی اور کوئی ... ہو۔ زرینہ اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوارٹر میں اپنی چھوٹی سی بیٹی طاہرہ کے ساتھ رہتی تھی۔ ان دونوں کے علاوہ گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ حیدر علی کے قتل کے فوراً بعد جو چند رشتے دار آ کر کچھ دنوں کے لیے مہمان رہے تھے، وہ سب جا چکے تھے اور دونوں ماں بیٹیاں اکیلی تھیں۔

زبیدہ اگلے دن صبح دس بجے کے قریب زرینہ کے گھر پہنچی۔ یہ وہ وقت تھا جب محلے کی تقریباً ساری ہی عورتیں گھروں میں کھانا پکانے اور گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف ہوتی تھیں۔ دوپہر میں بچے اسکولوں سے آ جاتے تھے اور ان کو کھانا چاہئے ہوتا تھا۔ خود زبیدہ بھی اس وقت گھر سے شاذ و نادر ہی نکلتی تھی، کیونکہ اس کے لیے بھی یہ وقت مصروفیت کا ہوتا تھا۔

دروازہ زرینہ نے کھولا اور وہ زبیدہ کو اس وقت دیکھ کر قدرے متعجب بھی ہوئی۔

''آؤ.....'' اس نے ایک طرف ہٹ کر زبیدہ کو راستہ دیتے ہوئے کہا۔ ''میں ذرا باورچی خانے میں تھی۔''

''یہ وقت ہی باورچی خانے میں کام کا ہے۔'' زبیدہ نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈ کو چھوا جو خالدہ مکرم نے اس کو خاص مقصد کے لیے دیا تھا اور جس سے کام لینے کے بارے میں اس نے اس کو ساری ضروری ہدایات دے دی تھیں اور سب کچھ اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ زبیدہ نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس ٹیپ ریکارڈر کے بٹن کو آن کر دیا تھا۔

''اس بدنصیب نے اب تک یہ نہیں بتایا ہے کہ اس نے حیدر بھائی کو کیوں قتل کیا۔'' زبیدہ نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نپے تلے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ''وہ ابھی تک خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے۔ پولیس نے افضل کے ابا کو پھر پوچھ گچھ کے لیے تھانے بلایا تھا۔ ان بے چارے کی تو جان مصیبت میں آ گئی ہے۔ بتاؤ، بھلا وہ اور کیا بتا سکتے ہیں؟ انہیں کیا معلوم؟ اگر کچھ معلوم ہے تو اس کو معلوم ہے جس نے قتل کیا ہے اور وہ اپنی زبان پر تالا لگائے ہوئے ہے۔''

''تو یہ کم بخت پولیس والے فرقان بھائی کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟'' زرینہ نے سخت بیزاری کے ساتھ کہا۔ ''اس منحوس نے اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے جرم کیا ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟ اب اور کیا ثبوت چاہئے انہیں؟ عدالت میں پیش کریں اور پھانسی پر لٹکوا دیں اس کو.....''

''مگر پولیس والے تو کسی اور ہی چکر میں ہیں۔'' زبیدہ نے آہستہ سے کہا۔

''اور کیا چکر ہے ان کا؟'' زرینہ نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

''پولیس والے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا تم واقعی یہ چاہتی ہو کہ فرید کو پھانسی ہو جائے؟''

''کیا مطلب؟'' زرینہ نے چونک کر کہا۔ ''ارے..... میں نہیں چاہوں گی تو اور کون چاہے گا؟ ارے میرے تو روئیں روئیں سے اس کے لیے بددعا نکلتی ہے۔ خدا کرے اسے ڈھائی گھڑی کی موت آئے۔ ہیضہ بٹورے اس کو..... بدن سے کوڑھ پھوٹ پھوٹ کر نکلے۔ پھانسی سے کم کی سزا تو ہونی ہی نہیں چاہئے۔''

''سنو زرینہ۔'' زبیدہ نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''پولیس والوں نے افضل کے ابا کو تھانے بلوایا تھا، اور ان کے ذریعے تم سے ایک خاص بات کہلوائی ہے۔ وہ تمہیں تھانے اس لیے نہیں بلوانا چاہتے کیونکہ تم عدت میں ہو اور وہ خود بھی تمہارے پاس آ کر بات نہیں کرنا چاہتے۔ انہوں نے افضل کے ابا کو بلایا اور ان سے کہا کہ وہ میرے ذریعے تم سے یہ بات معلوم کریں کہ کیا تم واقعی یہ چاہتی ہو کہ فرید کو پھانسی ہو جائے۔''

''ارے میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ کیا بات ہوئی۔ ارے میں کیوں نہیں چاہوں گی کہ اس منحوس کو پھانسی کی سزا ہو؟ میں تو چاہتی ہوں کہ کل کی ہوتی آج ہو جائے اور ابھی ہو جائے اسے..... خدا کرے اس کم بخت کو تو مرتے وقت کلمہ بھی نہ نصیب ہو۔''

''مجھے تم سے یہ بات کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔'' زبیدہ نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں کیا کروں، پولیس والے افضل کے ابا کی جان کے پیچھے لگ گئے ہیں اور وہ انہیں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ میرے ذریعے تم تک یہ بات پہنچائیں۔ دراصل..... پولیس والوں کا خیال ہے کہ فرید نے حیدر بھائی کا خون تمہاری وجہ سے کیا ہے۔''

''میری وجہ سے؟'' زرینہ کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ ''میری وجہ سے؟ ارے وہ کیوں بھلا؟''

''اوہو..... تم تو بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہی ہو۔ کم بخت مارے یہ سمجھ رہے ہیں کہ فرید تم کو چاہتا تھا اور اس نے تم کو حاصل کرنے کی غرض سے تمہارے شوہر کو قتل کر دیا اور یہ کہ اب اگر تم دونوں ایک دوسرے کو حاصل کرنا چاہو، تو پولیس تمہاری مدد کر سکتی ہے۔ مگر اس کے لیے پولیس کی تھوڑی بہت مٹھی گرم کرنا پڑے گی۔ پولیس جان بوجھ کر کیس کو کمزور کر دے گی اور فرید کو بس چند سال کی سزا ہو جائے گی جس کے بعد وہ آزاد ہو کر باہر آ جائے گا۔ پھر وہ تمہارے ساتھ.....''

زرینہ ایک دم سے پھٹ پڑی۔ اس میں اب مزید سننے کی تاب نہیں رہی تھی۔ غم و

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غصے کے عالم میں اس کی آنکھوں سے آنسو اور شعلے نکلنے لگے۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ ''ارے میں تو کہتی ہوں کہ کتے کی آئی ہو تو اس کو آجائے، سؤر کی آئی ہو تو اس کو آجائے۔ کیڑے پڑیں اس کی لاش میں۔ ہائے تو میں تو جیتے جی مرگئی اور لوگ کیسی کیسی باتیں بنا رہے ہیں۔''

''نہیں زرینہ۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''کوئی بھی ایسی باتیں نہیں بنا رہا ہے کیونکہ سب کو اس اصل حقیقت کا علم ہے کہ تمہارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ صرف پولیس والوں کے اپنے چکر ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ اگر ان کا خیال صحیح ہو تو وہ کمائی کا کوئی راستہ نکال لیں۔ پولیس والوں کے ہی ہاتھ میں تو سب کچھ ہوتا ہے۔ کیس تو وہی بناتے ہیں۔ اگر چاہیں تو کیس کو کمزور کر دیں اور اگر چاہیں تو جھوٹے کیس کو بھی اتنا طاقتور بنا دیں کہ آدمی کے گلے میں پھندا ہی فٹ ہو جائے۔''

''ارے ان منحوسوں سے کہلوا دینا زبیدہ..... ان سے کہلوا دینا کہ سب کچھ بکواس ہے۔ ارے میری طرف سے وہ اس حرام کے جنے کو ستر دفعہ پھانسی دے دیں۔ ارے میں کہتی ہوں کہ ان منحوس پولیس والوں کے دماغ میں یہ بات آئی کہاں سے کہ میں اپنے میاں کے قاتل کو بچانے کی کوشش کروں گی۔''

''بات صاف ہے زرینہ۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''پولیس والے کمائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ انہوں نے اپنے طور پر یہ اندازہ لگایا کہ شاید اس قسم کی کوئی بات ہو اور تم یہ چاہو کہ فرید کی جان بچ جائے اور اسے کم سے کم سزا ہو تو اس کا بندوبست پولیس کر سکتی ہے۔ رشوت کی رقم لے کر..... یہی پیغام دے کر انہوں نے افضل کے ابا سے کہا کہ میرے ذریعے تم سے بات کریں اور پھر پیسے وغیرہ طے کر دیں۔ پولیس والوں نے ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اس معاملے کو بالکل خفیہ رکھا جائے گا۔''

''اے لعنت ہو کم بختوں پر۔'' زرینہ کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم فرقان بھائی سے میری طرف سے کہہ دینا کہ وہ پولیس والوں سے کہہ دیں کہ میری طرف سے وہ اس موت پیٹے کو ابھی اور اسی وقت پھانسی لگا دیں اور خواہ مخواہ مجھے بدنام کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ایک تو میں غریب اپنے ہی غم میں مبتلا ہوں اور اوپر سے یہ لوگ ایسی بے ہودہ باتیں کہہ رہے ہیں۔'' وہ رونے لگی۔

''تم پریشان مت ہو زرینہ۔'' زبیدہ نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں تو محلے کے سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں اور سب تمہاری عزت کرتے ہیں۔ تم پر کوئی آنچ ہرگز نہیں آنے پائے گی۔ افضل کے ابا پولیس والوں کو سنا دیں گے۔ بس، پھر یہ قصہ وہیں کا

وہیں ختم ہو جائے گا۔ تمہارے پاس خود کوئی پولیس والا نہیں آئے گا۔''

زبیدہ مزید کچھ دیر زرینہ کے ساتھ رہی اور پولیس والوں کی اس پیشکش کے اسباب و محرکات اور اس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتی رہی۔ بات چیت کے شروع میں زرینہ کے لیے یہ سمجھنا بہت دشوار تھا کہ پولیس والے اس جیسی غریب عورت کو یہ پیشکش کیوں کر رہے ہیں، جس کے پاس پولیس کو رشوت میں دینے کے لیے کوئی بھاری رقم موجود نہیں ہے۔ زبیدہ کو تمام متوقع سوالات کے جوابات اچھی طرح سے سمجھا دیئے گئے تھے۔

''پولیس والے خوب جانتے ہیں کہ اپنے فائدے کے لیے غریب سے غریب آدمی بھی کسی نہ کسی طرح رقم کا بندوبست کرتا ہی ہے۔ قرض ادھار لیا جاتا ہے، زیور بیچے جاتے ہیں، مکان اور زمین بیچی جاتی ہے۔'' زبیدہ نے وضاحت کی۔

کافی دیر بعد جب زبیدہ وہاں سے اٹھی تو وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ پولیس والوں کی آمد کے بعد سے اس کے دل و دماغ پر جو بہت بھاری بوجھ ہو گیا تھا، وہ یک لخت ختم ہو گیا۔ سب سے زیادہ خوشی تو اسے اس بات کی تھی کہ پولیس والیوں کی گفتگو کے نتیجے میں خود اس کے اپنے دل میں زرینہ کی جانب سے جو شک کا ایک ہلکا سا شائبہ پیدا ہو گیا تھا، وہ ختم ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اسے اس بات کا بھی اطمینان ہو رہا تھا کہ اس نے پولیس کے حکم کی تعمیل کر دی تھی۔ اگر وہ ان لوگوں کی بات نہ مانتی تو وہ اس کے شوہر کے لیے پتہ نہیں کیسی کیسی مشکلات پیدا کر سکتے تھے۔

گھر واپس آنے کے بعد اس نے اس ٹیپ ریکارڈر کو اپنے کرتے کی جیب میں سے نکال کر بہت احتیاط کے ساتھ اپنے صندوق میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ خالدہ مکرم نے اس کو نہایت سختی کے ساتھ ہدایت کی تھی کہ یہ ٹیپ ہرگز کسی اور کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔

شام کو جب فرقان گھر واپس آیا، تو اس نے ساری روداد اس کو سنا دی۔

''شکر ہے کہ یہ کام ہو گیا اور اس کا نتیجہ بھی ہماری امید اور مرضی کے عین مطابق نکلا۔'' زبیدہ نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو اس ساری بات سے اس قدر ہول ہو رہا تھا کہ بس کچھ نہ پوچھو۔''

''پولیس والوں کی بھی اب پوری طرح سے تشفی ہو جائے گی۔'' فرقان نے کہا۔

☆======☆======☆

زبیدہ کا تیار کردہ ٹیپ، جو اس کی اور زرینہ کی گفتگو پر مشتمل تھا، پولیس کے حوالے کیا جا چکا تھا اور اس میں موجود گفتگو کو سن لیا گیا تھا۔ ڈی ایس پی غلام نبی نے ایس آئی خالدہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مکرم کو اس کی شاندار کامیابی پر مبارکباد دی۔

ملزم فرید ایک بار پھر پولیس افسران ایس آئی اشرف علی اور اے ایس آئی جواد حسین کے سامنے موجود تھا۔ کمرے میں ان تینوں کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ بھی بند کر لیا گیا تھا۔

''ہاں تو فرید...... کب سے چل رہا تھا تمہارا یہ معاشقہ؟'' اشرف علی نے پوچھا۔

فرید کے پتھر جیسے چہرے پر اچانک ایک رنگ دوڑ گیا، جس نے اس کے چہرے کو ایک زندہ چہرے کی شباہت دے دی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''معاشقہ؟ کیسا معاشقہ؟'' فرید نے خشک، کھوکھلی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تمہارا اور زرینہ کا معاشقہ۔'' اشرف علی نے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔

''زرینہ کون؟'' فرید کے ماتھے کی لکیریں اور زیادہ گہری ہو گئیں اور اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگی۔ ''میں تو کسی بھی زرینہ کو نہیں جانتا۔''

''اوہو...... تو اب تم زرینہ کو بھی جاننے سے انکار کر رہے ہو؟'' اشرف علی نے اس کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اسی کی خاطر ایک آدمی کو قتل کر دیا اور اب ہم سے کہہ رہے ہو کہ کون زرینہ...... خوب...... بہت خوب......''

''میں نے؟ زرینہ کی خاطر؟'' فرید بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ ''یہ کس قسم کی بات ہے؟ میں کسی زرینہ کو نہیں جانتا۔''

''زرینہ...... مقتول حیدر علی کی بیوی۔'' اشرف علی نے کہا۔ ''جس سے تم عشق کرتے تھے اور جس کی خاطر تم نے ایک بے گناہ انسان کو قتل کر دیا تاکہ اس کی موت کے بعد زرینہ تک پہنچنے کی راہ آسان ہو جائے۔''

''میں حیدر علی کی بیوی کو نہیں پہچانتا۔'' فرید نے سخت، خشک اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں نہ اس کے نام سے واقف ہوں نہ اس کی شکل سے...... یہ سب بکواس ہے۔ میں وہاں زبیدہ کے علاوہ اور کسی عورت کی شکل اور نام سے واقف نہیں ہوں۔''

''اگر تم نے زرینہ کی خاطر حیدر علی کو قتل نہیں کیا، تو پھر تم نے اس کو کیوں قتل کیا؟'' اشرف علی نے پوچھا۔

''کیونکہ میں اس سے نفرت کرتا تھا۔'' فرید نے وہی پرانا، بار بار کا دیا ہوا بیان دہرایا۔

''لیکن کیوں؟'' اشرف علی نے پوچھا۔ ''آخر ہر بات کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔ تمہاری اس شخص سے نفرت کی کیا وجہ تھی؟ اگر تم اس کی بیوی کو حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے تو

پھر تم نے اس کو کیوں قتل کیا؟''

''میں کہہ چکا ہوں...... بتا چکا ہوں......'' فرید نے آہستہ سے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''اور اس کے بعد میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

اور اس کے بعد واقعی اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ان لوگوں کے بار بار اور مسلسل اصرار کے باوجود اس کی زبان سے کچھ بھی نہیں نکلا۔ وہ راز جوں کا توں رہا۔

کچھ دیر کے بعد فرید کو دوبارہ حوالات میں بھیج دیا گیا۔

اب تک کی ساری کوششیں ناکام ہو گئی تھیں۔ ایک دور دراز کا خیال، جو پولیس والوں کے دل میں مقتول کی نوجوان بیوی کے حوالے سے پیدا ہوا تھا، اس کی بھی اچھی طرح سے چھان بین کر لی گئی تھی، کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ پولیس کے لیے وجہ قتل ابھی تک معمہ بنی ہوئی تھی۔

ملزم کے بارے میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی تھی کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ وہ کارخانے میں کام کرتا تھا اور ایک ہنرمند کاریگر تھا۔ وہ اپنا کام بہت عمدگی سے انجام دیتا تھا اور کارخانے کا مالک اس سے خوش تھا۔

ملزم میں پاگل پن کی کوئی علامت نہیں تھی۔ بجز اس کے کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ رہتا تھا اور اپنے بارے میں کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا اور نہ ہی اپنے بارے میں لوگوں کو کچھ بتاتا تھا۔

پھر ڈی ایس پی غلام نبی نے اس کا دماغی معائنہ کروانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں عدالت سے ضروری احکامات حاصل کر لیے۔ ملزم فرید کا سرکاری طور پر مکمل دماغی معائنہ کرایا گیا اور ماہرین نے اسے دماغی طور پر بالکل صحت مند قرار دیا۔ اس کے دماغ میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ البتہ اسے شدید طور پر ذہنی دباؤ کا شکار پایا گیا اور یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ لاکھوں لوگ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہوتے ہیں اور اسی حالت میں زندگی گزارتے ہیں۔

پولیس نے عدالت سے ملزم کا پندرہ دن کے لیے ریمانڈ لیا تھا۔ وہ مدت اب ختم ہو رہی تھی اور پولیس کو ملزم سے اب براہ راست کوئی پوچھ گچھ نہیں کرنی تھی، کیونکہ ملزم بالکل تعاون نہیں کر رہا تھا اور ملزم کے ساتھ تشدد کا راستہ اپنانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے کسی خاص فائدے کی امید بھی نہیں تھی۔ چنانچہ فرید کو پولیس کی حوالات سے نکال کر عدالتی حوالات میں، یعنی جیل بھیج دیا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس تمام عرصے کے دوران فرید سے ملنے کے لیے یا اس کے بارے میں کوئی معلومات حاصل کرنے کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کا کوئی ہے نہیں اور اگر کوئی ہے بھی تو اس کے ساتھ برسوں سے اس کا کوئی رابطہ نہیں ہے، نہ کسی کو اس کے حال کی کوئی خبر ہے اور نہ کوئی اس کے حالات سے دلچسپی رکھتا ہے۔ بس، ایک بے خبری اور مکمل لاتعلقی کا عالم تھا۔

☆======☆======☆

کمرے میں ڈی ایس پی غلام نبی کے ساتھ ایس آئی اشرف علی، ایس آئی خالدہ مکرم اور اے ایس آئی جواد حسین کے علاوہ ایک شخص اور بھی موجود تھا..... اور وہ تھی نوجوان عورت ماریہ، جو ایس آئی خالدہ مکرم کے ساتھ زبیدہ کے گھر گئی تھی۔

''ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہماری اب تک کی کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔'' ڈی ایس پی غلام نبی نے سلسلہ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ درست ہے کہ ہمیں قتل کی صحیح وجہ کا علم نہیں ہو سکا، لیکن جو کچھ تفتیش ہم نے کی، اس سے کچھ نہ کچھ اہم نتائج ضرور حاصل ہوئے ہیں۔ یعنی جتنے امکانات ہماری نظر میں تھے، ان کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے اور اب ہمیں ان کے بارے میں سوچنے کی اور وقت برباد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ہمیں دوسرے امکانات کے بارے میں غور کرنا ہوگا۔''

''لیکن وہ دوسرے امکانات کیا ہو سکتے ہیں سر؟'' خالدہ مکرم نے سوال کیا۔

''فی الحال ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' غلام نبی نے کہا۔ ''ہمیں ان کو خود ہی تلاش کرنا پڑے گا۔ فرید کے بارے میں ہم ڈاکٹروں کی رائے سے واقف ہو چکے ہیں۔ وہ ایک صحیح الدماغ آدمی ہے، پاگل نہیں ہے اور نہ ہی اس نے خود کو کبھی پاگل ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے، جس کی وجہ ہم نہیں جانتے..... اور ہمیں تلاش کرنی ہے۔''

''گویا ہم اس کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں سر کہ وہ پاگل تو نہیں ہے، لیکن ذہنی مریض ضرور ہے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''اور اس سے جو جرم سرزد ہوا ہے، وہ اس شدید اعصابی دباؤ والی کیفیت کے زیر اثر سرزد ہوا ہے؟''

''ہاں۔'' غلام نبی نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو..... اس لیے اب تم کو اس کیس میں بہت اہم کردار ادا کرنا ہے۔''

''مجھے سر؟'' ماریہ نے چونک کر کہا۔

''ہاں ماریہ۔'' غلام نبی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کیس کو اب پولیس والوں کی سختی اور درشتی کی ضرورت نہیں ہے، اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس میں اب ایک رحم دل، مہربان اور ہمدرد عورت کی مدد کی ضرورت ہے۔ جو کسی دکھے ہوئے دل کی گہرائیوں میں اتر سکے۔ اب تمہیں اپنے علم اور مہارت سے اور سب سے بڑھ کر اپنے عورت ہونے سے کام لینا ہے۔ اس شخص کے اندر، بہت اندر، کہیں جو ایک گم شدہ انسان چھپا ہوا ہے، اس کو تلاش کر کے باہر نکالنا ہے۔ یہی ہمارا اصل مقصد ہے۔ اس شخص کے بارے میں ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ پاگل نہیں ہے۔ اس کا دماغ بالکل ٹھیک ہے، لیکن پھر بھی اس نے ایک ایسی حرکت کی ہے جس کا کوئی جواز ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جواز موجود نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں جواز ضرور موجود ہوگا۔''

ان لوگوں کی یہ میٹنگ کافی دیر تک جاری رہی۔ غلام نبی نے ماریہ کو تفصیل سے سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

''ہم لوگ تمہیں صرف ایک وسیع گائیڈ لائن دے سکتے ہیں۔'' غلام نبی نے کہا۔ ''کرنا تو سب کچھ خود تم کو ہی ہے۔ عملی طور پر سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہوگا اور ہم سب تمہاری مدد کے لیے موجود ہیں۔ تم کو جس سے بھی اور جو بھی مدد چاہیے ہو، بتاؤ۔ خالدہ تمہاری مدد کے لیے خاص طور پر موجود رہیں گی۔ تم جب چاہو انہیں اپنے ساتھ بھی لے جا سکتی ہو۔''

''شکریہ سر۔'' ماریہ نے کہا۔ ''میں اب فوری طور پر اپنے کام کا آغاز کر دوں گی۔''

ماریہ کی شخصیت کے کئی پہلو تھے اور وہ آپس میں پوری طرح سے ہم آہنگ ہو کر ایک مستحکم وجود کی تشکیل کرتے تھے۔ ماریہ ایک بہت ذہین اور بلا صلاحیت نوجوان عورت تھی۔ اس نے نفسیات میں ایم اے کیا تھا، نیز قانون کی ڈگری بھی لی تھی اور وہ باقاعدہ پریکٹس کرتی تھی۔ اس کا شمار کامیاب نوجوان وکیلوں میں ہوتا تھا۔

ماریہ صرف کامیاب وکیل ہی نہیں تھی۔ اس کی سرگرمیوں کا اصل میدان فلاحی تھا۔ وہ بنیادی انسانی حقوق کی کئی تنظیموں، نیز متعدد فلاحی اداروں کے لیے رضا کارانہ طور پر کام کرتی تھی۔ وہ خاص طور سے ایسے مجرموں اور قیدیوں کے معاملات سے گہری دلچسپی رکھتی تھی جو کسی نہ کسی طرح کی ذہنی الجھن کا شکار ہوتے تھے اور وہ ان کے مسائل کو سمجھ کر اپنے مقدور بھر ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ نفسیات کا علم، قانون کی ڈگری اور خود اس کے اپنے ذاتی تجربات اس کی بہت مدد کرتے تھے۔

گزشتہ کئی سال سے وہ ڈی ایس پی غلام نبی کے ساتھ کئی کاموں میں شریک رہی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اس نے کئی الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے میں پولیس کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ وہ پولیس کے ظلم اور زیادتیوں کے خلاف بھی بے جگری اور دلیری کے ساتھ لڑتی تھی اور بوقتِ ضرورت پولیس کے ساتھ تعاون بھی کرتی تھی۔ ڈی ایس پی غلام نبی نے کئی مقدمات میں اسے وکیل سرکار بھی مقرر کروایا تھا، ایسا وکیل صفائی جسے سرکاری خرچے پر عدالت کی طرف سے ملزم کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔

اور اب اسے ایک بار پھر وکیل صفائی مقرر کیا گیا تھا۔ فرید کا کوئی وکیل نہیں تھا، نہ تو اس نے خود کسی وکیل کا بندوبست کیا تھا اور نہ ہی اس کے کسی جاننے والے نے ایسی کوئی پیش قدمی کی تھی۔ ملزم سے جب اس بارے میں پوچھ گیا تھا تو اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اس کا کوئی وکیل نہیں ہے۔ چنانچہ اس بات کی ضرورت تھی کہ ملزم کو سرکاری خرچ پر عدالت کی جانب سے کوئی وکیل فراہم کیا جائے۔ ڈی ایس پی غلام نبی نے اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد ماریہ کو اس کام کے لیے منتخب کیا تھا۔ ماریہ کا نام اس وقت سے اس کے ذہن میں تھا جب سے اس کیس کی ساری تفصیلات اس کے علم میں آئی تھیں اور اسے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ عجیب وغریب اور سرپھرا قاتل اپنے جرم کا برملا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ جرم کی وجہ بتانے سے انکار کر رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ اس کو پھانسی دے دی جائے۔

غلام نبی نے ماریہ سے ملاقات کر کے اسے اس کیس کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ اس مسئلے کو حل کرنے میں شاید ماریہ کی ضرورت پڑے، کیونکہ یہ محض ایک سیدھا سادا سا قانونی معاملہ نہیں تھا، بلکہ نفس انسانی کی بعض پیچیدہ گتھیوں کا معاملہ بھی تھا جسے صرف قانون کی مدد سے نہیں سلجھایا جا سکتا تھا۔

ماریہ اس کام کے لیے فوراً تیار ہو گئی تھی اور اس نے اس سارے معاملے میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا۔

اس روز غلام نبی نے سب انسپکٹر لیس خالدہ مکرم کو زبیدہ کے پاس بھیجا تو ماریہ کو بھی اس کے ساتھ کر دیا تاکہ ماریہ کو اس علاقے کو اچھی طرح سے دیکھنے اور زبیدہ سے ملاقات اور گفتگو کا موقع مل سکے، جس کے گھر میں قاتل کرائے پر رہ رہا تھا۔ وہ خالدہ کے ساتھ وہاں گئی تھی اور خاموشی کے ساتھ ساری صورت حال کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ زبیدہ نے زرینہ کے بارے میں جو کچھ کہا اور یقین کے جس درجے ساتھ کہا، اسے ماریہ نے توجہ سے سنا اور اپنے دل میں محفوظ کر لیا۔ یہ ساری چیزیں اس کے کام کے لیے خام مواد کی حیثیت رکھتی تھیں۔

ماریہ نے اس کیس کی تمام دستاویزات کا نہایت غور اور توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا۔ ان

میں تمام گواہوں کے بیانات اور ایف آئی آر وغیرہ شامل تھیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی موجود تھی۔ جس کے مطابق مقتول کی موت سر پر کسی کند شے سے بھاری ضرب لگنے کے باعث واقع ہوئی تھی۔

اور پھر..... ملزم کا وہ بہت ہی مختصر سا اقبالی بیان..... یہ بیان بالکل غیر متنازع تھا اور واقعاتی شہادتوں کے عین مطابق تھا۔

ماریہ اس کیس کے بارے میں تو سب کچھ جان چکی تھی اور اس کی ساری دستاویزات وغیرہ بھی دیکھ چکی تھی، لیکن اس نے ملزم کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا اور نہ اس سے گفتگو کی تھی۔

ماریہ نے اپنا ہوم ورک پورا کر لیا تھا۔ اس نے ڈی ایس پی غلام نبی کی متعین کردہ گائیڈ لائن کی روشنی میں اپنے لائحہ عمل کا ایک ڈھانچہ تیار کر لیا تھا اور اب وہ فرید سے بات کرنے کے لیے اپنے تمام ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح تھی۔

فرید سے ماریہ کی ملاقات جیل میں ہوئی۔ اے ایس آئی جواد حسین اس کے ساتھ تھا۔ وہی اس کو جیل لے کر گیا تھا۔ جیل کے حکام سے پہلے ہی بات ہو چکی تھی اور انہوں نے اس ملاقات کے لیے ایک علیحدہ جگہ فراہم کر دی تھی۔

ماریہ نے فرید کو غور سے دیکھا اور اس کے چہرے کو دیکھ کر اس کے ذہن میں کتنی ہی بھولی بھٹکی شکلوں کے ٹیڑھے میڑھے، آڑے ترچھے اور مسخ شدہ نقوش ابھرنے لگے۔ واقعی ..... ذہنی عذاب انسان کی شکل وصورت کو بھی عذاب ناک بنا دیتے ہیں۔ کیا ان سارے لوگوں کی شکلوں کے سانچے ایک ہی جیسے ہو جاتے ہیں جو شدید ذہنی عذاب اور اندرونی کرب کا شکار ہوتے ہیں؟ کیا اس باطنی کج روی کا اظہار خدوخال کی شکل میں ایک ہی طرح سے ہوتا ہے؟

فرید ایس آئی اشرف علی سے تو بخوبی واقف تھا، لیکن ماریہ کو اس نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ سفید شلوار قمیص اور اس کے اوپر کالے رنگ کے ایک چھوٹے سے کوٹ میں ملبوس یہ نوجوان عورت بڑی پُر وقار اور دلکش شخصیت کی حامل معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ایسی فطری ملائمت اور نرمی تھی جو کسی کو بھی اس سے ہم کلام ہونے میں خوشی عطا کر سکتی تھی۔

''فرید!'' ایس آئی اشرف علی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ان سے ملو..... یہ ماریہ بلگرامی صاحبہ ہیں۔ یہ خاص طور سے تم سے ملنے کے لیے جیل آئی ہیں۔''

''مجھ سے ملنے کے لیے؟'' فرید کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور وہ غور سے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عورت کو دیکھنے لگا۔

''ہاں!'' اشرف علی نے کہا۔ ''تم سے ملنے کے لیے..... یہ ایک بہت اچھی اور قابل وکیل ہیں۔ تمہارا تو کوئی وکیل ہے نہیں، اور نہ ہی تمہارا کوئی عزیز رشتے دار موجود ہے جو تمہارے لیے کسی وکیل کا بندوبست کرے۔ اس لئے عدالت نے سرکاری خرچے پر تمہارے لیے ایک وکیل کا بندوبست کیا ہے اور ماریہ بلگرامی صاحبہ کو تمہارا وکیل مقرر کیا ہے۔''

''ہاں فرید!'' ماریہ نے نرمی سے کہا۔ ''میں تمہاری وکیل ہوں۔ مجھے سرکار کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے۔ میں عدالت میں تمہارے کیس کی پیروی کروں گی۔''

''مگر مجھے کسی کی پیروی کی ضرورت نہیں ہے۔'' فرید نے خشک اور سرد لہجے میں کہا اور اس کے چہرے کے تنے ہوئے اعصاب میں کچھ اور بھی سختی اور درشتی نمودار ہوگئی۔

''بالکل وہی..... بالکل وہی انداز ہے۔'' ماریہ بڑے دکھ کے ساتھ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

''تمہیں ضرورت ہے فرید۔'' اشرف علی نے نرمی سے کہا۔ ''قتل کے ہر ملزم کو ایک وکیل کی ضرورت ہوتی ہے اور جو ملزم خود وکیل کا بندوبست نہ کر سکے تو اسے سرکار کی طرف سے وکیل فراہم کیا جاتا ہے۔ وہ وکیل ملزم ہی کی طرف سے کیس لڑتا ہے۔ یہ ملزم کا قانونی حق ہوتا ہے کہ اسے ایک وکیل سرکاری خرچے پر دیا جائے۔''

''مجھے کسی وکیل کی ضرورت نہیں ہے۔'' فرید نے اسی انداز میں کہا اور خاموش ہو گیا۔ اس نے ایک نظر ماریہ کے خوبصورت چہرے پر ڈالی اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر رہا ہو۔

''دیکھو فرید، تمہارے اوپر قتل کا الزام ہے۔'' ماریہ نے اسے نرمی سے سمجھانا شروع کیا۔ ''تمہارے خلاف شہادتیں بھی موجود ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اگر اس معاملے کو نہیں سنبھالا گیا تو تمہیں پھانسی بھی ہو سکتی ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لو کہ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں اور میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ ہم دونوں مل کر سوچیں گے کہ کون سا راستہ اختیار کیا جائے جس کے ذریعے تمہیں زیادہ سے زیادہ سہولت فراہم کی جا سکے۔ میں.....''

''مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔'' فرید نے ایک بار پھر اسی کھردرے لہجے میں جواب دیا اور خاموشی اختیار کر لی۔

''لیکن کیوں؟'' ماریہ نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ تمہیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ اگر تمہاری طرف سے کسی نے کیس کی پیروی نہیں کی تو تمہیں پھانسی کی سزا بھی ہو سکتی ہے؟''

فرید کے چہرے کے نقوش کی کرختگی اور بیزاری میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے ماریہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش بیٹھا رہا۔ وہ نہ تو ماریہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور نہ اشرف علی کی طرف..... وہ بے مقصد انداز میں خلا میں گھور رہا تھا۔

''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم نے اس شخص کو سر یا مار کر ہلاک کیا تو اس کی کوئی نہ کوئی ٹھوس وجہ تمہارے پاس ضرور موجود ہوگی۔'' ماریہ نے ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔ ''آدمی بغیر کسی وجہ کے تو کسی کے انگلی بھی نہیں لگاتا، کجا یہ کہ اس کو ہلاک کر دے۔ میں وہ وجہ جاننا چاہتی ہوں اور اسی وجہ کی بنیاد پر میں تمہارا کیس تیار کروں گی۔ میں تمہاری مدد صرف اسی صورت میں کر سکتی ہوں جب تم خود بھی اپنی مدد کرنا چاہو۔ تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔''

''مجھے کسی مدد یا کسی تعاون کی ضرورت نہیں ہے۔'' فرید نے ایک بار پھر وہی روایتی جواب دیا اور خاموش ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔'' ماریہ نے برا مانے بغیر ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم سب کچھ ابھی اور اسی وقت طے کر لیں۔ تم اچھی طرح سوچو..... غور کرو..... اپنے آپ کو سچ بولنے پر تیار کرو..... اور جو کچھ تم کہو گے، اس کی روشنی میں ہم آئندہ کے لیے کوئی راستہ تلاش کریں گے۔ میں اب جاتی ہوں، پھر آؤں گی۔''

اگرچہ پہلی ملاقات میں ماریہ کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اس شخص کو سمجھنے اور اس کے بارے میں اندازے لگانے کی کوششوں کا آغاز کر دیا تھا اور اب وہ اس پر مزید کام کرنا چاہتی تھی۔ کوئی بڑی ہی سخت قسم کی گرہ تھی جو اس شخص کے ذہن میں موجود تھی۔ ''بس ایک بار وہ گرہ میرے ہاتھ میں آ جائے، پھر تو میں اس کو کھول لوں گی۔'' ماریہ اعتماد کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ ''لیکن اصل بات تو یہی ہے کہ گرہ ہاتھ میں آئے۔''

دو دن کے بعد ماریہ ایک بار پھر فرید سے ملنے کے لیے جیل گئی۔ اس بار اسے اشرف علی کو ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ملزم سے اس کا تعارف ہو چکا تھا۔

وہ فرید کے لیے پھل اور کھانے پینے کی کچھ دوسری چیزیں بھی اپنے ساتھ لے گئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ وہ اس ملاقات کو ایک گہری دوستانہ ملاقات کا رنگ دے کر فرید کا اعتماد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس ٹوٹے پھوٹے اور مرنے کے لیے تیار انسان کو کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ شاید وہ اس کا سہارا بن سکے۔

فرید کو جب اس کے پاس لایا گیا تو فرید اس کو دیکھ کر حیران نہیں ہوا۔ تاہم اس نے کسی گرم جوشی کا بھی مظاہرہ نہیں کیا۔

''میں آج تم سے تمہارے کیس کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔'' ماریہ نے مسکراتے ہوئے خوشگوار اور دلآویز لہجے میں کہا۔ ''آج میں صرف تمہارے بارے میں باتیں کروں گی۔ تمہارے گھر کے بارے میں..... تمہارے شہر یا گاؤں کے بارے میں..... تمہارے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے بارے میں..... اور اگر تمہاری شادی ہوگئی ہے تو تمہاری بیوی بچوں کے بارے میں..... اور اگر شادی نہیں ہوتی ہے تو تمہاری ہونے والی بیوی کے بارے میں.....'' وہ آہستہ سے ہنسی۔ اس کی ہنسی ایسی مترنم تھی جیسے فضا میں اچانک سونے کی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔

فرید خاموشی سے اس کی صورت دیکھتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے دل و دماغ کے اندر کوئی بہت خوفناک طوفان امڈ رہا ہو، جسے روکنے کی وہ سخت کوشش کر رہا ہو۔

''اچھا تو پھر کہاں سے شروع کریں؟'' ماریہ نے کہا۔ ''لیکن ٹھہرو..... میرا خیال ہے کہ پہلے کچھ کھالیا جائے۔ تم سب سے پہلے کیا کھانا پسند کرو گے؟ سیب، کیلا یا سموسہ؟''

فرید نے خاموشی سے ایک کیلا لے لیا اور اسے چھیل کر کھانے لگا۔ ماریہ خاموش رہی۔ اس نے کھانے کے دوران کچھ نہیں کہا۔ کیلے کے بعد فرید نے ایک سموسہ کھایا اور اس کے بعد مزید کچھ کھانے سے انکار کر دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''تم یہ چیزیں اپنے پاس رکھ لو، بعد میں کھالینا۔ جیل میں تو یہ چیزیں نہیں ملیں گی۔ ویسے..... تمہارے علاقے میں کون سا پھل سب سے زیادہ پیدا ہوتا ہے؟''

''معلوم نہیں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''اچھا..... خیر..... چلو اب اپنے والدین کے بارے میں کچھ بتاؤ..... تمہارا باپ کیا کام کرتا تھا؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے روکھے پن سے جواب دیا۔

ماریہ کو یہ بات معلوم تھی کہ فرید پنجاب کے شہر چکوال کا رہنے والا ہے اور وہاں اس کا

گھر بسوں کے اڈے کے قریب تھا، لیکن اس نے جان بوجھ کر یہ بات فرید کے سامنے نہیں دہرائی، کیونکہ فرید نے خود تو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ تو لانڈھی میں کارخانے میں اس کے ساتھ کام کرنے والے ایک آدمی کے ذریعے معلوم ہوا تھا۔ ماریہ اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس کے بارے میں جانتی ہے۔

''لیکن تمہیں اپنے والد یاد تو ہوں گے۔'' ماریہ نے اسے مزید کریدا۔ ''اور اگر باپ یاد نہیں تو ماں تو ضرور یاد ہوں گی۔ مجھے اپنی ماں کے بارے میں کچھ بتاؤ فرید..... مائیں تو خدا کا نور ہوتی ہیں۔ ماں کی ممتا سے بڑی دنیا میں کوئی اور نعمت نہیں ہوتی۔''

''مجھے نہیں معلوم..... مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' اچانک فرید پر کچھ ہذیانی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا، جیسے اس کے سر میں درد ہونے لگا ہو۔

ماریہ اس روز تقریباً ایک گھنٹے تک فرید کے ساتھ رہی، لیکن وہ فرید کی زبان سے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں سن سکی۔ فرید نے اپنے ہر راز کو راز ہی رکھا۔

''ٹھیک ہے فرید۔'' ماریہ نے کہا۔ ''تم اگر اپنے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتے تو میں پھر تمہاری مدد کس طرح کر سکتی ہوں؟ اس صورت میں صرف پھانسی کا پھندا ہی تمہارا آخری انجام ہوگا۔''

وہ اپنے الفاظ کا اثر دیکھنے کے لیے وہاں رکی نہیں۔ وہ فرید کو ایک دوراہے پر لا کھڑا کر دینا چاہتی تھی۔ ''تم اگر خود ہی اپنے لیے موت کا انتخاب کرنا چاہتے ہو تو تمہیں اس سے کون روک سکتا ہے؟'' اور یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی آئی۔ اس کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا اور بہت ساری چیزیں آپس میں گڈمڈ ہوتی جا رہی تھیں۔

=======☆=======☆

ماریہ کو برسوں پہلے کا وہ دن یاد آ رہا تھا جب وہ ایسے ہی ایک قیدی سے جیل میں ملاقات کرنے آئی تھی اور تب اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس قیدی سے اس کی آخری ملاقات ہے۔ وہ ایک سزا یافتہ قیدی تھا اور ایک قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا تھا۔

قیدی جب ماریہ کے سامنے آیا تو ماریہ نے اس کو گزشتہ ملاقات کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی مضمحل پایا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا اور وہ شدید اعصابی دباؤ کا شکار نظر آ رہا تھا۔ اس وقت ماریہ فرید کے چہرے سے ناواقف تھی، مگر آج فرید کے چہرے کو دیکھ کر ماریہ کے ذہن میں یہ چہرہ ابھرا تھا اور اس نے ان دونوں چہروں کی بے رونقی، کرختگی، سختی اور تناؤ میں سب کچھ مشترک پایا تھا۔ فرید کے چہرے کو دیکھ کر اسے یہ چہرہ یاد آیا تھا۔ دونوں چہروں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے خدوخال کا خمیر جیسے مشترکہ دکھوں سے بنایا گیا تھا۔

''کیا تمہاری کچھ طبیعت خراب ہے؟'' ماریہ نے نرم وملائم لہجے میں اس قیدی سے پوچھا۔

''طبیعت؟'' قیدی نے قدرے غائب دماغی سے جواب دیا۔ ''نہیں..... نہیں تو ..... میں..... ٹھیک ہوں۔''

''کمزور نظر آرہے ہو۔'' ماریہ نے آہستہ سے کہا۔ اس کی آواز میں بہت گہرا دکھ گھلا ہوا لگتا تھا۔ قیدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔

''کوئی اور تکلیف تو نہیں ہے؟'' قدرے توقف کے بعد ماریہ نے قیدی سے پوچھا۔

''نہیں.....'' قیدی نے جواب دیا۔ ''کوئی تکلیف نہیں ہے، سب کچھ ٹھیک ہے۔''

دونوں کے درمیان کچھ دیر تک جو گفتگو ہوتی رہی، وہ بہت ہی رسمی قسم کی نیم مردہ اور ہر قسم کی گرم جوشی سے خالی تھی۔ دونوں زیادہ تر خاموش ہی رہے۔ ان کے درمیان ہونے والا جملوں کا تبادلہ محدود اور مختصر تھا اور اس دوران ان دونوں میں سے کسی کے چہرے پر بھی تبسم کی ایک ہلکی سی رمق بھی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ دونوں کے چہرے تناؤ کا شکار تھے۔ جوان کے اندرونی طور پر اعصابی دباؤ میں مبتلا ہونے کی غمازی کر رہے تھے۔

''میں تمہارے لئے کچھ چیزیں لائی ہوں۔'' ماریہ نے کچھ دیر کے بعد کہا۔ ''اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا، اگلی دفعہ لے آؤں گی۔''

''نہیں۔'' قیدی نے جواب دیا۔ ''مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور تمہیں یہاں بار بار نہیں آنا چاہئے۔ تم ویسے بھی بہت مصروف رہتی ہو۔ اتنے بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔ میری وجہ سے اپنا وقت.....''

''سب کام ہو ہی جاتے ہیں کسی نہ کسی طرح۔'' ماریہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اس کو کچھ کہنے کے لیے الفاظ کی تلاش کرنی پڑ رہی ہو، جیسے وہ زبردستی بول رہی ہو اور صرف اس لیے بول رہی ہو کہ اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ جب وہ قیدی سے ملاقات کے لیے آئی تھی تو پھر قیدی سے کچھ نہ کچھ بات کرنا بھی ضروری تھا۔ اس سارے منظر میں افسردگی، اضمحلال، شکستہ گفتگو اور ایک اجڑی اجڑی سی فضا کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

''اچھا چلتی ہوں۔'' ماریہ نے گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ اگرچہ ابھی سیاہی نے ملاقات کا وقت ختم ہو جانے کا اعلان نہیں کیا تھا اور وہ کچھ دیر مزید وہاں رک سکتی تھی، لیکن شاید یہاں مزید رکنے کی اسے کوئی خواہش نہیں تھی۔ ''پھر آؤں گی۔''

''جلدی آنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' قیدی نے کہا۔ ''میری وجہ سے زیادہ پریشانی مت مول لیا کرو۔ میں جس حال میں بھی ہوں، ٹھیک ہوں۔'' اور وہ وہاں سے چلی آئی۔ پھر جلدی ہی سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

راستے میں وہ ان دونوں چہروں اور ان سے وابستہ جانے اور اَن جانے المیوں کے درمیان مماثلت کے بارے میں سوچتی رہی۔ ایک چہرہ تو وہ تھا جو کب کا پیوند خاک ہو چکا تھا اور ایک چہرہ وہ تھا جو زندہ تھا، لیکن خاک کا پیوند بننے کے لیے تیار تھا۔ ماریہ اپنے خیالات میں گھری ہوئی اپنے دفتر جا پہنچی۔ جہاں اسے شام تک رک کر کافی کام کرنا تھا۔

پھر شام کو ڈی ایس پی غلام نبی کے ساتھ میٹنگ تھی جس میں اسے اپنی اب تک کی کارکردگی کے بارے میں تفصیلی رپورٹ پیش کر کے آئندہ کے بارے میں سوچنا تھا۔ ملزم کے ساتھ اب تک کی ساری ملاقاتوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ وہ کوئی مدد قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

وہ اپنے دفتر پہنچی، جہاں اس کے کلرک نے متعلقہ فائلیں پہلے ہی اس کی میز پر رکھ دی تھیں۔ اس نے سب سے اوپر رکھی ہوئی فائل کو اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی، لیکن وہ صرف ورق گردانی ہی کر سکی۔ الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبوں کی طرح رقص کر رہے تھے۔ اس نے پڑھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا دماغ اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ الفاظ تو پہلے ہی اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو رہے تھے اور اب دیکھتے ہی دیکھتے وہ فائل بھی اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئی اور وہ کمرہ جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی، اپنے تمام تر ساز و سامان کے ساتھ ہوا میں تحلیل ہو کر کہیں گم ہو گیا۔ اس کے چاروں طرف ایک ہلکی ہلکی دھند چھانے لگی۔ جو رفتہ رفتہ گہری ہوتی گئی اور اس کا اپنا وجود بھی اس دھند کا ایک حصہ بنتا گیا۔

پھر اس گہری دھند کے پیچھے سے کچھ بھولے بھٹکے، مٹے مٹے سے، اجڑے اجڑے سے مناظر سر اٹھانے لگے وہ ان مناظر کا حصہ بنتی گئی۔

☆======☆======☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک گھر تھا، بہت زیادہ بڑا تو نہیں تھا، لیکن پھر بھی اچھا خاصا تھا۔ اس میں تین کمرے تھے، ایک دالان تھا جو ان تینوں کمروں کے آگے واقع تھا۔ اس کے بعد ایک کچا صحن تھا جس کے ایک جانب شریفے کا ایک پیڑ لگا ہوا تھا جس میں موسم میں ڈھیروں شریفے آتے تھے۔ دالان سے ملا ہوا ایک اور کمرہ تھا جسے پورا کمرہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ دو اطراف سے کھلا ہوا تھا۔ یہ باورچی خانہ تھا۔ اس میں ایک جانب مٹی کے کئی چولہے بنے ہوئے تھے۔ ان کے پاس لکڑی کا ایک پٹرا رکھا رہتا تھا۔

ہر روز کی طرح اس روز بھی وہ اپنے بستر پر سے اٹھی۔ اس کا چھوٹا بھائی نذیر ابھی تک اُس پلنگ پر سو رہا تھا جس پر وہ خود بھی سوئی ہوئی تھی۔ منا سا بھیا اس کے ساتھ ہی سوتا تھا اور وہ اسے کلیجے سے لگا کر، اسے خوب پیار کر کے بہت خوش ہوتی تھی۔ نذیر اس سے تین سال چھوٹا تھا اور ابھی اس نے اسکول جانا شروع نہیں کیا تھا، جبکہ وہ خود اسکول جاتی تھی، اور اس لئے اسے صبح بہت جلدی اٹھنا پڑتا تھا۔ اسے کوئی جگاتا نہیں تھا۔ نہ کوئی اس کو تیار ہونے میں مدد دیتا تھا۔ وہ خود ہی وقت پر اٹھ جاتی تھی اور جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جاتی تھی۔ رات کو سوتے وقت اسے یہ بات ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ اسے صبح جلدی اٹھنا ہے، اسکول جانا ہے اور پڑھنا ہے...... اسے اسکول اچھا لگتا تھا۔ دوسرے بچوں کے ساتھ ملنا جلنا، ہنسنا، کھیلنا کودنا، اچھا لگتا تھا اور پڑھنا اچھا لگتا تھا۔ جب وہ کلاس میں ہوتی تھی اور ٹیچر پڑھا رہے ہوتے تھے تو اس کے ننھے سے دماغ میں طرح طرح کے عجیب و غریب خیالات ابھرتے تھے۔ اسے پڑھائی ایک ایسے پُراسرار خزانے کی طرح معلوم ہوتی تھی جس تک پہنچنا ایک بے حد خوشگوار عمل تھا۔ اس خزانے تک پہنچنے کی راہ میں کیسی کیسی حسین اور پُرکشش، لیکن سربستہ منزلوں سے گزرنا پڑتا تھا اور ہر منزل سے گزر جانے کے بعد اس کی سربستگی ختم ہو جاتی تھی اور ایک نئی سربستگی شروع ہو جاتی تھی۔

اس نے بستر سے اٹھ کر ایک نظر اپنے چھوٹے بھائی پر ڈالی جو ابھی تک بے خبر سو رہا

تھا اور پھر تیزی سے چلتی ہوئی صحن کے ایک کونے میں رکھی ہوئی پانی کی ٹنکی تک پہنچی۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ باورچی خانے میں پہنچی تو اس نے اماں کو حسب معمول پٹرے پر بیٹھا ہوا پایا۔ چولہا جل رہا تھا اور اماں توے پر روٹیاں ڈال رہی تھی۔

اسی وقت ابا بھی باورچی خانے میں داخل ہو گئے اور انہوں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم ہمیشہ مجھ سے پہلے ہی باورچی خانے میں آ جاتی ہو۔'' ابا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''کبھی کبھی دیر سے بھی آیا کرو...... کبھی مجھے بھی پہلے آ جانے دیا کرو۔''

وہ ہنس پڑی۔ ابا بھی اس کے ساتھ ہی ہنس پڑے، لیکن اماں نے ان لوگوں کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ چولہے کی گرمی سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس پر پسینے کی ہلکی ہلکی بوندیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ اماں کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح سختی اور برہمی کے ہی آثار نظر آ رہے تھے۔

''ابا، اگر دیر سے اٹھوں گی تو اسکول جانے کو دیر ہو جائے گی۔'' اس نے باپ کی ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے کہا۔ ''جو بچے اسکول دیر سے آئیں تو ان کو سزا ملتی ہے اور پھر سبق بھی چھوٹ جاتا ہے۔''

''بہت شوق ہے میری بچی کو پڑھنے کا۔'' ابا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''خوب پڑھو، میری بچی...... خوب پڑھو۔''

ابا باورچی خانے میں ہی ایک طرف فرش پر بیٹھ گئے اور وہ خود بھی ابا کے برابر ہی بیٹھ گئی۔ اماں نے رات کی رکھی ہوئی سبزی گرم کر دی تھی۔ انہوں نے دو الگ الگ پلیٹوں میں سبزی نکالی اور توے سے اتاری ہوئی ایک ایک روٹی اس کے ساتھ رکھ کر دونوں کو دے دی۔

ابا چند لمحوں تک متوقع نظروں سے اماں کی طرف دیکھتے رہے۔ انہوں نے کھانا شروع نہیں کیا تھا، جبکہ ماریہ جلدی جلدی کھانے لگی تھی۔ روٹی گرم تھی اور سبزی بھی گرم تھی۔ آسانی سے کھائی نہیں جا سکتی تھی۔

''گھی نہیں ہے روٹی پر لگانے کے لیے؟'' ابا نے اماں کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے سپاٹ انداز میں پوچھا۔

''گھی کہاں سے آ گیا؟'' اماں ایک دم چمک کر بولیں۔ ''ذرا سا پڑا ہوا ہے تو وہ ہانڈی پکانے کے لیے رکھا ہوا ہے۔ یہاں کون سے گھی کے کنستر رکھے ہوئے ہیں۔''

''تو...... بازار سے منگوالیا ہوتا۔'' ابا کی آواز میں ہلکے سے احتجاج کا عنصر شامل تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں ہاں، تم نے تو بڑے خزانے ڈھیر کر دیئے ہیں نا کما کما کر.....'' اماں ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئیں۔ ''تم نے تو بس زبان ہلا دی اور سمجھو کہ نعمتیں نازل ہونے لگیں آسمان سے۔ گھی کھانے کا شوق ہے تو زیادہ کما کر کیوں نہیں لاتے۔''

''ارے، تو کیا اپنی جان دے دوں؟'' ابا غصے میں چلائے۔ ''سارا سارا دن تو محنت کرتا ہوں اور کتنی محنت کروں.....''

''ارے تو ایک کمانے والا اور دو درجن بھر کھانے والے ہوں گے تو کیسے پورا ہوگا، تھوڑی سی محنت سے؟'' اماں نے فوراً دوسرا حملہ کیا۔ ''اگر ان لوگوں کو بھی پالنا ہے تو پھر زیادہ محنت کرو، زیادہ سے زیادہ کما کر لاؤ۔''

ابا اور اماں میں زوردار لڑائی چھڑ گئی۔ اماں ابا کو بری طرح سے لتاڑ رہی تھیں۔ ابا کا انداز شروع شروع میں تو مدافعانہ تھا، لیکن پھر وہ بھی غصے سے آگ بگولا ہو گئے تھے۔ انہوں نے روٹی اور سبزی کی پلیٹ کو اسی طرح چھوڑ دیا اور اماں کو برا بھلا کہتے ہوئے باورچی خانے سے اٹھ کر جانے لگے۔

''ایسی کم بخت عورت ہے کہ چین سے ایک نوالہ بھی نہیں کھانے دیتی۔'' ابا کہہ رہے تھے۔ ''صبح صبح ڈائنوں کی طرح کلیجہ چبانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔''

''ہاں ہاں، میں تو ہوں ڈائن۔'' اماں وحشیوں کی طرح چیخیں۔ ''نکال باہر کرو مجھے گھر سے..... گلا گھونٹ دو میرا..... لے آؤ دوسری..... انہی سے کہو، وہ تلاش کر دیں گی۔ ایک چھوڑ کر کئی تلاش کر دیں گی۔ میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔'' اور پھر وہ زور زور سے رونے لگیں۔

لیکن ابا اب کچھ نہیں سن رہے تھے۔ وہ باورچی خانے سے نکل کر جا چکے تھے اور اماں نے ان کو روکنے کی اور ناشتہ پورا کروانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ ماریہ نے دزدیدہ نظروں سے اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے ایسا لگا جیسے یہ کوئی گوشت پوست کا بنا ہوا چہرہ نہیں ہے، بلکہ پتھر کا بنا ہوا چہرہ ہے۔ جس کے سارے نقوش پتھریلے ہیں اور اچانک گرم ہو کر جلنے لگے ہیں۔ ان میں سے آنچ نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

ماریہ سہمی ہوئی خاموشی سے اپنی روٹی جلد ختم کرنے کی کوشش میں بڑے بڑے نوالے کھا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد روٹی ختم کر کے اس جگہ سے، اس گھر سے، باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ اسکول چلی جانا چاہتی تھی، جہاں ہر چیز گھر سے بالکل مختلف تھی۔

''تو کیا مر بھکوں کی طرح کھائے جا رہی ہے؟'' اچانک اماں آنکھیں نکال کر اس پر

گرجیں۔ ''چھوٹے چھوٹے نوالے نہیں کھا سکتی انسانوں کی طرح؟ جانوروں کی طرح منہ میں بھرے جا رہی ہے، بھرے جا رہی ہے۔''

ماریہ اور زیادہ سہم گئی۔ اس نے نوالوں کو تو ضرور چھوٹا کر دیا، لیکن ان کو نگلنے کی رفتار کو بڑھا دیا۔ وہ اب جلدی جلدی منہ چلا رہی تھی اور روٹی کو تیزی سے اپنے منہ سے پیٹ میں منتقل کر رہی تھی۔

روٹی ختم کرتے ہی وہ تیزی سے باورچی خانے سے نکل گئی اور اس کمرے میں جا کر جس میں وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتی تھی، جلدی جلدی اسکول جانے کی تیار کرنے لگی۔ نذیر ابھی تک سویا ہوا تھا اور اسے اٹھانے کی کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ ماریہ جلدی جلدی تیار ہو کر اسکول روانہ ہو گئی۔

ماریہ نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے گھر میں یہی مناظر دیکھے تھے۔ ساری فضا پُرسکون ہوتی تھی۔ کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی اور پھر اچانک کسی بالکل ہی چھوٹی سی اور غیر اہم بات پر اماں اور ابا میں جھگڑا شروع ہو جاتا تھا۔ اماں غصے میں آپے سے باہر ہو جاتی تھیں۔ ان کا چہرہ سرخ ہو کر ٹیڑھا میڑھا ہو جاتا تھا۔ آنکھوں سے جیسے شعلے نکلنے لگتے تھے اور وہ نہ جانے کیا کیا چیخنے چلانے لگتی تھیں۔ بات تو کوئی خاص نہیں ہوتی تھی، لیکن اماں کو اس وقت تک چین نہیں ملتا تھا جب تک وہ کسی چھوٹی سی بات کو لے کر ایک بڑا فساد نہ کھڑا کر دیں۔ پھر ابا کو بھی غصہ آ جاتا اور گھر میدانِ کارزار بن جاتا۔ وہ تو اچھا تھا کہ ابا کا بہت کم وقت گھر پر گزرتا تھا۔ وہ صبح کے گئے شام کو گھر آتے تھے۔ کبھی کبھی تو انہیں بہت دیر ہو جاتی تھی۔ گھر آ کر کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر بعد وہ محلے میں لوگوں سے ملنے کے لیے اِدھر اُدھر نکل جاتے۔ لڑائی کا وقت عام طور سے صبح صبح ناشتے کے ساتھ ہوتا تھا، یا رات میں۔ اماں، کسی بھی معاملے میں ابا کو ذرا سی بھی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھیں۔

ابا راج مستری تھے اور انہیں مستقل کام کی تلاش میں رہنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کام نہیں ملتا تھا یا بہت کم ملتا تھا۔ اس دن ابا کو خالی ہاتھ گھر آنا پڑتا یا پھر وہ تھوڑے سے پیسے لے کر آتے۔

''ارے اگر کام نہیں ملتا تو تم کوئی دوسرا کام کیوں نہیں کرتے؟'' ابا کے خالی ہاتھ آنے پر یا کم پیسے کما کر لانے پر اماں بری طرح چیختیں۔

''مجھے کوئی دوسرا کام کرنا نہیں آتا۔'' ابا جواب دیتے۔ ''میں راج مستری ہوں۔ جو کام جانتا ہوں وہی تو کر سکتا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تو پھر کوئی دوسرا کام بھی سیکھو۔'' اماں بدستور آگ بگولہ بنی رہتیں۔ ''اور اگر نہیں سیکھ سکتے، کما کر نہیں لا سکتے تو پھر دنیا بھر کی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لیے کیوں آمادہ ہو؟ کیوں ہمارے منہ کا نوالہ چھین کر دوسروں کو دے رہے ہو؟ اپنے بچوں کا تو پیٹ بھرا نہیں جاتا، دنیا بھر کے لوگوں کو جمع کر رکھا ہے۔''

''دنیا بھر کے لوگ'' ابا کی بڑی بہن یعنی ماریہ کی پھوپھی اور ان کے تین بچے تھے، کشور پھوپھی کے میاں موٹر مکینک تھے اور کسی گیراج میں کام کرتے تھے۔ ہوشیار اور ہنر مند کاریگر تھے۔ اچھے خاصے پیسے مل جاتے تھے۔ مکان ان کا اپنا آبائی تھا، اگرچہ چھوٹا سا تھا، لیکن گزارے کے لیے بہت کافی تھا۔

پھر ایک دن اچانک کشور پھوپھی کے میاں کا انتقال ہو گیا۔ وہ گیراج میں کام کر رہے تھے کہ کام کرتے کرتے اچانک ان کے سینے میں بڑے زور کا درد اٹھا۔ قریب ہی ایک ڈاکٹر کا مطب تھا، انہیں وہاں لے جایا گیا اور ڈاکٹر نے انہیں فوراً ہی ہسپتال لے جانے کا مشورہ دیا، لیکن وہ ہسپتال نہ پہنچ سکے۔ راستے میں ان کا انتقال ہو گیا۔

شوہر کے انتقال سے کشور پھوپھی کے گھر میں قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ سب کچھ درہم برہم ہو گیا تھا۔ یہ سارے واقعات ماریہ کے ہوش سنبھالنے سے پہلے کے تھے اور ان کی تفصیلات اسے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ کشور پھوپھی کے بیوہ ہو جانے کے بعد ابا ان کی اور ان کے بچوں کی کفالت میں حصہ بٹانے لگے۔ تین تین بچوں کا ساتھ تھا۔ ان کو پڑھانا لکھانا تھا۔ کشور پھوپھی ابا کی اکلوتی بہن تھیں اور وہ انہیں بہت چاہتے تھے۔ ان کے میاں کچھ زیادہ چھوڑ کر نہیں مرے تھے۔ مگر کشور پھوپھی نے گھر کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی۔ انہوں نے گھر پر سلائی کڑھائی کا کام شروع کر دیا۔ وہ تو کسی فیکٹری وغیرہ میں نوکری کرنا چاہتی تھیں، لیکن بچوں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکیں۔ ابا ان کی مالی مدد کرتے تھے۔

یہ وہ بات تھی جو اماں کو سخت ناگوار گزرتی تھی، وہ ابا کو برابر طعنے دیتی رہتی تھیں کہ وہ اپنی کمائی کا بڑا حصہ اپنی بہن اور ان کے بچوں کو ٹھنسا دیتے ہیں۔

ابا کو اس بات کا بہت شوق تھا کہ وہ اپنے بچوں کو پڑھائیں۔ وہ خود تو بس پانچویں جماعت تک پڑھے ہوئے تھے، لیکن اپنی اولادوں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اپنی اولادوں کو بھی اور اپنی بیوہ بہن کی اولادوں کو بھی اور اسی لیے ابا نے اماں کی پیہم جھڑکیوں، طعنوں اور لعنت ملامت سے تنگ آ کر فروٹ منڈی میں بھی کچھ تھوڑا بہت کام شروع کر دیا تھا۔ کچھ نہ کچھ کمائی ہو ہی جاتی تھی، لیکن اماں اس پر بھی مطمئن نہیں تھیں۔ ایسا

لگتا تھا جیسے انہیں کشور پھوپھی اور ان کے بچوں سے خدا واسطے کا بیر ہو۔

ابا نے ماریہ کو بڑی چاہت کے ساتھ اسکول میں داخل کروایا تھا اور ماریہ خود بھی بہت خوش ہو کر اسکول گئی تھی اور پھر رفتہ رفتہ اسکول اس کی زندگی کا لازمی اور دل پسند جزو بنتا گیا۔ گھر کی فضا میں ہمیشہ تناؤ اور قہر موجود رہتا، جبکہ اسکول کی فضا میں امن اور سکون تھا اور وہاں رہنے میں ایک لطف محسوس ہوتا تھا۔

گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ گھر کی فضا کے تناؤ اور کشیدگی میں کمی ہونے کے بجائے مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اماں تو بس لڑنے کے بہانے ڈھونڈا کرتی ہیں۔

ماریہ کو تو بعض اوقات ایسا لگتا تھا جیسے اماں ہوا سے لڑ رہی ہوں۔ ان کے مزاج کی برہمی میں برابر اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

ابا کا اب زیادہ تر وقت گھر سے باہر ہی گزرا کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ صرف کھانا کھانے اور سونے کے لیے گھر میں آتے ہیں۔ چھٹی کے دن کام کی تلاش میں نکل جاتے تھے یا پھر کشور پھوپھی کے گھر چلے جاتے تھے اور اگر اماں کو کسی طرح معلوم ہو جاتا کہ وہ کشور پھوپھی کے گھر گئے تھے، تو ان کا پارہ چڑھ جاتا اور وہ ابا اور ان کی بیوہ بہن کو ہزاروں صلواتیں سنا ڈالتیں۔

گھر کی اس غیر دوستانہ، نامہربان اور بیزار کن فضا میں ماریہ کے لیے جو شے سب سے زیادہ عزیز تھی اور جو گھر میں اس کی دل بستگی کا سامان فراہم کرتی تھی، وہ اس کا چھوٹا بھائی نذیر تھا جو اس کا اکلوتا بھائی تھا۔

دونوں ہی بچے ماں باپ کی اس محبت، شفقت اور توجہ سے محروم رہے جو ان کا حق تھی اور جسے ان کے والدین کی مسلسل نااتفاقی نے کبھی پھلنے پھولنے اور بچوں کی شخصیت میں سرایت ہو کر اسے دلکش بنانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

ماریہ نے اپنے لئے فلاح کا ایک راستہ تلاش کر لیا تھا اور وہ تھا پڑھائی کا راستہ۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت پڑھائی پر دیتی اور خود کو کتابوں کے ساتھ مصروف رکھنے کی کوشش کرتی۔ اس طرح اس کے اعصابی تناؤ میں کافی کمی واقع ہو جاتی تھی، کتابوں کی دنیا بہت خوبصورت تھی۔

ماریہ کے دل میں وکیل بننے کا خیال پہلی بار اس وقت پیدا ہوا تھا جب وہ ایک دن اپنی ماں کے ساتھ کورٹ گئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی ماں کے کسی رشتے دار کا کوئی جائیداد وغیرہ کا مقدمہ تھا، جس میں اماں کو گواہ کے طور پر عدالت میں حاضری دینی تھی۔ وہ رشتے دار خود ہی ٹیکسی لے اماں کو لینے آیا تھا اور اماں ماریہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔

وہاں عدالت میں ماریہ کو کالے کوٹ والے مردوں کے علاوہ بہت سی ایسی چاق و چوبند اور اسمارٹ خواتین بھی نظر آئیں جو شلوار قمیض کے اوپر خوبصورت چھوٹے کالے کالے کوٹ پہنے ہوئے تھیں۔ ماریہ کو یہ عورتیں بہت اچھی لگیں۔ اس نے اماں کے رشتے دار سے ان کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ وکیل ہیں۔

گھر آنے کے بعد ماریہ سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے اپنی ماں سے کہا۔ ''اماں..... میں بھی وکیل بنوں گی۔ ان کالے کوٹ والی عورتوں طرح.....''

''اے تم کیا خاک وکیل بنو گی۔'' اماں نے جلے جھلسے لہجے میں کہا۔ ''وکیل وہ بنتے ہیں جن کے اماں باوا کے پاس پیسہ ہوتا ہے۔ ڈھیروں روپیہ چاہئے ہوتا ہے، وکالت کی پڑھائی کے لیے..... تمہارے ابا کے پاس تو کفن کے لیے کوڑی بھی نہیں ہے، وہ تم کو وکالت کی پڑھائی کہاں سے پڑھوائیں گے؟''

ماریہ کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ ابا نے اس کی پڑھائی میں ہمیشہ دلچسپی لی تھی اور اس کی تعلیمی ضروریات سے کبھی صرفِ نظر نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے پڑھیں، لیکن ان کے ساتھ المیہ یہ تھا کہ وہ ان کی جانب پوری توجہ نہیں دے پاتے تھے اور یہ المیہ ابا کا نہیں تھا۔ یہ تو اس پورے گھر کا المیہ تھا، جس کا علاج شاید کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

ماریہ نے چھوٹے سے کالے کوٹ والی ایک اسمارٹ اور خوبصورت سی عورت کے تصور کو اپنے دل میں بسا لیا اور وہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپنے تعلیمی سفر میں مصروف رہی۔

لیکن اس کے بھائی نے اسے بہت مایوس کیا۔ نذیر نے صرف اس کو ہی نہیں، گھر بھر کو مایوس کیا تھا، لیکن باقی لوگوں کو شاید اس کی اتنی زیادہ پروا نہیں تھی، کیونکہ اس گھر میں تو کوئی چیز سلامت نہیں تھی۔ یہاں تو ہر روز کچھ نہ کچھ ٹوٹ جاتا تھا اور اس کی کوئی فکر بھی نہیں کی جاتی تھی، یہ شکست و ریخت تو جیسے اس گھر اور خاندان کا مقدر ہو چکی تھی۔

نذیر اسکول جانے کی عمر کو پہنچا تو اسے بھی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اسے اسکول بھیجنے سے پہلے ماریہ نے خود اس کو گھر پر پڑھانا شروع کر دیا تھا اور نذیر کچھ تھوڑا بہت پڑھنے بھی لگا تھا۔ پھر اس کو اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ساتھ میں ماریہ اس کو خود گھر پر بھی پڑھاتی رہی۔

نذیر کند ذہن نہیں تھا۔ اپنی بڑی بہن کی طرح وہ بھی ایک ذہین بچہ تھا لیکن اس کے

ساتھ دشواری یہ تھی کہ وہ پڑھائی میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے، ویسے ویسے پڑھائی میں اس کی دلچسپی کم ہوتی گئی۔ اسے لڑکوں کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومنے، طرح طرح کی شرارتیں کرنے اور آوارہ گردی کرنے میں زیادہ لطف محسوس ہوتا تھا اور وہ بھی اپنے باپ کی طرح زیادہ تر وقت باہر ہی گزارنے لگا۔

چھوٹی جماعتوں تک تو کسی نہ کسی طرح گاڑی کھنچتی رہی۔ کچھ تھوڑی بہت جد و جہد سے نذیر کو اگلی کلاس میں اس شرط کے ساتھ ترقی مل جاتی تھی کہ وہ اس سال زیادہ محنت کرے گا اور اپنی کمزوریوں پر قابو پانے کی کوشش کرے گا، لیکن اب وہ نویں کلاس میں آ گیا تھا۔ اس سال اسے بورڈ کا امتحان دینا تھا اور اس امتحان کو پاس کئے بغیر میٹرک پاس کرنا بہت مشکل تھا۔ ماریہ اس کے ساتھ بہت محنت کرتی تھی لیکن نتائج مرضی کے مطابق نہیں تھے۔

ماریہ خود اس وقت انٹر کے دوسرے سال میں تھی۔ اس نے میٹرک فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا تھا اور فرسٹ ائیر میں بھی اس کے بہت اچھے نمبر آئے تھے۔

ماریہ نے انٹر بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا اور بی اے میں آ گئی لیکن نذیر نویں کلاس کے امتحان میں فیل ہو گیا۔

''ارے تُو کوئی کام دھندا کیوں نہیں کرتا؟'' اماں غصے سے دھاڑیں۔ ''پڑھنا لکھنا تیرے بس کا نہیں ہے۔ کوئی کام دھندا کر، دو پیسے کما کر لائے گا تو گھر کے، کچھ دلدر دور ہوں گے۔ اپنے ابا کی طرح بالکل نکمامت بن جا۔''

''ابا نکمے تو نہیں ہیں اماں۔'' نذیر نے اپنے باپ کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو بہت کام کرتے ہیں، سارا دن محنت کرتے ہیں۔''

''ہاں ہاں، بڑے خزانے کما کر لے آتا ہے تیرا باپ۔'' اماں نے کڑی نظروں سے نذیر کو گھورا۔ ''کچھ وہ خزانے کما کر لے آتا ہے، کچھ تُو خزانے کما کر لے آئے گا..... منحوس کہیں کا..... اتنا بڑا ہو گیا..... نہ کسی کام کا نہ کاج کا.....''

ماریہ کو نذیر کے فیل ہو جانے کا سخت صدمہ ہوا، وہ دل و جان سے چاہتی تھی کہ نذیر جلد از جلد پڑھ لکھ جائے اور پھر خود اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ وہ اس کو ایک آزاد اور خود مختار انسان کی حیثیت سے ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی لیکن جو کچھ وہ چاہتی تھی، نذیر شاید وہ نہیں چاہتا تھا۔ شاید وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس نے ماں کی لعنت ملامت کی بھی کوئی پروا نہیں کی اور کوئی کام وغیرہ نہیں شروع کیا۔ تعلیم کی جانب اس کا وہی رویہ رہا جو پہلے تھا۔ ابا نے بھی اس کو بہت برا بھلا کہا، لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگلے سال نذیر یہ مشکل بہت ہی خراب نمبروں سے نویں کا امتحان پاس کر سکا اور اس میں بھی اصل محنت ماریہ کی تھی۔ ماریہ اس کو گھیر گھیر کر پڑھاتی رہی اور گھنٹوں اس کو ہلنے نہ دیتی۔ خود نذیر کو بھی اس گھر میں اگر کسی شخص سے کوئی خصوصی لگاؤ تھا تو وہ اس کی بڑی بہن ماریہ ہی تھی، جو اس کی پروا کرتی تھی، اس کے بارے میں سوچتی تھی، اس پر توجہ دیتی تھی اور اس کے دکھ سکھ میں شریک رہتی تھی۔ ماریہ کی گرفت میں آنے کے بعد وہ طوعاً و کرہاً پڑھنے بیٹھ جاتا اور ماریہ اسے کسی چھوٹے سے بچے کی طرح سمجھا سمجھا کر پڑھاتی رہتی۔

نذیر میٹرک میں تو آ گیا، لیکن اس کے اطوار میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

پہلی بار جب نذیر نے میٹرک کا امتحان دیا تو ماریہ نے اس سال بی اے کے آخری سال کا امتحان دیا۔

گھر کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں رونما ہوئی تھی، سوائے اس کے کہ میٹرک پاس کرنے کے بعد سے ہی ماریہ نے ابا کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے ٹیوشنیں پڑھانی شروع کر دی تھیں، ان سے اسے جو کچھ بھی پیسے ملتے تھے، وہ سب کے سب اماں کے حوالے کر دیتی تھی اور اماں انہیں گھر کے خرچے میں ڈال دیتی تھیں، لیکن انہوں نے کبھی ایک بار بھی اس امر پر کسی دلی مسرت یا اطمینان کا اظہار نہیں کیا تھا کہ ان کی بیٹی اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ پیسے کما کر لا رہی ہے۔ ماریہ کے روزگار سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ تعلیمی اخراجات کے بوجھ میں خاصی کمی محسوس ہونے لگی۔

ماریہ نے بی اے میں بھی بہت اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی، لیکن نذیر میٹرک میں فیل ہو گیا۔ ماریہ کو اپنی کامیابی سے جو خوشی حاصل ہوئی تھی وہ ساری مٹی میں مل گئی۔ نذیر کے فیل ہو جانے پر اس نے ڈھیروں آنسو بہائے، لیکن نذیر کو اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ ماریہ نے بی اے کرنے کے فوراً ہی بعد ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ وہ اپنے چھوٹے سے کالے کوٹ والے خواب کو عملی تعبیر سے ہمکنار کرنا چاہتی تھی۔

انہی دنوں اس خاندان کو ایک زبردست اور غیر متوقع صدمے کا سامنا کرنا پڑا جس نے خاص طور سے ماریہ کی زندگی میں بہت کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔

ابا ایک ٹھیکیدار کے ساتھ ایک نئے مکان کی تعمیر گاہ پر کام کر رہے تھے۔ اس روز ایک کمرے کی چھت ڈالی جا رہی تھی، اچانک ایک جگہ سے شٹرنگ کھل گئی اور ڈھیروں ملبہ نیچے گر پڑا۔ ابا کے علاوہ دو اور مزدور بھی دب گئے اور وہ تینوں مر گئے۔

ابا کی لاش گھر لائی گئی تو سارے محلے میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا

تھا کہ وہ مر گئے ہیں۔

ابا کی موت اگرچہ کام کے دوران واقع ہوئی تھی، لیکن ان کی موت کی ذمہ داری کسی نے بھی قبول نہیں کی، نہ تو ٹھیکے دار نے اور نہ مالک مکان نے..... کسی نے ان کے لواحقین کو معاوضے کے طور پر ایک پیسہ بھی نہیں دیا اور نہ ہی کسی سرکاری ادارے کی جانب سے انہیں کچھ دیا گیا۔ ابا اپنے حصے کے سارے عذاب سہہ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ مٹی میں مل گئے اور ان کی زندگی کو بالکل بے قیمت جان کر بھلا دیا گیا۔

ابا کے مرنے کے ساتھ ہی ابا اور اماں میں ہر وقت ہوتے رہنے والے جھگڑوں کا تو خاتمہ ہو گیا اور یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو گیا، لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ دوسرے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھر کی فضا میں سکون اب بھی نہ پیدا ہو سکا۔

نذیر میٹرک میں فیل ہو چکا تھا۔ اس نے پڑھائی بالکل ہی ترک کر دی اور اگلے سال وہ میٹرک کا امتحان دینے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوا۔ وہ اب تقریباً سارا سارا دن گھر سے غائب رہتا تھا، اور راتوں کو بھی دیر سے آتا تھا، ماریہ کے لیے اس پر زیادہ توجہ دینا ممکن نہیں رہا تھا، کیونکہ اس کی مصروفیات کے دائرے میں تو اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا اور وہ نفسیات میں ایم اے کر رہی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر اپنے گھر کے الجھے ہوئے نفسیاتی مسائل نے ہی اسے نفسیات کے گہرے اور باضابطہ مطالعے کی راہ دکھائی تھی۔

اماں بی اے کے بعد اس کی پڑھائی کے سخت خلاف تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ گھر داری کرے اور جلد از جلد اس کی کہیں شادی ہو جائے، لیکن ماریہ نے گزشتہ تمام برسوں کے دوران جو تنہا دکھ جھیلے تھے ان کے باعث اس کے اندر اپنے فیصلے خود کرنے کی غیر معمولی قوت پیدا ہو گئی تھی اور وہ ایسی عام گھریلو اور دبو لڑکیوں کی طرح نہیں تھی جو والدین کی مرضی کے آگے کسی گائے کی طرح گردن جھکا دیں۔ اس نے اپنی ماں کو صاف صاف بتا دیا کہ فی الحال اسے شادی وادی کی ضرورت نہیں ہے اور جب تک وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر لے، اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔

اماں اسے زیادہ مجبور اس لیے بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ اپنا سارا خرچہ وہ خود اٹھاتی تھی اور گھر کے لیے بھی کچھ پیسے دیتی تھی۔ وہ اب بڑی کلاسوں کی کئی ٹیوشنیں کرتی تھی اور اسے اچھے خاصے پیسے مل جاتے تھے۔

''جس کو کچھ لکھ پڑھ لینا چاہئے تھا، اس بدنصیب نے تو دو حرف بھی پڑھ کر نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیئے۔'' اماں غصے میں بڑبڑاتیں۔ ''سارا دن سانڈ کی طرح واہی تباہی اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہتا ہے اور یہ ہیں کہ عالم فاضل بننے کے لئے مری جارہی ہیں۔ نہ جانے کون سا تیر مار لیں گی پڑھ لکھ کر..... آخر کو تو قسمت میں وہی ہانڈی چولہا لکھا ہے۔''

اماں کو جواب دینا یا ان سے الجھنا بیکار تھا۔ ماریہ کو یہ بات ان دنوں سے معلوم تھی جب اس نے پورے طور سے سوچنا بھی نہیں سیکھا تھا۔

کچھ ابا کی جمع پونجی تھی، کچھ ماریہ کما کر لاتی تھی۔ لشتم پشتم گزارہ ہو جاتا تھا۔ کشور پھوپھی کو تو گزشتہ کئی سال سے کسی مدد کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ ان کی دونوں بیٹیاں پڑھ لکھ کر برسرروزگار ہوگئی تھیں اور پھر ان کی شادیاں بھی ہوگئی تھیں۔ بیٹا بھی فارغ التحصیل ہو کر نوکری کرنے لگا تھا۔ ان سب لوگوں کی زندگی کا سخت ترین دور گزر چکا تھا اور وہ دور انہوں نے ابا کی مدد کے سہارے ہی گزارا تھا۔ اماں تو کبھی بھی کشور پھوپھی کے گھر کا رخ نہیں کرتی تھیں، لیکن ماریہ کبھی کبھی ان کے ہاں چلی جاتی تھی اور ان کے گھر کا ہر فرد ابا کے لیے گہری محبت اور عقیدت کا اظہار کرتا تھا۔ ماریہ کو اس وقت بہت خوشی ہوتی تھی جب کشور پھوپھی اور ان کی اولادیں ابا کو احسان مندی اور ممنونیت کے جذبے کے ساتھ یاد کرتیں۔ کوئی تو تھا جس کے لیے ابا کی کوئی اہمیت تھی! کہیں کسی دل میں تو ابا کے لیے اتنی بہت سی جگہ موجود تھی۔

کشور پھوپھی اور ان کی اولادوں کا اماں نے اپنے گھر میں داخلہ بند کر رکھا تھا۔ وہ ان لوگوں کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں جو ان کے میاں کی کمائی پر ڈاکا ڈال رہی تھیں۔ ابا خود ہی کشور پھوپھی کے گھر جاتے رہتے تھے اور کبھی کبھار ماریہ بھی وہاں چلی جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ نذیر کو بھی اپنے ساتھ لے جاتی تھی، لیکن پھر رفتہ رفتہ نذیر تو سب ہی لوگوں سے دور اور بے نیاز ہوتا چلا گیا تھا۔

کشور پھوپھی اور ان کی اولادیں ابا کے مرنے پر گھر آئی تھیں۔ موت کا گھر تھا اور اماں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا، ورنہ شاید وہ ان لوگوں کو گھر میں قدم ہی نہ رکھنے دیتیں۔ وہ لوگ سوئم والے دن ایک بار پھر آئے تھے اور پھر نہیں آئے۔ سوئم والے دن اماں نے ان میں سے کسی سے بات تک نہیں کی تھی۔

نذیر کے لچھن روز بروز زیادہ خراب ہوتے گئے اور پھر رفتہ رفتہ اس خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ نذیر نے نشہ کرنا شروع کر دیا ہے۔

محلے میں شہباز خاں کا ہوٹل، جو بظاہر ایک چائے خانہ تھا، دراصل منشیات فروشی کا

اڈہ تھا اور سب لوگ اس بات سے بخوبی واقف تھے۔ محلے والوں نے اس کے خلاف تھانے میں متعدد درخواستیں بھی دی تھیں۔ ایک دو بار اس ہوٹل پر پولیس نے چھاپہ بھی مارا تھا، لیکن وہاں سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ شہباز خاں ایک بہت بااثر آدمی ہے اور وہ علاقے کی پولیس کو باقاعدگی سے بھتہ دیتا ہے۔ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا کیونکہ وہ سرکاری سرپرستی میں ملک کے طول وعرض میں کام کرنے والے نہایت طاقتور ڈرگ مافیا کا ایک حصہ تھا اور شہباز خاں جیسے لوگ اور ان کے اڈے کراچی میں ہر جگہ موجود تھے۔ گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ ان کی تعداد میں، سڑکوں پر گلی کوچوں میں، نیم مردہ حالت میں پڑے ہوئے موت کے انتظار میں گھڑیاں گنتے ہوئے ہیروئچیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ نذیر بھی اس اضافے کا ایک حصہ بن گیا تھا۔

نذیر کو نشے کی لت اپنے محلے کے اڈے سے لگی، جہاں نوجوانوں کو پہلے پہل شوقیہ اور مفت نشہ کرنے کی ترغیب دینے کے خصوصی سامان موجود تھے اور ایک بار جب کوئی شخص اس کا عادی بن جاتا تھا، تو پھر وہ ایک ایسے خوفناک مرگ آفریں شکنجے میں پھنس جاتا تھا، جہاں سے اس کا نکلنا تقریباً ناممکن تھا۔

نذیر ہیروئن کا عادی بن گیا تھا اور اپنے آپ کو بری طرح ضائع کر رہا تھا۔ اس کی صحت تباہ ہو رہی تھی۔ اس کی زندگی برباد ہو رہی تھی، لیکن اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ ماریہ آٹھ آٹھ آنسو روتی تھی اور جس حد تک ممکن ہوتا تھا، اسے سمجھانے کی کوشش کرتی تھی۔

''ارے وہ کیا سمجھے گا بدنصیب۔'' اماں غصے کے عالم میں دانت پیس کر کہتیں۔ ''جیسا اس کا باپ تھا نکما، ویسا ہی یہ بھی ہے۔ آخر ہے کس کی اولاد..... باپ نے زندگی میں کون سا سکھ ہم لوگوں کو دے دیا جو یہ ہمیں کوئی سکھ دے گا؟ اس سے تو یہ پیدا ہی نہ ہوا ہوتا تو اچھا تھا..... ایک انڈا، وہ بھی گندا.....''

ماریہ کے بہت زور دینے اور سمجھانے بجھانے پر نذیر نشہ ترک کرنے کے لیے آمادہ ہوگیا، لیکن اب وہ اس مرحلے میں داخل ہو چکا تھا جہاں وہ نشے کو چھوڑنا چاہتا تھا، لیکن نشہ اس کو نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ کھانے اور پانی کے بغیر زندہ رہ سکتا تھا لیکن نشے کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

ماریہ نے منشیات کے خلاف جدوجہد میں سرگرم عمل ایک فلاحی ادارے سے رابطہ قائم کیا اور کوشش کر کے نذیر کو ایک ہسپتال میں داخل کروا دیا جہاں نشے کے عادی افراد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا علاج کیا جاتا تھا اور نشہ چھوڑنے میں ان کی مدد کی جاتی تھی۔

نذیر کوئی پندرہ دن تک وہاں زیر علاج رہا، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ منشیات فروشوں کا نیٹ ورک بہت مضبوط تھا۔ وہ ہسپتال میں داخل اس قسم کے افراد کو بھی اپنے ایجنٹوں کے ذریعے خاموشی سے نشہ فراہم کرتے رہتے تھے۔

نذیر ہسپتال سے آیا اور ایک بار پھر اپنی اسی سابقہ روش پر گامزن ہو گیا۔

ماریہ کے لیے اس سے بڑا دکھ اور کوئی نہیں تھا کہ اس کا اکلوتا بھائی یوں مٹی میں ملتا چلا جائے۔ نذیر اپنے آپ کو مٹی کر رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی کو، اپنی جوانی کو مٹی میں ملائے ڈال رہا تھا اور شاید اس کو خود اس کا احساس بھی نہیں تھا اور اگر احساس تھا بھی، تو بھی وہ خود کو نہیں روک سکتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ بڑی تیزی سے بدل گیا تھا۔ نذیر کی شکل ہونقوں جیسی ہو گئی تھی۔ وہ کئی کئی دن تک شیو نہیں بناتا تھا، کپڑے نہیں بدلتا تھا، اس کے سر کے بال جھاڑ جھنکاڑ کی طرح پھیل گئے تھے اور عام طور پر کنگھی سے بے نیاز رہتے تھے۔ اس کے کپڑوں سے بدبو آتی تھی۔

ماریہ نے ذاتی طور پر زندگی میں بڑی کامیابیاں حاصل کر لی تھیں۔ اس نے نفسیات میں ایم اے کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا بچپن کا دیرینہ خواب بھی پورا کر لیا تھا۔ اس نے ایل ایل بی کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تھا اور جب اس کو لاء کالج کے ایک جز وقتی پروفیسر نے، جہاں ماریہ نے تعلیم حاصل کی تھی، ماریہ کو اپنی لاء فرم میں ایک جونیئر کی حیثیت سے کام کرنے کی پیشکش کی تو ماریہ نے بخوشی اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ لاء کالج کا یہ پروفیسر ایک معروف بیرسٹر تھا اور اس کی پریکٹس بہت اچھی چلتی تھی۔ وہ ہفتے میں دو دن شام کو لاء کالج میں کلاس لیتا تھا اور ماریہ کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔

ماریہ نے لاء فرم میں شمولیت اختیار کر لی اور وہاں سے اسے ہر ماہ اچھی خاصی تنخواہ بھی ملنے لگی۔ اسے اب حصول معاش کے لیے بکھرے ہوئے چھوٹے موٹے اور مختصر مشاہروں والے کئی کئی کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ روزگار کا ایک تقریباً مستقل ذریعہ اس کو دستیاب ہو گیا تھا۔ زندگی نے ایک نئی کروٹ لی تھی اور ایک نئے سفر کا آغاز ہوا تھا، لیکن صدمات اور آلام کا سلسلہ تھا کہ کسی نہ کسی شکل میں جاری ہی تھا۔ نذیر کی اس کے اپنے ہاتھوں تباہ ہوتی ہوئی زندگی کا دکھ ماریہ کی زندگی کے ہر سکھ کو دیمک کی طرح چاٹے جا رہا تھا۔

وہ جب گلیوں اور سڑکوں میں، فٹ پاتھوں کے کنارے، نالوں کے پاس، کونوں کھدروں میں پڑے ہوئے ہیروئنچیوں کو دیکھتی جو دیکھنے میں محض غلاظت کا ایک ڈھیر معلوم ہوتے تھے، تو اس کا دل کانپ اٹھتا تھا۔ یہ لوگ جن کے جسموں پر لباس کے نام پر سیاہ بدبودار چیتھڑے لٹکے ہوتے تھے۔ جن کے میل اور گندگی سے چکٹے ہوئے بال درختوں کی خشک اور مردہ شاخوں کی طرح نظر آتے تھے، جن کی گدلی گدلی، میلی کچیلی آنکھوں میں ساری دنیا کی محرومی اور بے بسی بھری دکھائی دیتی تھی۔ یہ ہمیشہ سے تو ایسے نہیں ہوں گے۔ ان میں سے اکثریت نوجوان اور جوان لوگوں کی ہوتی تھی جو وقت سے بہت پہلے ہی بوڑھے ہو چکے تھے اور ہو رہے تھے۔ ان کے قریب سے گزرنے والا کوئی بھی شخص ان کی جانب موت کے قدموں کی بڑھتی ہوئی چاپ کو آسانی سے سن سکتا تھا۔

ان لوگوں کو دیکھتے ہوئے اچانک ان میں سے کسی کے جسم پر نذیر کا چہرہ نمودار ہو جاتا۔ ماریہ کے وجود میں خوف کی ایک تند و تیز لہر دوڑ جاتی۔

ہاں..... وہ نذیر بھی ہو سکتا ہے..... ان میں سے کوئی بھی نذیر ہو سکتا ہے..... آخر نذیر بھی تو ایک ہیروئنچی ہے..... کچھ دنوں کے بعد اس کا بھی یہی حال ہو سکتا ہے۔

اخباروں میں آئے دن خبریں چھپا کرتی تھیں۔ ''فلاں جگہ ایک ہیروئنچی کی اکڑی ہوئی لاش پائی گئی، جسے مردہ خانے میں بھجوا دیا گیا۔''

''فلاں جگہ سے ملنے والی نوجوان ہیروئنچی کی لاش کئی دن تک سرد خانے میں رکھے جانے کے بعد لاوارث قرار دے کر دفن کر دیا گیا۔''

''تھانے میں بند ہیروئنچی کی ہلاکت۔'' ماریہ جب اس قسم کی خبریں پڑھتی تو اس کے دل و دماغ میں ایک حشر برپا ہو جاتا۔ یہ انجام..... یہ دردناک انجام..... یہ نذیر کا مقدر بھی ہو سکتا تھا۔ ماریہ کا رواں رواں خوف سے کانپنے لگتا۔

نذیر کوئی کام دھندہ تو کرتا نہیں تھا، لیکن اسے نشے کے لیے پیسے چاہئے ہوتے تھے۔ اس نے اپنی باقی تمام تر ضروریات کو تقریباً ترک کر دیا تھا اور صرف ہیروئن کی طلب باقی رہ گئی تھی۔

نذیر اماں سے پیسے مانگتا تھا اور اماں اسے کتے کی طرح دھتکارتی تھیں۔ بہت خوشامد درآمد کے بعد وہ اماں سے تھوڑے سے پیسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا، ماریہ کا تو جی چاہتا تھا کہ وہ اسے بہت سارے پیسے دے دے، لیکن وہ اسی خوف کے تحت اسے پیسے دینے سے گریز کرتی تھی کہ جتنے زیادہ پیسے اس کے پاس ہوں گے، اتنا ہی زیادہ وہ نشہ کرے گا اور موت کی جانب اس کا سفر اتنی ہی زیادہ تیزی اختیار کرے گا۔ وہ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوران کئی بار اس کے علاج کی بھی کوشش کر چکی، لیکن اس کے عدم تعاون کے باعث یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ وہ چڑچڑا، بددماغ، ترش رو، بدزبان اور جھگڑالو تو ہو ہی گیا تھا اور بعض اوقات تو اس کی آنکھوں میں ایسا خون اتر آتا تھا کہ ماریہ خوف زدہ ہو جاتی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ نذیر کی دماغی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے طور پر مختلف طریقوں سے اس کی مدد کرنا چاہتی تھی، وہ اسے لے کر کئی ماہرین نفسیات کے پاس بھی گئی جن سے وہ ذاتی طور واقف تھی لیکن نذیر کسی طرح نشہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ نشے کا زہر اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔

اس روز بھی نذیر نے اپنی اماں سے پیسے مانگے۔ اماں نے حسب دستور اسے دھتکار دیا۔

''تیرا باپ بڑے خزانے چھوڑ کر مرا تھا نا، جو میں تجھے پیسے دوں گی۔'' اماں نے قہر بھری نظروں سے نذیر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''نہیں ہیں میرے پاس پیسے...... دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے......''

''پیسے دے دو اماں۔'' اچانک نذیر نے بھاری آواز میں کہا۔ اب اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ ''پیسے دے دو، مجھے بہت سخت ضرورت ہے۔''

''کیوں دے دوں؟'' اماں نے چمک کر کہا۔ ''قرضہ آتا ہے تیرے باپ کا؟ ارے میں کہتی ہوں تو مر کیوں نہیں جاتا، بے غیرت...... بہن کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے کتوں کی طرح اور ذرا شرم نہیں آتی......''

اور پھر اچانک نہ جانے کیا ہو گیا...... وہ ہو گیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

نذیر نے اچھل کر اماں کی گردن دبوچ لی اور بری طرح دبانے لگا اور ساتھ ہی ساتھ وہ پھنسی پھنسی بھرائی ہوئی آواز میں اماں کو برا بھلا کہتا جا رہا تھا۔

''پیسے نہیں دو گی تو جان سے مار ڈالوں گا۔'' وہ دانت پیس کر کہہ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی پتھر جیسی سخت انگلیاں اماں کے گلے میں دھنستی چلی جا رہی تھیں۔ اماں کے گلے سے بڑی ہی خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔

''ارے چھوڑو۔'' ماریہ اپنی پوری آواز سے چلاتی ہوئی بدحواس ہو کر دوڑی۔

''چھوڑو...... چھوڑو۔'' وہ بری طرح چلا رہی تھی اور اس نے قریب جا کر نذیر کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔

''چھوڑو...... میں تمہیں پیسے دیتی ہوں...... چھوڑو...... چھوڑو......'' وہ چیخ رہی تھی لیکن نذیر تو جیسے پاگل ہو گیا تھا۔

نذیر کچھ نہیں سن رہا تھا، اس کے اندر جیسے بلا کی قوت آ گئی تھی، ماریہ اس کے ساتھ ہاتھا پائی کر رہی تھی اور اماں کی گردن کو اس کے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش رہی تھی۔

''مار ڈالوں گا...... جان سے مار ڈالوں گا۔'' نذیر بری طرح چیخ رہا تھا، ماریہ بھی چیخ رہی تھی، اماں کے حلق سے بڑی خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں، سارے گھر میں قیامت کا شور مچا ہوا تھا۔

''ارے بچاؤ......!'' اچانک ماریہ اپنے وجود کی پوری قوت کے ساتھ دھاڑی، وہ نذیر پر قابو پانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی اور وہ اس جدوجہد کو طول نہیں دے سکتی تھی، نذیر کو فوراً روکنا اور اماں کی گردن کو اس آہنی گرفت سے نکالنا بہت ضروری تھا، وہ مدد کے لیے چیخ رہی تھی اور نذیر کو گھونسوں سے مار رہی تھی، اماں گردن دبنے کی وجہ سے بالکل بے حال ہو گئی تھیں اور بری طرح پھڑک رہی تھیں، وہ کوئی مؤثر مزاحمت نہیں کر پا رہی تھیں۔

دروازے پر دستک ہوئی اور ماریہ نے تیر کی طرح جھپٹ کر دروازہ کھولا، آنے والے عرفان چچا تھے جو پڑوس میں رہتے تھے اور کسی دفتر میں ملازم تھے، ماریہ انہیں لے کر تیزی سے برآمدے کی طرف بھاگی جہاں نذیر جنون کے عالم میں اماں کا گلا دبا رہا تھا، ماریہ مدد کے لیے چلا رہی تھی۔

عرفان چچا نے نذیر کی پشت پر ایک بھرپور لات رسید کی اور نذیر نے غراتے ہوئے اپنی اماں کا گلا چھوڑ دیا، اس کے ساتھ وہ تیزی سے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بھاگا اور اس وقت وہ ساجد علی سے ٹکرایا۔ ساجد علی اور جاوید نامی دو پڑوسی نوجوان کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے، نذیر انہیں دھکا دیتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

وہ سب لوگ اماں کی طرف متوجہ ہو گئے جو بے سدھ پڑی ہوئی تھیں، ان کا منہ کھلا ہوا تھا اور زبان ٹیڑھی ہو گئی تھی، ان کی پتلیاں ساکت تھیں، ان کی گردن پر دبائے جانے کے واضح نشانات پید ہو گئے تھے۔

''انہیں جلدی سے ہسپتال لے چلو۔'' عرفان چچا نے چلا کر کہا۔

اماں کو ہسپتال لے جانے کا کوئی نتیجہ نہیں ہوا، ڈاکٹروں نے ان کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں مردہ قرار دے دیا۔ بظاہر موت گلا گھونٹے جانے سے واقع ہوئی تھی، لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری ہسپتال بھیج دیا گیا، یہ پولیس کیس تھا...... قتل کا کیس......

نذیر کو اسی رات گرفتار کر لیا گیا، وہ نہیں بہت دور نہیں جا سکا تھا، اسے ایک ہیرونچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوست کے ساتھ اس کی کھولی میں پڑا ہوا تھا، اسے اپنی ماں کے قتل کے جرم میں حوالات میں بند کر دیا گیا۔

ماریہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے صدمے سے دوچار تھی جس نے اس کو پاگل کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ کس کے لیے روئے؟ اماں کے لیے جنہیں گلا گھونٹ کر مار دیا گیا تھا یا اس قابل رحم چھوٹے بھائی کے لیے جو ایک طویل عرصے سے خود کو تھوڑا تھوڑا کر کے ہلاک کرتا چلا آیا تھا اور اب اس نے خود کو مکمل ہلاکت میں ڈال دیا تھا؟ کس کے حصے میں کتنے آنسو رکھے جائیں؟ وہ ایسی دردناک اور صبر آزما صورت حال سے دوچار تھی کہ اس کا دماغ بالکل ماؤف ہوا جا رہا تھا..... اسے کیا کرنا تھا؟ اسے کیا کرنا چاہئے؟ اسے پولیس کا سامنا کرنا تھا، اسے سارے واقعہ کی تفصیلات فراہم کرنی تھیں، وہ ایک چشم دید گواہ تھی، وہ کیا بیان دے؟ کیا بتائے اور کیا چھپائے؟ کیا کچھ چھپانے کی گنجائش تھی بھی.....؟

اسے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی، وہ ایک قانون دان تھی اور اس معاملے کے سارے قانونی پہلوؤں سے واقف تھی، وہ جانتی تھی کہ اس جرم میں نذیر کو سزائے موت بھی ہو سکتی ہے لیکن وہ حقائق کو نہیں چھپا سکتی تھی۔ ''جو کچھ ہوگا، وہ برداشت کرنا پڑے گا۔ میں اسے پھانسی سے بچانے کی کوشش ضرور کروں گی۔''

اس نے پولیس کو بالکل درست بیان دیا، عرفان چچا اور دوسرے پڑوسیوں نے بھی سب کچھ سچ سچ بتایا۔

اگلے دن وہ نذیر سے ملنے کے لیے تھانے گئی، ایس ایچ او بڑے احترام کے ساتھ اس سے پیش آیا، ماریہ تو دہری ہمدردی کی مستحق تھی۔

''اگر اسے خوراک نہ ملتی تو شاید وہ مر جاتا اور پولیس پر الزام آتا کہ ملزم حوالات میں مر گیا۔'' ایس ایچ او نے ماریہ سے کہا۔ ''آج صبح کو اس کی حالت بہت غیر ہو گئی تھی، اس کا سارا جسم پتے کی طرح کانپ رہا تھا، ہم اس کی جان بچانے کی غرض سے بس یہی کر سکتے تھے کہ اسے ایک چھوٹی خوراک دے دی اور اس کے بعد اس کی حالت قدرے بہتر ہو گئی، اب آپ اس سے بات کر سکتی ہیں، ہم نے اس کو بتا دیا ہے کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔''

ماریہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کے قاتل سے کیا بات کرے، اپنی ماں کے قاتل سے اس کا جو رشتہ تھا، وہ اس کے لیے جیسے ایک گالی بن گیا تھا۔

اس نے حوالات کے باہر سے نذیر کو دیکھا، اس کی آنکھیں کسی مار کھائے جانور کی طرح زخمی زخمی نظر آ رہی تھیں، اس کے چہرے کے سارے خدوخال بری طرح مسخ ہو چکے

تھے، ماریہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''تم نے اماں کو مار دیا نذیر.....!'' ماریہ کی زبان سے بمشکل یہی ایک جملہ نکل سکا، وہ اور کچھ نہ کہہ سکی اور واپس چلی آئی۔

ماریہ کا سینئر بیرسٹر فخر الدین انصاری جس کے ساتھ ماریہ کام کرتی تھی، ماریہ کے گھریلو حالات سے بخوبی واقف تھا اور اس نے اس نازک واقعہ پر ماریہ کی بہت مدد کی، اس وقت اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر نذیر کو طبی امداد بہم نہ پہنچائی جاتی تو نشہ نہ ملنے کے باعث اس کی موت واقع ہو سکتی تھی۔

بیرسٹر فخر الدین نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے ملزم نذیر کو سرکاری خرچ پر ایک ایسے ہسپتال میں داخل کروانے کا بندوبست کر دیا جہاں اس کو موت سے بچایا جا سکتا تھا۔ یہاں وہ پولیس کی حراست میں تھا اور اس کا علاج ہو رہا تھا، ساتھ ہی پولیس کی کارروائیاں بھی جاری تھیں۔

نذیر کے ہاتھوں اماں کے قتل نے سارے رشتے داروں اور ملنے جلنے والوں میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ اگر اماں قدرتی موت مری ہوتیں تو شاید ان کی موت پر لوگوں نے اتنی زیادہ توجہ بھی نہ دی ہوتی، لیکن وہ تو ایک بے حد حیرت ناک اور ناقابل یقین موت مری تھیں! انہیں ان کے ہیرونچی بیٹے نے مار دیا تھا۔ چنانچہ تعزیت کے لیے آنے والوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ دور پرے کے عزیز رشتے دار اور ملنے جلنے والے جوق در جوق تعزیت کے لیے آ رہے تھے۔ یہ لوگ تعزیت کے لیے کم اور ایک پُرتجسس اور مہم انگیز داستان سننے کے لیے زیادہ آ رہے تھے اور ماریہ اس امر سے نہ صرف یہ کہ بخوبی واقف تھی بلکہ ان لوگوں سے سخت بیزار اور نالاں تھی۔ ان کے بظاہر تعزیتی سوالات کے پیچھے ایک چونکا دینے والی کہانی سننے کی جو ایک سفاک خواہش چھپی ہوئی تھی، اس کو پورا کرنا ماریہ کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ ''کیا..... کیا اس سے پہلے بھی کبھی اپنی ماں پر حملہ کیا تھا؟''

''کیا کبھی تم پر بھی حملہ کیا تھا؟''

''کیا اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے تھے؟''

''کیا کبھی ڈاکٹر کو دکھایا تھا؟''

''ایک ہیرونچی میں اس قدر طاقت کہاں سے آ گئی؟''

''اب تم کیا کرو گی؟''

''اس کو سزا دلوانے کی کوشش کرو گی یا بری کروانے کی؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس قسم کے خوفناک سوالات سے وہ تنگ آ چکی تھی۔ لوگوں کو اس معاملے میں تجسس، تحیر اور سنسنی کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اس گہرے المیے کی نوعیت شدت اور ہلاکت خیزی کا ادراک کرنے کی صلاحیت سے بالکل عاری تھے جو اس سلسلۂ واقعات کے پیچھے کارفرما تھا۔ ان کی تیز متجسس، سوالیہ اور متلاشی نظروں کی چبھن ماریہ کو اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ تنگ آ کر اس نے لوگوں کے سوالوں کے جوابات دینے چھوڑ دیئے تھے اور صرف یہ کہہ کر بات ٹال جاتی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے، وہ اس کو دہرانا نہیں چاہتی کیونکہ اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔

کشور پھوپھی تو اسی رات کو ماریہ کے پاس آ گئی تھیں۔ ماریہ گھر میں بالکل اکیلی تھی اور اس نے کشور پھوپھی کو فون کر کے بلایا تھا۔ لے دے کے وہی ایک قریبی رشتے دار تھیں جن سے وہ حقیقی ہمدردی کی توقع رکھ سکتی تھی۔ کشور پھوپھی اس کے گھریلو حالات سے بھی ہمیشہ سے پوری طرح واقف تھیں اور وہ اس سارے المیے کو سمجھ سکتی تھیں اور ماریہ کا دکھ بانٹ سکتی تھیں۔

اماں کا سوئم بھی ہو گیا، کشور پھوپھی روز ہی آتی تھیں۔ وہ سہ پہر کے بعد آ جاتی تھیں اور رات کو یہیں رک جاتی تھیں۔ اگلے دن صبح کو پھر اپنے گھر چلی جاتی تھیں۔ ماریہ کو ان سے بڑا سہارا تھا۔

سوئم کے دوسرے دن جب کشور پھوپھی آئیں تو ان کے ساتھ ادھیڑ عمر کا ایک اجنبی بھی تھا۔ ماریہ نے اس شخص کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اجنبی کے چہرے سے گہرے حزن و ملال کا اظہار ہو رہا تھا۔

''یہ وسیم ہیں.....'' کشور پھوپھی نے اجنبی کا تعارف کراتے ہوئے ماریہ سے کہا۔ ''یہ تمہاری مرحوم ماں کے دور کے رشتے دار ہوتے ہیں۔'' اور پھر وہ وسیم سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ''وسیم.....! یہ ماریہ ہیں، رخسانہ کی بیٹی.....!'' ماریہ نے وسیم کو سلام کیا، وسیم نے جواب دیا۔

''ہاں.....! رخسانہ کی بیٹی.....'' وسیم نے ماریہ کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اداس اور مغموم لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ نہ بھی بتاتیں تو بھی میں ان کی شکل دیکھ کر سمجھ لیتا کہ یہ رخسانہ کے علاوہ اور کسی کی بیٹی ہو ہی نہیں سکتیں۔ کتنی شباہت ہے ان کی اپنی ماں سے۔''

اس اجنبی کی آواز میں جو دکھ تھا، اسے ماریہ صاف طور پر محسوس کر سکتی تھی۔ دکھ اور اپنائیت کا یہ انداز اپنے اندر بڑی سچائی لیے ہوئے تھا۔

وسیم صوفے پر بیٹھ گیا، کچھ دیر تک فضا پر بوجھل خاموشی طاری رہی۔ ماریہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی مرحوم ماں کے اس دور کے اجنبی رشتے دار سے کیا بات کرے۔ وہ تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

اور پھر اچانک ایک ایسی بات ہوئی جس نے ماریہ کو سخت حیران کر دیا۔ اس سے پہلے تو تعزیت کے لیے آنے والوں میں سے کسی نے بھی ماریہ کو حیرت سے دوچار نہیں کیا تھا بلکہ وہ سب لوگ تو خود حیران ہونے کے لیے آئے تھے، لیکن یہ پہلا شخص تھا جس نے خود حیران ہونے کے بجائے ماریہ کو حیران کر دیا تھا۔

اس اجنبی رشتے دار کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے رخساروں پر ڈھلک رہے تھے، وہ شخص رو رہا تھا۔

کتنے بہت سے لوگ تعزیت کرنے کے لئے آئے تھے جن میں دور پرے کے عزیز رشتے دار اور ملنے جلنے والے شامل تھے۔ ان میں سے زیادہ تر وہ لوگ تھے جو تعزیت کے نام پر تماشا دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ کشور پھوپھی اور چند دیگر خواتین کے علاوہ کسی کی آنکھ سے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا تھا۔ آنے والے مردوں میں سے تو کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس کی آنکھوں سے آنسو بہے ہوں، مگر یہ شخص..... یہ مرد..... یہ کون تھا جو اماں کی موت کے غم میں آنسو بہا رہا تھا، اس کو اماں کی موت کا اس قدر رکھ کیوں تھا؟

کچھ دیر بعد وسیم نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ اور آنکھیں صاف کیں، اس کے چہرے پر ویرانی سی برس رہی تھی اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''مجھے تمہاری ماں کے انتقال کی خبر سن کر دلی صدمہ پہنچا بیٹی ماریہ۔'' وسیم نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ کی تلاش میں ہو اور الفاظ اس کی گرفت سے نکل بھاگنے پر آمادہ ہوں۔ ''تم مجھے نہیں جانتیں، تم سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی، لیکن تمہاری ماں اور میں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ مجھے ان کی موت کا سن کر بہت ہی زیادہ دکھ ہوا۔'' وسیم کی آواز بھرانے لگی اور وہ اس سے آگے کچھ نہیں بولا، اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

''آپ کبھی ہمارے گھر نہیں آئے انکل.....؟'' ماریہ نے وسیم کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ ''ابا کے مرنے پر بھی شاید آپ نہیں آئے تھے؟ اماں نے کبھی آپ کا ذکر بھی نہیں کیا۔''

''تمہارے ابا کے انتقال کے وقت میں کراچی میں نہیں تھا۔'' وسیم نے کہا۔ ''میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دراصل زیادہ تر باہر رہتا ہوں، میں بحری جہاز پر کام کرتا ہوں، اس بار بھی ابھی چند دن پہلے ہی کراچی آیا ہوں۔''

وسیم نے رک رک کر اور ٹھہر ٹھہر کر اپنے بارے میں بتایا۔ اس نے ماریہ سے اس دردناک واقعے کی تفصیلات پوچھ کر اس کے دکھ میں اضافہ نہیں کیا۔ اسے یقیناً سب کچھ پہلے سے ہی معلوم ہوگا کیونکہ کشور پھوپھی اسے سب بتا چکی ہوں گی، اس کے بجائے وہ ماریہ سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

ماریہ نے اس امر کا احساس کیا کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے اس سے اس واقعے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پوچھا تھا۔ اس نے تو نذیر کے بارے میں اور اس کے مقدمے کے بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا تھا۔

''اچھا! اب میں چلتا ہوں، ماریہ بیٹی.....!'' کچھ دیر کے بعد وسیم نے اٹھتے ہوئے ماریہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''جی تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے پاس اور دیر تک بیٹھوں لیکن پھر کبھی سہی۔''

وہ کشور پھوپھی کے ساتھ وسیم کو دروازے تک چھوڑنے گئی۔ رخصت ہوتے وقت وسیم نے بڑی گہری اور اداس نظروں سے ماریہ کو دیکھا، چند لمحوں تک وہ اسے دیکھتا رہا اور پھر چلا گیا، ماریہ اور کشور پھوپھی اندر کمرے میں واپس آ گئیں۔

کشور پھوپھی کے کمرے میں واپس آتے ہی ماریہ نے ایک لمحہ رکے بغیر سخت اضطراب کے عالم میں کہا۔ ''یہ کون تھے.....؟ یہ اماں کے کون سے رشتے دار تھے؟ یہ تو رو رہے تھے..... مرد ہو کر رو رہے تھے، میں نے تو اماں کے کسی بھی رشتے دار مرد کو اس طرح آنسو بہاتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

کشور پھوپھی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گئیں۔ ان کا چہرہ جیسے دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

''ایسا لگتا ہے کہ ان صاحب کو اماں سے کوئی خاص لگاؤ تھا۔'' ماریہ نے کشور پھوپھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی آنکھوں میں ایک ایسی عورت کی موت پر آنسو نہیں آ سکتے تھے جسے انہوں نے برسوں سے کبھی نہ دیکھا ہو، کیوں کشور پھوپھی.....! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

''شاید.....!'' کشور پھوپھی کی آواز کسی ہلکی سی سرگوشی کی طرح تھی۔

''تو پھر مجھے اس بارے میں بتائیے کشور پھوپھی! میں ان صاحب کے متعلق جاننا

چاہتی ہوں۔''

''اب نہ میرا چھوٹا بھائی ظہیر اس دنیا میں ہے اور نہ اس کی بیوی رخسانہ.....!'' کشور پھوپھی کی آواز اتنی ہلکی ہو گئی تھی کہ ماریہ کو سننے کے لیے اپنی سماعت کو پوری طرح متوجہ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ ''وہ سب باتیں اب پرانی ہو چکی ہیں، کچھ نہیں رکھا ہے ان میں، گڑے مردے اکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں، لیکن تم جاننا ہی چاہتی ہو تو میں تم کو مختصراً بتا دیتی ہوں۔ اب بتا دینے میں کوئی ہرج بھی نہیں ہے کیونکہ ان دونوں میاں، بیوی میں سے اب کوئی بھی زندہ نہیں ہے، تمہاری ماں اپنے سارے پچھتاووں اور سارے عذابوں کے ساتھ قبر میں جا چکی ہے اور وہ سارے قصے اب مردہ ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی میں تم کو وہ باتیں بتائے دیتی ہوں جو میں نے آج تک کسی کو نہیں بتائیں۔ خود اپنے بچوں سے بھی کبھی ان کا ذکر نہیں کیا۔''

ماریہ محویت کے عالم میں ہمہ تن گوش تھی۔ کشور پھوپھی جو انکشاف کرنے جا رہی تھیں، وہ اب پورے طور پر انکشاف نہیں رہا تھا، ماریہ کو صورت حال کا بڑی حد تک اندازہ ہو گیا تھا لیکن وہ سب کچھ جاننے کے لیے بیتاب تھی۔

''میرے والد یعنی تمہارے دادا کی تین اولادیں تھیں۔'' کشور پھوپھی آہستہ آہستہ بتانے لگیں۔ ''میں سب سے بڑی تھی، میرے بعد تمہارے باپ ظہیر تھے اور ان سے چھوٹی ایک اور بہن تھی، وہ بچپن میں ہی انتقال کر گئی، ہم غریب لوگ تھے، میرے والد بھی راج مستری تھے اور انہوں نے اپنے بیٹے ظہیر کو بھی یہی کام سکھایا۔ رخسانہ کا خاندان ہمارے پڑوس میں رہتا تھا۔ رخسانہ مجھ سے کافی چھوٹی اور ظہیر کے جوڑ کی تھی، مجھے وہ بہت اچھی لگتی تھی۔ میں شروع ہی سے اس کو پسند کرتی تھی اور میری خواہش تھی کہ میں اس کو ظہیر کی دلہن بنا کر اپنے گھر لے آؤں۔ میرا اس کے گھر بہت آنا جانا تھا اور وہ بھی ہمارے گھر آتی رہتی تھی لیکن میں نے اپنے اس خیال کا کبھی اس کے سامنے اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر میری شادی ہو گئی اور میں رخصت ہو کر اپنے میاں کے گھر چلی گئی۔ مگر جب بھی میں اپنے میکے آتی، رخسانہ کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزارتی، رخسانہ بھی اب تیزی سے شادی عمر کو پہنچ رہی تھی۔

''رخسانہ کا خاندان بھی ہماری ہر طرح کا ایک غریب خاندان تھا۔ رخسانہ کے ابا یعنی تمہارے نانا مکانوں میں رنگ، پینٹ، پالش کا کام کرتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ہم لوگ ظہیر کے لیے رخسانہ کو مانگیں گے تو وہ لوگ انکار نہیں کریں گے کیونکہ ظہیر اچھے خاصے پیسے کما لیتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں نے جب اس سلسلے میں اپنے والدین سے بات کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے میری تجویز کو فوراً قبول کرلیا خاص طور سے، ہماری اماں کو تو یہ خیال بہت ہی اچھا لگا، رخسانہ ان کو بھی بہت پسند تھیں، وہ لوگ اس بات کے لیے راضی ہوگئے کہ اگلے دن ظہیر کا رشتہ لے کر رخسانہ کے گھر جائیں گے۔

''میں بہت خوش اور مضطرب تھی، اگلے دن مجھے اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنے بھائی کا رشتہ لے کر رخسانہ کے گھر جانا تھا اور یہ خیال ہی میرے لیے بڑا مسرت انگیز تھا کہ میں رخسانہ کو اپنی بھاوج بنا کر اپنے گھر لے آؤں گی۔

''لیکن ہوا یوں کہ اس شام کو میرے میاں کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی اور مجھے فوراً ہی اپنے گھر چلا جانا پڑا، ابا اور اماں اکیلے ہی رخسانہ کے لیے ظہیر کا رشتہ لے کر رخسانہ کے گھر چلے گئے۔

''میں دوسرے دن اپنے والدین کے گھر آئی، مجھے اپنی کل کی عدم موجودگی کا افسوس تھا، مگر میرے والدین کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اس کام کو ملتوی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس کے لیے مبارک گھڑی پھر بہت دنوں کے بعد میسر آتی۔ ظہیر سے تو ہم لوگوں کی بات پہلے ہی ہو چکی تھی، وہ رخسانہ سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور اس نے اس رشتے پر خوشی کے ساتھ آمادگی کا اظہار کیا تھا، وہ رخسانہ کو پسند کرتا تھا۔

''میری والدہ نے مجھے خوشخبری سنائی کہ رخسانہ کے والدین نے تو فوراً ہی اس رشتے کو اس طرح قبول کرلیا جیسے وہ اس کے انتظار میں ہی بیٹھے ہوں۔ شادی طے ہوگئی تھی۔

''میں اسی دن رخسانہ کے پاس پہنچی۔ میں اسے اس رشتے پر مبارکباد دینا اور یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ اصل میں، میں نے ہی اس اس کو اپنے بھائی کے لیے پسند کیا تھا۔

''میں رخسانہ کے گھر گئی اور میں نے تنہائی میں رخسانہ کو مبارکباد دیتے ہوئے اسے بتایا کہ دراصل میں نے ہی اس کو ظہیر کے لیے پسند کیا تھا اور یہ کہ میں تو اس کو ہمیشہ سے ہی پسند کرتی رہی ہوں۔

''لیکن رخسانہ نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں کانپ اٹھی، ان نظروں میں خوشی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان نظروں سے آگ نکل رہی ہو۔ اس کا چہرہ سیاہ ہو رہا تھا۔

''تمہیں مجھ سے تو پوچھنا چاہئے تھا کشور آپا.....!'' اس نے برہمی اور بیزاری کے ساتھ کہا۔ ''میری مرضی معلوم کئے بغیر تم نے کیسے اپنے بھائی کا رشتہ دے مارا؟''

''میں سناٹے میں آگئی، رخسانہ کا رویہ میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ رخسانہ اس بات کا اس قدر برا مانے گی۔

''تو.....تو.....کیا تم کو یہ بات پسند نہیں آئی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کشور آپا.....!'' اس نے صاف الفاظ میں جواب دیا۔ ''میں تمہارے بھائی کے ساتھ شادی نہیں کرسکتی، مجھے یہ رشتہ قبول نہیں ہے۔''

''مگر کیوں.....؟'' میں نے پوچھا۔ ''آخر کیا برائی ہے میرے بھائی میں؟''

''برائی کوئی نہیں ہے کشور آپا! مگر میں ظہیر کو پسند نہیں کرتی۔'' اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''میں کسی اور کو چاہتی ہوں۔''

''اس کی زبان سے یہ بات سن کر مجھ پر جیسے بجلی گر پڑی۔ وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی اور مجھے یا کسی اور کو اس کا علم ہی نہیں تھا۔

''میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس کو چاہتی ہے اور اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے وسیم کا نام بتایا۔ میں وسیم کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ وسیم میرے دور کے سسرالی رشتے داروں میں سے تھا اور میرے والدین کے گھر سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وسیم اور رخسانہ کے درمیان کب اور کس طرح دوستی شروع ہوگئی تھی۔ وسیم ایک دکان پر الیکٹریشن کا کام کرتا تھا۔ رخسانہ کا بجلی کے کسی کام کے سلسلے میں اس دکان پر آنا جانا شروع ہوگیا، ان دونوں کی واجبی سی واقفیت تو پہلے سے تھی پھر وہ رفتہ رفتہ گہری دوستی، پسند اور محبت میں بدل گئی۔ یہ سب کچھ مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا۔ اس وقت تو مجھے کانوں کان اس کی خبر نہیں تھی۔

''میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ میرے بھائی سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو اس رشتے سے انکار کر دے۔ یہ سن کر جیسے وہ پھٹ پڑی۔ ''کیا تم سمجھتی ہو کہ میرے والدین میری بات مان لیں گے؟'' اس نے غیظ و غضب کے عالم میں کہا۔ ''وہ ہرگز نہیں مانیں گے، وہ تمہارے والدین کو زبان دے چکے ہیں اور زبان دے کر وہ پلٹ نہیں سکتے۔''

اس کے بعد داستان بہت الجھی ہوئی لمبی اور پیچیدہ ہے، میں نے اپنی والدہ کو یہ بات بتادی لیکن انہوں نے اس کو چنداں اہمیت نہیں دی اور یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ جب بڑوں میں سب کچھ طے ہو چکا ہے تو اس قسم کی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بات رخسانہ کے والدین تک پہنچی تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ زبان دے چکے ہیں اور رخسانہ کی شادی وہیں ہوگی جہاں انہوں نے طے کردی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس دوران وسیم سے بھی میری کئی بار ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ رخسانہ کے عشق میں بالکل دیوانہ ہو رہا تھا اور جیسا کہ اس نے مجھے بتایا رخسانہ بھی اس کے لیے پاگل ہو رہی تھی۔ وسیم نے مجھے بتایا کہ رخسانہ اس حد تک تیار ہے کہ وہ دونوں چھپ کر شادی کر لیں اور پھر وہ اس کے ساتھ کہیں اور چلی جائے۔ وسیم نے میری رائے پوچھی۔ میں نے اس کو ایسا کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا اور یہ کہا کہ اگر رخسانہ نے ایسا کیا تو پھر وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ وسیم کی سمجھ میں بات آ گئی اور چند روز کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ اس نے رخسانہ کی اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور رخسانہ کو ان خدشات سے آگاہ کیا ہے جن کا اظہار میں نے کیا تھا۔ اس نے کہا کہ رخسانہ نے مجھ کو بہت برا بھلا کہا۔ میں نے اس کے جواب میں وسیم کو سمجھایا کہ یہ سارا عارضی جوش و خروش ہے اور ایک بار جب رخسانہ کی شادی ہو جائے گی تو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے وسیم کو پیشکش کی کہ میں اس کے لیے بھی کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کروں گی۔ وسیم نے کہا کہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔

''قصہ مختصر یہ کہ رخسانہ کی شادی میرے بھائی ظہیر کے ساتھ ہو گئی لیکن رخسانہ نے ظہیر کو دل سے کبھی بھی قبول نہیں کیا اور وہ مجھ سے بھی ساری عمر نفرت کرتی رہی کیونکہ اس کے خیال کے مطابق میں ہی اس شادی کی ذمہ دار تھی۔''

کشور پھوپھی بہت دیر سے بول رہی تھیں۔ وہ بولتے بولتے تھک گئیں اور ان دکھ بھری پرانی یادوں کے زخموں کو کریدنے سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ماریہ کچھ دیر تک ان کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرتی رہی اور جب وہ خاموش رہیں تو پھر وہ خود ہی بولی۔ ''اور وسیم.....؟ وسیم کا کیا ہوا؟''

''وسیم نے شادی نہیں کی۔'' کشور پھوپھی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''کچھ دنوں کے بعد اس نے کسی بحری جہاز پر نوکری کر لی اور جہاز کے ساتھ ہی پاکستان سے باہر چلا گیا۔ بس وہ دن اور آج کا دن.....! وہ جہاز کی نوکری سے ہی وابستہ ہے۔ اب تو بے چارہ بڈھا ہو گیا ہے۔ سال دو سال میں کبھی کراچی کا چکر لگاتا ہے ورنہ بس سمندروں، سمندروں گھومتا رہتا ہے۔''

ماریہ کے دماغ میں گولے سے پھٹ رہے تھے۔ اسے ان بہت سارے سوالات کے جوابات مل گئے تھے جو اس کے دماغ کو ہمیشہ پریشان کرتے رہے تھے اور کوئی بھی ان کا جواب دینے والا نہیں تھا۔

اماں کی شادی ابا کے ساتھ زبردستی کر دی گئی تھی جبکہ اماں کسی اور کو پسند کرتی تھیں اور اماں نے اس شخص کو زندگی بھر معاف نہیں کیا جس کے ساتھ زبردستی ان کی شادی کر دی گئی تھی اور انہوں نے اس کی بہن کو بھی کبھی معاف نہیں کیا جو ان کے خیال میں اس شادی کی ذمہ دار تھی۔

اماں نے ابا کو کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ ان کی کسی بھی چیز کو قبول نہیں کیا۔ ان کے بچوں تک کو قبول نہیں کیا۔ جنہوں نے خود ان کے بطن سے جنم لیا تھا۔ ان بچوں کا قصور یہ تھا کہ وہ ایک ایسے مرد کے تخلیق کردہ تھے جس سے اماں نفرت کرتی تھیں۔

اماں ساری زندگی جلتی جھلستی رہی تھیں اور اپنے تن بدن میں مسلسل بھڑکتی رہنے والی آگ میں اس سارے گھر کو اس گھر کے ایک ایک فرد کو جلاتی رہی تھیں جس کو انہوں نے کبھی بھی اپنا گھر نہیں سمجھا، انہوں نے ابا سے شادی تو کر لی اور ایک روایتی بیوی کی طرح زندگی بھر اپنے شوہر سے بھی وابستہ رہیں لیکن فی الحقیقت وہ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اپنے شوہر اور اس کے گھر سے وابستہ نہیں رہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو روایات کی بھینٹ چڑھا دیا، لیکن وہ ساری زندگی خود اپنے آپ سے اور دوسروں سے اس کا انتقام لیتی رہیں۔ انہوں نے اپنی اولاد تک کو نہیں بخشا۔

''ایک ہی جیسے حالات کا شکار ہو جانے والے لوگ ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہو سکتے ہیں اور زندگی کی جانب کتنے مختلف رویے اختیار کر سکتے ہیں۔'' ماریہ سوچ رہی تھی۔ ''میں اور نذیر ایک ہی جیسے حالات کا شکار رہے مگر میں نے اپنے آپ کو تباہ ہونے سے روکا، میں نے خود کو سنبھال لیا لیکن نذیر خود کو نہ سنبھال سکا، ہائے اماں..... تم نے کیا کر ڈالا۔''

''وسیم جب بھی کراچی آتا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے آتا تھا اور رخسانہ کے بارے میں بھی ضرور پوچھتا تھا۔'' کشور پھوپھی کہہ رہی تھیں۔ ''لیکن اس نے رخسانہ سے ملنے کی کوشش کبھی نہیں کی، جو کچھ ہو چکا تھا، اسے بدلا تو نہیں جا سکتا تھا۔''

ماریہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ذرا دیر تک خاموشی طاری رہی۔

''وہ چند روز پہلے ہی کراچی آیا ہے۔'' کشور پھوپھی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''اسے جب رخسانہ کی دردناک موت کی اطلاع ملی تو وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا اور پھر وہ خاص طور سے تم کو دیکھنے کے لیے آیا۔''

''مجھ کو دیکھنے کے لیے.....؟'' ماریہ نے کہا۔

''ہاں.....! اس کو معلوم تھا کہ رخسانہ کہ بیٹی کی شکل اپنی ماں سے بہت زیادہ ملتی ہے،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ تم کو دیکھنے آیا تھا کہ تمہاری شکل میں رخسانہ کی صورت دیکھ سکے۔''

اس رات ماریہ بہت بے چین رہی۔ اسے بمشکل ہی نیند آسکی۔ ویسے بھی ان دنوں اسے نیند بہت کم آتی تھی لیکن اس رات اماں کے عجیب وغریب اور ناقابل فہم رویئے کی اصل وجوہات جان لینے کے بعد اس کے صدموں میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

''اگر وسیم نے اماں کی بات مان لی ہوتی اور اماں کے گھر والوں کی مرضی کے خلاف اماں سے شادی کرلی ہوتی تو شاید کئی لوگ ساری زندگی دکھوں کی آگ میں جلنے سے بچ سکتے تھے۔'' ماریہ سوچ رہی تھی۔ ''یا شاید..... شاید کچھ اور دوسری نوعیت کے المیے نمودار ہو جاتے۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ خدا جانے کیا ہوتا۔''

لیکن جو ہونا تھا۔ وہ ہو چکا تھا۔ اس کا ماتم کرنے میں اب کچھ نہیں رکھا تھا۔ اب تو جو کچھ تھا۔ اس کے بارے میں سوچنا تھا۔ جو کچھ بچ رہا تھا۔ اس کو مزید برباد ہونے سے بچانا تھا۔

بیرسٹر فخرالدین انصاری نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح سے نذیر کی ضمانت ہو جائے، لیکن عدالت نے اس کی ضمانت کی درخواست مسترد کردی۔ وہ اپنی ماں کا قاتل تھا اور ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کرنے والے ضمانت پر رہا نہیں کیا جاسکتا تھا۔

تاہم بیرسٹر فخرالدین انصاری اور ماریہ کی مشترکہ کوششوں سے نذیر کو کافی دن تک ایک ایسے ہسپتال میں رہنے کا موقع ضرور مل گیا جہاں نشے کے عادی لوگوں کا علاج کیا جاتا تھا۔ ایک فلاحی تنظیم نے کافی مدد کی اور اخراجات وغیرہ اٹھائے۔ ماریہ کافی عرصے سے سماج کے ٹھکرائے ہوئے اور رہ گم کردہ انسانوں کے لیے فلاحی کام کرتی چلی آرہی تھی۔

نذیر میں ایک بہت بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی، اس سے پہلے بھی ماریہ نے کتنی بار اس کا علاج کروانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنی نشے کی عادت کو ترک نہیں کرسکتا تھا۔ وہ علاج میں تعاون بھی نہیں کرتا تھا لیکن اس بار اس کا علاج کارگر ثابت ہوا۔ اس نے واقعی نشہ چھوڑ دیا۔ ہسپتال میں اتنے دن رہنے کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اس نے ہیروئن کا استعمال ترک کردیا۔ شاید اس کا شدید احساس پشیمانی تھا کہ اس نے نشے کی طلب میں پاگل ہوکر اپنی ماں کو ہلاک کردیا تھا اور شاید اس احساس پشیمانی میں اس حقیقت کا ادراک بھی شامل تھا کہ جیل میں اسے ہیروئن نہیں مل سکے گی۔ صرف اس صورت میں ملے گی جب اس کی جیب میں بہت سے پیسے ہوں اور آپا شاید اس کو پیسے نہیں دیں گی اور پھر..... اب تو نہ جانے کب تک جیل میں رہنا ہو گا۔ شاید عمر بھر..... نذیر نے ہسپتال کے علاج سے فائدہ اٹھایا اور ہیروئن ترک کردی۔

وہ اب جیل میں تھا۔ اس کے چہرے سے ہنسی ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکی تھی۔ اس

کے چہرے پر کچھ ہی دنوں میں اتنی بہت سی لکیریں نمودار ہوگئی تھیں کہ اس کی شکل مسخ ہوکر رہ گئی تھی۔ ماریہ جب اس سے ملنے کے لیے آتی تو وہ اس سے بہت ہی کم بات کرتا تھا۔ ماریہ بھی اس سے زیادہ بات نہیں کرتی تھیں۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے ان دونوں کے پاس ایک دوسرے سے کہنے سننے کے لیے کچھ زیادہ نہیں بچا ہے۔ ماریہ اس سے کیس کے بارے میں ہی کچھ ضروری گفتگو کرلیتی تھی۔

نذیر کے مقدمے کا آغاز ہوگیا اور تقریباً ایک سال تک سماعت جاری رہنے کے بعد عدالت نے اس کو دس سال قید بامشقت کی سزا سنادی۔ وکلاء کی کوششوں نے اس کو اس سے زیادہ بڑی سزا سے بچایا تھا۔ عدالت نے اس کے ساتھ یہ رعایت اس وجہ سے کی کیونکہ اس سے یہ جرم ایک خاص قسم کی ذہنی کیفیت کے دوران سرزد ہوا تھا جو اس کی بیمار اور مریضانہ شخصیت کی پیداوار تھی۔

عدالت کا فیصلہ سننے کے بعد نذیر نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ شاید اسے اس سے زیادہ کی توقع تھی اور وہ اس سے زیادہ کے لیے تیار بھی تھا۔ البتہ اس کے چہرے کے مسخ شدہ خدوخال کچھ اور زیادہ مسخ شدہ نظر آنے لگے۔

ماریہ اور بیرسٹر فخرالدین نے ہائیکورٹ میں اپیل نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپیل کی صورت میں سزا پر نظر ثانی ہوکر اس میں اضافہ بھی ہوسکتا تھا۔

نذیر کو اب ایک طویل عرصہ جیل میں گزارنا تھا اور ماریہ کے لیے زندگی کچھ اور بھی زیادہ بے کیف ہوگئی تھی، تاہم اس کشمکش کی کیفیت سے اسے نجات مل گئی تھی جس کا وہ اس تمام عرصے میں شکار رہی تھی۔ مقدمے کا بالآخر فیصلہ ہوگیا تھا۔

ماریہ کی مصروفیات کا دائرہ اب زیادہ سے زیادہ قانونی اور فلاحی سرگرمیوں تک پھیلتا چلا جارہا تھا۔ وہ ایسے لوگوں کی مختلف طریقوں سے مدد کرتی تھی جو طرح طرح کے ذہنی اور نفسیاتی مسائل سے دوچار ہوتے تھے اور انہیں قانونی امداد بھی فراہم کرتی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد اس نے بیرسٹر فخرالدین کی لاء فرم کو چھوڑ دیا اور اپنا علیحدہ کام شروع کردیا۔ اس نے اپنا الگ آفس بنالیا اور مکمل طور پر اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے لگی۔ کام جتنا زیادہ بڑھتا اور پھیلتا جاتا تھا۔ اتنا ہی زیادہ وہ خود کو اس کے لیے وقف کرتی جاتی تھی۔

نذیر جیل میں زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ اسے سزا کاٹتے ہوئے ایک سال سے کچھ زیادہ کا عرصہ ہوگیا تھا۔ ماریہ مہینے میں ایک دو بار اس سے ملنے کے لیے چلی جایا کرتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس روز جب وہ اس سے ملنے کے لیے گئی تھی تو اس کے ذہن میں کہیں بھی یہ خیال موجود نہیں تھا کہ یہ اس کی نذیر سے آخری ملاقات ہوگی۔ نذیر اس دن بہت ہی زیادہ اداس اور پریشان لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری ہو کر جیسے بالکل پتھر کا ہو گیا تھا۔ ماریہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ماریہ اس کے لیے کچھ چیزیں لے کر گئی تھی جو اسے دے دی گئی تھیں۔

اس کے بعد بمشکل ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ جیل کے ایک افسر نے اس کو فون پر اطلاع دی کہ نذیر اچانک بہت بیمار ہو گیا ہے اور اس کو ہنگامی طور پر ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ جیل کا وہ افسر ماریہ کو بخوبی جانتا تھا اور اس کے مداحوں میں سے تھا۔

ماریہ، نذیر کو دیکھنے کے لیے ہسپتال پہنچی تو اس نے نذیر کو آئی سی یو میں تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں پایا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کے گردوں نے کام کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے اور اس کے بچنے کی اب کوئی امید نہیں ہے۔

اس کے دو دن کے بعد نذیر کا ہسپتال میں ہی انتقال ہو گیا اور یوں وہ قید سے رہا ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کی قید سے بھی رہا ہو گیا۔

ماریہ تو اس بات سے بڑی حد تک مطمئن تھی کہ نذیر نے نشہ ترک کر دیا ہے اور اسے امید تھی کہ کسی نہ کسی دن جب وہ رہا ہو کر جیل سے باہر آئے گا تو پھر وہ ایک نئی زندگی شروع کر سکے گا۔ اگرچہ تب تک وہ اپنی عمر کا خاصا بڑا حصہ گزار چکا ہوگا۔ تاہم بہت کچھ باقی ہوگا، آدمی عمر کے کسی بھی مرحلے پر ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکتا ہے۔ شاید زندگی اس پر کچھ مہربان ہو جائے لیکن زندگی تو ماریہ کے خاندان کے کسی بھی فرد پر مہربان نہیں رہی تھی۔

نذیر کی موت کے بعد ماریہ کو اس جیسے انسانوں سے اور بھی زیادہ ہمدردی پیدا ہو گئی جو ایسے ہی حالات کا شکار ہوئے تھے اور وہ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ خدمات انجام دینے لگی۔ اس نے اپنے خاندان کو ذہنی مریضوں کا خاندان پایا تھا اور وہ ایسے لوگوں کے حالات کو بہت اچھی طرح سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

ماریہ کو اپنے بھائی سے آخری ملاقات کا منظر آج بھی پوری تفصیل کے ساتھ یاد تھا۔ وہ پتھریلا، سخت نقوش والا چہرہ، تھکی ہوئی گدی گدلی سی آنکھیں، ہونٹوں سے کم سے کم نکلتے ہوئے الفاظ..... سب کچھ ویسا ہی تھا..... ویسا ہی تھا..... جیسے.....

اچانک فون کی گھنٹی بجنے سے اس کے خیالات کی وہ رو منقطع ہو گئی جس میں وہ اتنی دیر سے بہہ رہی تھی اور جو اسے بھولی بسری برباد شدہ دنیا کے اجڑے ہوئے گلی کوچوں کی

خاک چھنوا کر آ گئی جہاں سے اس کا رابطہ کچھ دیر پہلے ٹوٹ گیا تھا۔

فون کی گھنٹی زور سے بج رہی تھی، اس نے جلدی سے فون اٹھا لیا۔

''ہیلو..... ماریہ اسپیکنگ.....!'' اس نے جلدی سے کہا۔

''ہاں ماریہ.....!'' دوسری سے جانی پہچانی آواز بلند ہوئی۔ ڈی ایس پی غلام نبی فون پر اس سے مخاطب تھا۔ ''تم نے آج پھر فرید سے جیل میں ملاقات کی ہوگی۔ کیا کوئی خاص خبر ہے؟''

''نہیں سر.....!'' ماریہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی خاص خبر نہیں ہے سر.....! اس کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، وہ اپنے بارے میں کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے ماریہ.....!'' ڈی ایس پی غلام نبی نے کہا۔ ''پھر ہم آج شام کی میٹنگ میں اس کے بارے میں تفصیل سے صورت حال کا جائزہ لیں گے۔ کوئی نہ کوئی راہ تو نکالنی ہوگی۔''

''جی ہاں سر.....!'' ماریہ نے جواب دیا۔ ''میں میٹنگ میں آؤں گی تو پھر ہم تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔'' اور اس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔

''کتنی مماثلت تھی دونوں چہروں میں..... ماریہ گہرائی میں ڈوب کر سوچ رہی تھی۔ اسے اپنے مرحوم بھائی کا وہ چہرہ اچھی طرح یاد تھا جو اس نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ آخری بار اس سے ملاقات کے لیے جیل گئی تھی۔ پتھر جیسا بے جان۔ کرخت، بے روح چہرہ، جس پر نرمی، ملائمت، شگفتگی اور تازگی کے دور دور تک کوئی آثار نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اس چہرے کے اندر سے ساری روح، ساری زندگی نچوڑ لی ہو۔ وہ چہرہ اسے آج تک یاد تھا اور ایسا ہی ایک چہرہ اس نے پھر دیکھا تھا اور اس چہرے کو بھی نے اس جیل میں ہی دیکھا تھا۔ یہ بھی ایک قاتل کا چہرہ تھا۔ ایک ایسے قاتل کا چہرہ جس نے ایک بے گناہ انسان کو بلا کسی جواز کے قتل کر دیا تھا۔ یہ بھی ایک کرخت نقوش اور مسخ شدہ خدوخال والا بے روح اور پتھریلا چہرہ تھا۔ وہ فرید کے ساتھ گفتگو کے دوران جتنی دیر تک اس چہرے کو دیکھتی رہی تھی۔ اسے اپنے مرحوم بھائی کا چہرہ یاد آتا رہا تھا جسے خاک کا پیوند بنے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔

''شاید ان سب لوگوں کے چہرے اپنے تمام تر فرق کے باوجود ایک ہی جیسے ہو جاتے ہیں جو کسی شدید اندرونی عذاب سے دوچار ہوتے ہیں۔'' ماریہ نے سوچا۔ ''یہ ایسے چہرے ہوتے ہیں جنہیں اندر کی آگ جھلسا کر مسخ کر دیتی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ سہ پہر تک دفتر میں رہی اور مختلف کاموں میں مصروف رہی۔ کئی کیس تھے جو اس کی خصوصی توجہ کے طلبگار تھے۔ ایک بیوہ عورت کا کیس تھا جس کا شوہر اس کے اور اس کے بچوں کے لیے اچھے خاصے اثاثے چھوڑ کر مرا تھا لیکن اس عورت کے سسرال والے جن میں سب سے زیادہ پیش پیش اس کا بڈھا کچھتر سالہ سسر تھا اس سے سب کچھ چھین لینا چاہتے تھے۔ بڈھا اس سال تیسری بار حج کر کے واپس آیا تھا اور اس کی پیشانی سجدوں کے نشان سے سجی ہوئی تھی۔ ماریہ نے گزشتہ پیشی کے موقع پر اس بڈھے سے نفرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو، لیکن بیواؤں اور یتیموں کا مال کھانے سے باز نہیں آتے۔''

بڈھے نے اس کو بڑی خونخوار نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر اس بنگلہ دیشی لڑکی کا کیس تھا جس سے ایک شخص نے نکاح کرنے کے کچھ عرصے کے بعد اسے تین طلاقیں دے دی تھیں اور اسے بدکاری پر مجبور کرتا تھا۔ عورت کے احتجاج اور مزاحمت پر اس نے اس کے خلاف تھانے میں حدود آرڈیننس کے تحت کیس درج کروا کے اسے گرفتار کروا دیا تھا اور اب وہ عورت جیل میں تھی۔ عورتوں کے اس دلال نے حال ہی میں ایک اور افغانی لڑکی سے نکاح کر لیا تھا۔

کتنے انسان تھے اور کتنے مسائل تھے۔ دیکھتے دیکھتے اور پڑھتے پڑھتے آنکھیں جلنے لگتی تھیں اور سنتے سنتے کان پک جاتے تھے لیکن صدمات سے گھرے ہوئے انسانوں کا سیلاب تھا کہ ہر طرف سے امڈتا چلا آتا تھا۔ ماریہ کے شب و روز اس سیلاب کی تیز و تند موجوں کے ساتھ نبرد آزمائی کرتے ہوئے گزرتے تھے۔

وہ مقررہ وقت پر میٹنگ میں پہنچ گئی۔ وقت کے تھوڑے بہت فرق سے سبھی لوگ آن پہنچے۔ ڈی ایس پی غلام نبی۔ ایس آئی اشرف علی۔ ایس آئی خالدہ مکرم اور اے ایس آئی جواد حسین اور ماریہ خود..... وہ سارے لوگ موجود تھے جو کسی نہ کسی شکل میں اس کیس کی تفتیش سے وابستہ تھے۔

ماریہ آج ایک بار پھر فرید سے مل کر آئی تھی اور پہلی بار کی طرح اس بار بھی اس کو ناکامی ہوئی تھی۔ فرید کسی طرح کے تعاون کے لیے تیار نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں یا اپنے جرم کی وجہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

''یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ ملزم کا مقتول سے براہِ راست کوئی جھگڑا نہیں تھا اور نہ ہی دشمنی کی کوئی اچانک وجہ پیدا ہو گئی تھی۔'' ڈی ایس پی غلام نبی نے کہنا شروع کیا۔ ''اب

اس امر کا امکان ہو سکتا ہے کہ ملزم اور مقتول کے بزرگوں میں شاید کبھی کوئی تنازع رہا ہو یا اس قسم کی کوئی بات.....!''

''جی ہاں سر!'' اشرف علی نے فوراً جواب دیا۔ ''آپ کا یہ خیال صحیح ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم نے مقتول کے بارے میں جو تفصیلی تفتیش کی ہے۔ اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ مقتول جب ایک چھوٹا بچہ تھا تب وہ اپنے والدین کے ساتھ پنجاب کے کسی شہر سے کراچی آیا تھا۔ مقتول کراچی میں ہی پلا بڑھا اور اس کی شادی زرینہ سے ہوئی جو اردو بولنے والے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔''

''یہ ایک بہت اہم نکتہ ہے۔'' ایس آئی خالدہ مکرم نے کہا۔ ''مقتول کا تعلق پنجاب کے کسی شہر سے ہے اور خود قاتل بھی پنجاب کے شہر چکوال سے تعلق رکھتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ان دونوں خاندانوں کا تعلق پنجاب کے کسی ایک ہی علاقے سے ہو اور وہاں ان لوگوں کا کوئی دیرینہ تنازع موجود ہو۔''

''ہاں.....!'' جواد حسین نے رائے دی۔ ''اس راہ میں روشنی کی ایک کرن دکھائی دینے لگی ہے۔ شاید کچھ اور حقائق کا بھی پتہ چل جائے۔''

''تو اب تمہیں ہی یہ کام کرنا ہے۔'' غلام نبی نے جواد حسین سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''مقتول کے بارے میں یہ معلوم کرو کہ وہ پنجاب کے کون سے شہر کا رہنے والا تھا اور اس کے خاندان کے کون کون سے لوگ پنجاب میں اس وقت کہاں کہاں آباد ہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں ضروری معلومات چاہئیں۔''

''میرے خیال میں اس معاملے میں سب سے زیادہ صحیح معلومات ہمیں زرینہ فراہم کر سکے گی۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''اس سلسلے میں سب سے پہلے تو زرینہ سے پوچھ گچھ کی جانی چاہئے۔''

''بالکل صحیح بات ہے۔'' ڈی ایس پی غلام نبی نے کہا۔ ''سب سے پہلے زرینہ سے سوچھ گچھ ہونی چاہئے اور اب تم براہِ راست زرینہ کے پاس جا سکتی ہو۔''

''ٹھیک ہے سر.....!'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''میں اور ماریہ براہِ راست زرینہ کے پاس جائیں گے اور اس سے بات کریں گے۔ اگر ضرورت ہوئی تو بعد میں محلے والوں سے بھی مزید تفتیش کی جا سکتی ہے۔''

☆======☆=:=====☆

زرینہ نے دستک کے جواب میں دروازہ کھولا تو وہاں دو عورتوں کو کھڑے پایا۔ ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سے ایک پولیس کی وردی میں تھی۔

زرینہ پولیس والیوں کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ اسے زبیدہ کی کہی ہوئی ساری باتیں یاد آ گئیں۔ کیا پولیس اس کے خلاف کوئی جھوٹا کیس بنانے جا رہی تھی۔

''تم زرینہ ہو نا.....؟'' وردی والی سن رسیدہ عورت نے زرینہ سے پوچھا۔ ''حیدر علی کی بیوہ.....؟''

''جی ہاں.....!'' زرینہ نے سہم کر جواب دیا۔ ''میں زرینہ ہوں۔''

''تم سے تمہارے مرحوم شوہر کے بارے میں کچھ سوالات کرنا ہیں۔'' وردی والی نے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیں مرحوم کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہیں۔ میں ایس آئی خالدہ مکرم ہوں اور یہ ماریہ ہیں..... کیا ہم اندر بیٹھ کر کچھ دیر بات کر سکتے ہیں؟''

''آیئے.....!'' زرینہ نے خوف اور نیم دلی کے ساتھ کہا۔ وہ دونوں اندر آ گئیں زرینہ نے انہیں ایک کمرے میں بٹھایا۔

''یہ بتاؤ زرینہ کہ تمہارے میاں کا تعلق پنجاب کے کس شہر سے تھا؟'' خالدہ مکرم نے فوراً ہی براہِ راست سوال کر دیا۔

''چکوال سے.....!'' زرینہ نے جواب دینے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا۔

''چکوال!'' خالدہ مکرم نے اپنے زبردست ہیجان واضطراب پر پوری طرح قابو پاتے ہوئے سرسری انداز میں اس نام کو دہرایا۔ ماریہ نے بھی اپنے آپ کو بالکل پُرسکون رکھا۔

''جی ہاں، چکوال!'' زرینہ نے دہرایا۔

''پنجاب میں کوئی چھوٹا شہر ہے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''تم کتنی بار چکوال گئی ہو؟''

''ہاں، میں؟ جی نہیں۔'' زرینہ نے جواب دیا۔ ''میں کبھی آج تک چکوال نہیں گئی۔''

''حیرت ہے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''تمہاری سسرال چکوال میں تھی اور تم کبھی ایک بار بھی چکوال نہیں گئیں؟''

''نہیں انسپکٹر صاحبہ۔'' زرینہ نے کہا۔ ''میری سسرال چکوال میں نہیں تھی۔ میری سسرال تو یہیں کراچی میں تھی اور میرے ساس سسر یہیں رہتے تھے۔ میرے سسر کا نام صفدر علی اور ساس کا نام صابرہ تھا۔ میرے میاں تو بہت چھوٹی عمر کے تھے جب وہ لوگ پنجاب سے کراچی آ گئے تھے اور پھر وہ لوگ یہیں کے ہو رہے اور اب تو حیدر علی کے والدین زندہ بھی نہیں ہے۔ باپ کا انتقال تو ہماری شادی کے دو سال بعد ہی ہو گیا تھا اور ماں کا انتقال

ابھی کوئی دو سال پہلے ہوا۔''

''.....حیدر علی کے والدین تو کبھی چکوال جاتے ہوں گے؟'' خالدہ مکرم نے پوچھا۔

''میرے سامنے تو کبھی نہیں گئے۔'' زرینہ نے کہا۔ ''یعنی..... مطلب یہ ہے کہ جب سے میری شادی ہوئی، اس کے بعد سے وہ کبھی بھی کراچی سے باہر نہیں گئے، لیکن شاید اس سے پہلے کبھی وہ دونوں میاں بیوی ایک آدھ بار گئے تھے۔ مجھے اس کے بارے میں ٹھیک سے کچھ نہیں معلوم، لیکن میرے میاں بھی کبھی وہاں نہیں گئے تھے۔''

''انسان جس جگہ کا رہنے والا ہوتا ہے، اس جگہ سے تو اسے بہت محبت ہوتی ہے اور وہ وہاں بار بار جانے کی کوشش کرتا ہے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''ایسا کیونکر ہوا کہ تمہارے ساس سسر نے اپنے آبائی شہر کو ہی فراموش کر دیا؟''

''میں..... میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں؟'' زرینہ نے کچھ الجھتے ہوئے کہا۔ ''ان لوگوں کے لیے تو کراچی ہی سب کچھ تھا۔ میں نے تو ان کو ہمیشہ کراچی سے ہی بندھا ہوا پایا۔''

''اچھا..... ان کے اور عزیز رشتے دار وغیرہ تو چکوال میں ہوں گے؟'' ماریہ نے پوچھا۔ ''تم ان کے بارے میں تو کچھ جانتی ہو گی۔ کبھی وہاں سے کوئی رشتے دار آتا ہو گا..... ان لوگوں سے ملنے کے لیے؟''

''میرے سامنے تو کبھی کوئی نہیں آیا۔'' زرینہ نے کہا۔ ''شاید اس سے پہلے کبھی کوئی آیا ہو۔ مجھے نہیں معلوم..... میرے سسر کبھی کبھار اپنے کسی بھائی کا ذکر کرتے تھے۔ مظفر علی نام تھا ان کا..... لیکن وہ ان کا ذکر کچھ اچھے الفاظ میں نہیں کرتے تھے۔ شاید دونوں بھائیوں میں کوئی نااتفاقی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں معلوم البتہ ایک خالہ شکوراں تھیں جو ان لوگوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ وہ چکوال سے ہی آئی تھیں اور پھر واپس چلی گئیں..... لیکن آپ لوگ اس بارے میں اتنے زیادہ سوالات کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''تم جانتی ہو کہ قتل کا معاملہ کوئی معمولی معاملہ تو نہیں ہوتا۔'' ماریہ نے کہا۔ ''قتل تو سب سے زیادہ سنگین جرم ہے اور اس کی تفتیش پوری توجہ اور ذمہ داری کے ساتھ کرنی پڑتی ہے۔ ہم ابھی تک یہ نہیں جان پائے ہیں کہ فرید نے حیدر علی کو کیوں قتل کیا اور ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے۔ اسی لیے ہم مقتول کے خاندان کے بارے میں بھی جاننا چاہتے ہیں کہ شاید یہ کسی پرانی خاندانی دشمنی کا نتیجہ ہو..... اور یہ خالہ شکوراں کون تھیں؟ ان کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''خالہ شکوراں ان لوگوں کے ساتھ پنجاب سے آئی تھیں اور ایک لمبی مدت تک ان کے ساتھ کراچی میں رہی تھیں۔ پھر جب میری شادی ہوئی تو وہ واپس چکوال چلی گئی تھیں۔ میں نے تو ان کو زیادہ دیکھا بھی نہیں اور میں ان کے بارے میں بہت ہی کم جانتی ہوں۔''

''وہ خالہ شکوراں اب کہاں ہیں؟'' خالدہ مکرم نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' زرینہ نے کہا۔ ''شاید چکوال میں ہی ہوں..... یہاں سے جانے کے بعد پھر وہ کبھی نہیں آئیں۔''

''تمہارے ایک جیٹھ بھی تو ہیں، اکبر علی؟'' خالدہ مکرم نے پوچھا۔

''جی ہاں..... ہیں۔'' زرینہ نے جواب دیا۔ ''وہ حیدر آباد میں رہتے ہیں۔ میرے میاں سے ایک سال بڑے ہیں۔ شاید انہیں اپنے خاندان والوں کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم ہو..... میں تو اس خاندان کی نہیں ہوں۔''

''ان سے بھی مل لیں گے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''اچھا کوئی اور بات جو تمہیں یاد آرہی ہو؟ اپنے سسرال والوں کے خاندان کے بارے میں؟''

''میں نے تو بس اپنے ساس سسر کو دیکھا اور اپنے جیٹھ کو دیکھا۔'' زرینہ نے کہا۔ ''شکوراں خالہ کو دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہے۔ ان کے علاوہ میں اپنے کسی سسرالی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔''

''ٹھیک ہے زرینہ۔'' خالدہ مکرم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہم تمہاری مدد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ تمہارے بے گناہ شوہر کے قتل کی اصل وجہ معلوم ہو جائے۔ آخر فرید کو تمہارے میاں سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟''

''مجھے تو وہ پاگل معلوم ہوتا ہے انسپکٹر صاحبہ۔'' زرینہ نے کہا۔ ''میرے میاں کی تو کبھی کسی سے کوئی دشمنی نہیں رہی۔ ارے ان کا تو کبھی کسی سے معمولی سا جھگڑا بھی نہیں ہوا۔ وہ تو ہر ایک کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اس پاگل کے بچے نے معلوم نہیں کیوں ان کو مار دیا۔'' اس کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

''صبر کرو زرینہ۔'' خالدہ مکرم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ البتہ انصاف ضرور حاصل کیا جا سکتا ہے۔''

وہ دونوں وہاں سے چلی آئیں۔

انہوں نے جان بوجھ کر زرینہ کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ انہیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فرید کا تعلق بھی چکوال سے ہے۔ اس بات کا انکشاف کرنا ابھی قبل از وقت تھا۔

ادھر زرینہ یہ سوچ رہی تھی کہ ان دونوں پولیس والیوں نے اس سے اس شبہ کا اظہار نہیں کیا جس کے بارے میں زبیدہ کے ذریعے کہلوایا گیا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ بات اب پوری طرح سے ختم ہو چکی ہے۔ ویسے بھی قاتل اور مقتول کی عمروں میں کافی فرق تھا۔ حیدر علی تو ابھی نوجوان تھا جبکہ قاتل درمیانہ عمر کا آدمی تھا۔

''یہ ایک اہم انکشاف ہے کہ مقتول کے خاندان کا تعلق بھی چکوال ہی سے ہے۔'' راستے میں خالدہ مکرم نے ماریہ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ان دونوں خاندانوں کے درمیان ضرور کوئی ربط رہا ہوگا اور وہ ربط کسی دیرینہ دشمنی کا نتیجہ ہوگا۔''

''جی ہاں۔'' ماریہ نے کہا۔ ''ہمارے دیہی معاشرے میں انسانی زندگی ایک بے قیمت شے ہے۔ جان لے لینا اور جان دے دینا ایک معمولی بات ہے۔ یہ معاشرہ ابھی مثبت انسانی قدروں سے بہت دور ہے۔ دشمنیوں کی پرورش اس طرح کی جاتی ہے جیسے جان سے پیاری اولادوں کی پرورش، اور پھر ان اولادوں کی اولادوں کی پرورش کی جاتی ہے۔ نسلیں کی نسلیں لڑتے ہوئے ایک دوسرے کو قتل کرتے ہوئے گزر جاتی ہیں اور پھر یہاں تک ہوتا ہے کہ دشمنی کی اصل وجہ اتنی پرانی ہو جاتی ہے کہ لوگ اس کو بھول جاتے ہیں، مگر دشمنی پھر بھی جاری رہتی ہے۔''

''اور معمولی معمولی باتوں پر قتل کر دینا اس لائف اسٹائل کا ایک حصہ ہے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''حتیٰ کہ بہت سے تعلیم یافتہ لوگ بھی ذہنی پسماندگی کا شکار ہوتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو ان بندھنوں سے چھڑا نہیں پاتے۔ کیسے کیسے عجیب و غریب واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔''

''یہ ذہنی مریض فرید بھی ایسی ہی کسی کیفیت کا شکار معلوم ہوتا ہے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''میں نے ایسے کئی ذہنی مریضوں کو دیکھا ہے جنہوں نے کسی شخص کے جرم کا بدلہ اس کے کسی ایسے عزیز یا رشتے دار سے لیا جس کا اس جرم سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا اور یہ لوگ اس بات سے خوش اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے بدلہ لے لیا ہے۔ حالانکہ یہ سراسر وحشت اور درندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔''

خالدہ مکرم نے فون پر ہی ڈی ایس پی غلام نبی کو زرینہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو کی اطلاع دے دی۔ اگلے دن ان لوگوں کی اس سلسلے میں پھر ایک میٹنگ ہوئی۔

''بہت دلچسپ بات ہے۔'' خالدہ مکرم اور ماریہ کی زبانی زرینہ سے ہونے والی ملاقات کی تفصیلات سننے کے بعد غلام نبی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم لوگ کچھ کچھ کامیابی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اتنا تو معلوم ہو گیا ہے کہ قاتل اور مقتول، دونوں ہی کے خاندانوں کا تعلق چکوال سے ہے اور اب حیدر آباد جا کر مقتول کے بڑے بھائی اکبر علی سے بات چیت کرنی ہوگی۔''

''اکبر علی سے میں نے اس سے پہلے خاصی پوچھ گچھ کی تھی جب وہ اپنے بھائی کی موت پر کراچی آیا تھا۔'' جواد حسین نے کہا۔ ''اور میں نے بار بار زور دے کر اس سے پوچھا تھا کہ اس کے بھائی کی کسی سے دشمنی وغیرہ تو نہیں تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی، تاہم اس وقت میں نے اس سے اس کے پرانے خاندانی حالات کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ کیونکہ اس کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی تھی۔''

''ہاں، لیکن اب ضرورت ہے۔'' غلام نبی نے کہا۔ ''تم اس سے مل چکے ہو۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم حیدر آباد جاؤ اور اس سے ملاقات کر کے حالات معلوم کرو۔ یہ بات خاصی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ مقتول کا خاندان ایک طویل عرصہ پہلے چکوال سے جب کراچی آیا تو پھر اس خاندان نے چکوال سے سارے ہی رشتے ختم کر لیے اور یہ لوگ شاید دوبارہ وہاں نہیں گئے۔ کراچی میں ہزاروں لاکھوں خاندان ایسے آباد ہیں جو ایک دو نسل پہلے ملک کے کسی دوسرے حصے سے آ کر یہاں بس گئے تھے، لیکن ان کا کچھ نہ کچھ تعلق تو اپنے اصل گھروں سے رہتا ہی ہے۔''

''میں کل ہی حیدر آباد چلا جاؤں گا سر!'' اے ایس آئی جواد حسین نے کہا۔

''ایک محرر کو اپنے ساتھ لے جاؤ تا کہ وہ اکبر علی کا بیان قلم بند کر لے۔'' غلام نبی نے کہا۔ ''وہاں کے متعلقہ مقامی تھانے سے بھی مدد لے لینا۔ اگر اس کی ضرورت ہو تو.....''

''ٹھیک ہے سر۔'' جواد حسین نے کہا۔

اگلے دن جواد حسین علی الصباح ہی روانہ ہو گیا۔ اکبر علی کا پتہ اس کے پاس پہلے سے ہی موجود تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا، اس کا نام کریم تھا۔ کسی کو گرفتار تو کرنا نہیں تھا۔ اس لیے زیادہ لوگوں کی ضرورت نہیں تھی۔

یہ دونوں حیدر آباد پہنچ گئے اور وہاں انہیں اکبر علی کا گھر تلاش کرنے میں کوئی وقت نہیں ہوئی۔ وہ لوگ بالکل ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے۔

گھر کے دروازے پر دی جانے والی دستک کے جواب میں ایک نوعمر لڑکے نے دروازہ کھولا۔ جواد حسین نے اس سے کہا کہ وہ اکبر علی سے ملنا چاہتا ہے۔

''صاحب تو بہت بیمار ہیں اور ہسپتال میں داخل ہیں۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

''اچھا؟'' جواد حسین نے کہا۔ ''اور تم کون ہو؟''

''میرا نام شبیر ہے اور میں یہاں صاحب کے گھر میں کام کرتا ہوں۔'' لڑکے نے کہا۔

''اچھا..... گھر میں اس وقت اور کون ہے؟'' جواد حسین نے پوچھا۔

''کوئی بھی نہیں ہے۔'' شبیر نے جواب دیا۔ ''بیگم صاحبہ بھی ہسپتال میں صاحب کے پاس ہیں۔''

''ٹھیک ہے، پھر ہم ہسپتال جاتے ہیں۔'' جواد حسین نے کہا۔ ''وہیں مل لیں گے۔ ہسپتال کا نام بتاؤ۔''

شبیر نے ہسپتال کا نام وغیرہ بتا دیا اور جواد حسین اور کریم وہاں سے روانہ ہو کر ہسپتال پہنچے۔

اکبر علی ایک بڑے ہسپتال کے ایک پرائیویٹ کمرے میں تھا۔ اس کی بیوی شمسہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ پولیس والوں کو دیکھ کر سخت پریشان ہو گئی۔

''گھبرائیے نہیں۔'' جواد حسین نے اسے تسلی دی۔ ''آپ کو تو معلوم ہو گا کہ کراچی میں ان کے بھائی کا قتل ہو گیا تھا۔ ہم لوگ اسی سلسلے میں ان سے کچھ معلومات حاصل کرنے آئے تھے مگر.....''

''وہ تو کچھ بول بھی نہیں سکتے۔'' شمسہ نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔ ''کل ہی ان پر اچانک فالج کا حملہ ہوا۔ آدھا حصہ بیکار ہو گیا اور زبان بھی بالکل بند ہو گئی۔ ہم لوگ انہیں اسی وقت ہسپتال لے آئے لیکن ابھی تک حالت ویسی ہی ہے۔''

جواد حسین نے اکبر علی کو دیکھا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت بستر پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور پتلیاں بھی اِدھر اُدھر حرکت کر رہی تھیں اور جواد حسین کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک سوالیہ رنگ بھی ابھرا تھا، لیکن اس کی زبان بند تھی۔ وہ کچھ نہیں بول رہا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔'' جواد حسین نے شمسہ کو تسلی دی۔ ''انشاء اللہ یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہم ان سے بعد میں بات کر لیں گے۔''

''آپ لوگ ان سے کیا معلوم کرنا چاہتے تھے؟'' شمسہ پوچھے بغیر رہ نہ سکی۔

''ہم ان سے چکوال میں ان کے خاندان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔'' جواد حسین نے کہا۔ ''کیا آپ اس سلسلے میں ہمیں کچھ بتا سکتی ہیں؟ چکوال میں ان کے رشتے داروں کے بارے میں؟''

''نہیں۔'' شمسہ نے جواب دیا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کوئی خالہ شکوراں تھیں جو آپ کے ساس سسر کے ساتھ چکوال سے آئی تھیں اور ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں؟'' جواد حسین نے موقع غنیمت جان کر پوچھ لیا۔

''میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ میرے شوہر شادی سے بہت عرصہ پہلے ہی حیدر آباد منتقل ہو گئے تھے اور یہاں انہوں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ میرے والدین بھی حیدر آباد میں رہتے تھے۔ یہیں ہماری شادی ہو گئی۔ میرے ساس سسر اس شادی سے کوئی خاص خوش نہیں تھے۔ شادی میں بھی وہ لوگ بس زبردستی ہی شریک ہو گئے تھے۔ میں کبھی ان کے ساتھ نہیں رہی۔ کبھی کبھار دو چار دن کے لئے کراچی چلی جایا کرتی تھی۔ میں ان کے خاندان کے دوسرے لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ دعا کیجئے کہ میرے میاں جلد از جلد ٹھیک ہو جائیں۔ پھر وہ شاید آپ کو کچھ بتا سکیں۔''

''انشاءاللہ..... انشاءاللہ.....'' جواد حسین نے جلدی سے کہا۔ ''وہ ضرور ٹھیک ہو جائیں گے، خدا ان کو صحت عطا کرے گا۔''

مزید کہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اکبر علی کی بیوی کو کچھ نہیں معلوم تھا اور اکبر علی بولنے سے قاصر تھا۔

جواد حسین اپنے ساتھی کے ہمراہ اسی وقت واپس کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔ حیدر آباد جانا بالکل بیکار ثابت ہوا تھا۔

کراچی واپس آنے کے بعد ان سب لوگوں کی ایک اور میٹنگ ہوئی۔ جواد حسین نے اکبر علی کی بیماری کے بارے میں بتایا۔

''اب اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہ جاتا کہ چکوال جا کر وہاں تفتیش کی جائے اور حقائق معلوم کیے جائیں۔'' غلام نبی نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''اور یہ ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس مہم پر کافی خرچہ آئے گا۔ ہمیں کسی قاتل کی تلاش تو ہے نہیں، قاتل تو موجود ہے اور گرفتار ہے اور وہ اقبال جرم بھی کر چکا ہے۔ لہٰذا قانون کی نظر میں تو اب مزید کسی تفتیش کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اس میں اخراجات کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے شاید ہمیں اب سارے قصے کو ختم کر دینا پڑے گا۔ ملزم خود بھی کسی تعاون کے لیے آمادہ نہیں ہے۔''

''نہیں سر۔'' ماریہ نے کہا۔ ''ہمیں اس قصے کو ختم نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ہم نے اصل حقیقت کو پا لیا تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہو گی اور پیچیدہ ترین انسانی رویوں کے بارے میں ہمارے تجربات میں غیر معمولی اضافہ ہو گا۔ جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے تو میں ان کے

بندوبست کے لیے کوشش کروں گی۔ قیدیوں اور ذہنی مریضوں کی مدد کرنے والی فلاحی تنظیمیں اس معاملے میں ضرور ہماری مدد کریں گی۔ میں ان لوگوں سے بات کروں گی سر۔''

''ٹھیک ہے۔'' غلام نبی نے کہا۔ ''اگر اخراجات کا مسئلہ کسی طرح سے حل ہو جاتا ہے تو پھر ہم کام کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ اصل میں یہاں معاملے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اگر یہ کسی مجرم کی تلاش کا معاملہ ہوتا تو اس کے لیے فنڈز حاصل کیے جا سکتے تھے، لیکن ہمیں کسی مجرم کی تلاش نہیں ہے۔''

''درست ہے سر کہ ہمیں مجرم کی تلاش نہیں ہے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''اور پولیس کے عام نقطۂ نظر سے تو یہ کوئی کیس ہی نہیں ہے۔ اس میں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بس ملزم کو سیدھا لے جا کر عدالت میں کھڑا کر دینا چاہئے، لیکن انسانی نقطۂ نظر سے ایک بہت اہم اور غیر معمولی کیس ہے۔ میں اس سلسلے میں خود بھی ماریہ کی مدد کروں گی۔ بعض فلاحی تنظیموں سے رابطہ کروں گی۔''

''تم لوگ مل کر یہ کام کر لو۔'' غلام نبی نے کہا۔ ''اگر رقم کا بندوبست ہو جاتا ہے تو پھر تم اور ماریہ چکوال چلی جاؤ اور کسی کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں چکوال پولیس ہر معاملے میں تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہو گی۔ یہ سارا بندوبست میں کروا دوں گا اور پھر بھی اگر کوئی پریشانی ہو تو مجھے فون کرنا۔ میں یہاں سے سب کچھ ٹھیک کر دوں گا۔''

''سر۔ یہاں سے کوئی مرد ہمارے ساتھ نہیں جائے گا؟'' خالدہ مکرم نے پوچھا۔

''مرد؟'' غلام نبی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ارے بھئی، تم اکیلی ہی دس مردوں پر بھاری ہو۔ تم کو مرد کی مدد کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر..... تم کوئی ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ پولیس مقابلہ کرنے تو نہیں جا رہی ہو۔ خالص تفتیشی کام ہے۔ بہت امن اور سکون کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کم سے کم لوگ جائیں تاکہ اخراجات بھی کم سے کم ہوں۔''

ان لوگوں کی یہ میٹنگ ختم ہو گئی اور اس کے فوراً ہی بعد ماریہ اس مہم کے اخراجات کے لیے رقم کی فراہمی کے کام میں لگ گئی۔

ماریہ کو پہلے ہی یقین تھا کہ ایک سے زائد فلاحی تنظیمیں اس کی مدد کے لیے تیار ہو جائیں گی کیونکہ قیدیوں کی بھلائی اور ذہنی مریضوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والے کئی اداروں سے اس کے روابط تھے اور وہ ان کے لیے رضا کارانہ طور پر کام بھی کرتی تھیں۔

اس کا یقین غلط ثابت نہیں ہوا۔ کئی تنظیمیں اس ذہنی مریض قیدی کی مدد کے لیے فوری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طور پر تیار ہوگئیں جو اپنی مدد آپ کرنے سے یکسر گریزاں تھا اور اپنے آپ کو پھانسی پر لٹکوانے کے لیے بے چین تھا۔ کئی اداروں نے اس شخص کی عجیب وغریب داستان میں گہری دلچسپی لی اور اس کے مخفی اسرار کو منکشف کروانے میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔

چکوال جا کر کیا کرنا ہوگا اور کس طرح سے ان پرانے واقعات کی چھان بین کر کے حقائق تک پہنچنا ہوگا اور اس مہم پر کتنا خرچہ آئے گا، اس کا پہلے سے کوئی حتمی اندازہ قائم کرنا مشکل تھا۔ ایک مکمل بے یقینی کی سی فضا تھی۔ بس دو پرانے نام تھے جن کو بنیاد بنا کر ساری تفتیش کی عمارت کو کھڑا کرنا تھا۔ تاہم خالدہ مکرم ایک بہت ذہین اور باصلاحیت پولیس افسر تھی اور اسے اپنے اوپر اعتماد تھا کہ وہ ماریہ کی مدد سے کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور حاصل کر سکے گی۔ کسی بھی معاملے میں مقامی پولیس کی مدد تو ہر وقت حاصل کی جا سکتی تھی۔ غلام نبی نے سرکاری سطح پر اس کا بندوبست کر دیا تھا۔

چکوال ایک چھوٹی سی جگہ تھی اور خالدہ مکرم اور ماریہ دونوں ہی یہاں کبھی نہیں آئی تھیں اور نہ ہی اس جگہ کے بارے میں کچھ جانتی تھیں۔ انہیں وہاں جا کر پہلے تو اس جگہ سے پوری طرح واقف ہونے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد وہ اپنی کارروائیوں کا آغاز کر سکتی تھیں۔

انہوں نے محتاط طریقے سے ممکنہ اخراجات کا اندازہ لگایا اور یہ رقم انہیں بآسانی حاصل ہوگئی۔

''اگر رقم کچھ کم پڑی تو میں اپنے پاس سے خرچ کر دوں گی۔'' ماریہ نے خالدہ مکرم سے کہا۔ ماریہ ایسا کر سکتی تھی۔ کیونکہ وکالت کے پیشے سے اس کو اچھی خاصی آمدنی ہو رہی تھی۔ جبکہ اس کی کوئی گھریلو ذمہ داری نہیں تھی۔ والدین اور بھائی اب اس دنیا میں نہیں تھے اور اس کی شادی ابھی تک ہوئی نہیں تھی۔ اکیلی جان تھی۔ وہ کافی پیسے بچا لیتی تھی۔

اگلے چند روز کے بعد جب ایس آئی خالدہ مکرم اور اس کی نوجوان ساتھی ماریہ چکوال پہنچیں تو انہوں نے انسپکٹر لطیف حسین کو ریلوے اسٹیشن پر اپنا منتظر پایا۔

ایس آئی خالدہ مکرم پولیس یونیفارم میں تھی تاکہ اسے آسانی کے ساتھ پہچانا جا سکے اور اس کے ساتھ ماریہ سادہ کپڑوں میں تھی، لیکن ماریہ کو ایک باوردی پولیس والی کے ساتھ دیکھ کر عام لوگ ماریہ کو بھی ایک ایسی ہی پولیس والی سمجھ رہے تھے جو یونیفارم کے بغیر ہو۔

انسپکٹر لطیف حسین پولیس کی وردی میں تھا اور اس کے ساتھ ایک باوردی حوالدار بھی تھا۔ ان دونوں خواتین کو دیکھتے ہی، وہ خود تیزی سے ان کی طرف بڑھ کر آ گیا تھا۔

''آپ..... ایس آئی خالدہ مکرم ہیں؟'' اس نے باوردی خاتون سے پوچھا۔

''جی ہاں سر۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''اور آپ انسپکٹر لطیف حسین؟''

''جی..... میں انسپکٹر لطیف حسین ہوں۔ ڈپٹی صاحب نے کراچی سے مجھے فون کر دیا تھا۔ ویسے بھی ہمیں سرکاری طور پر آپ کی مدد کرنے کی ہدایت ملی ہے۔''

''شکریہ۔'' خالدہ مکرم نے کہا اور ماریہ کا اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ قانون دان اور فلاحی کارکن مس ماریہ بلگرامی.....''

''کراچی کے مہمانوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے ایک خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ہمارا تو چھوٹا سا شہر ہے۔ کوئی ایسی خاص چیز بھی یہاں نہیں ہے جسے دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہوں۔''

لطیف حسین ان کو ساتھ لے کر باہر آیا، جہاں ایک گاڑی موجود تھی۔

''میں نے آپ لوگوں کے ٹھہرنے کا ایک سرکاری عمارت میں بندوبست کر دیا ہے۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے کہا۔ ''ہاں ایک ملازم اور ایک ملازمہ آپ کی خدمت کے لیے موجود ہوں گے، ملازم ڈرائیور بھی ہے، گاڑی بھی آپ کے لیے موجود رہے گی۔ آپ لوگ جہاں چاہیں آ جا سکتی ہیں اور میں ہر وقت آپ کی مدد کے لیے موجود رہوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ سر۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔

''ڈی ایس پی غلام نبی صاحب کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔'' لطیف حسین نے کہا۔ ''کسی زمانے میں میری پوسٹنگ کراچی میں تھی، جہاں میرے بعض خاندانی دشمنوں نے میرے خلاف ایک جھوٹا کیس بنوا کر مجھے نوکری سے نکلوانے کی کوشش کی تھی۔ غلام نبی صاحب کبھی غلط کام نہیں کرتے۔ انہیں یقین تھا کہ میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ انہوں نے میری بہت مدد کی اور بالآخر مجھے اس جھوٹے کیس سے نجات دلا دی۔ میرا تو رواں رواں ان کا احسان مند ہے اور یہ میرے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات ہے کہ انہوں نے میرے پاس کچھ مہمانوں کو بھیجا ہے۔''

''لیکن میرے خیال میں پولیس میں ان کی ضرورت ہے۔'' لطیف حسین نے کہا۔ ''کیونکہ محکمہ پولیس میں رہ کر وہ ایسے کارنامے سرانجام دے رہے ہیں جو دوسرے پولیس والے بالکل سرانجام نہیں دے سکتے۔ سچ پوچھئے تو غلام نبی صاحب ہی جیسے گنے چنے لوگوں سے پولیس کا کچھ بھرم قائم ہے، ورنہ یہ محکمہ اف توبہ..... عوام تو اس کو اپنا دشمن سمجھ کر اس سے بہت دور بھاگتے ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ دیر کے بعد وہ لوگ اس جگہ پہنچ گئے جہاں ان کی رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ بڑی ہی خوبصورت اور پُر فضا جگہ تھی۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا اور ہرے بھرے درختوں میں چھپی ایک چھوٹی سی پرانے طرز کی عمارت تھی۔ ایک ملازم اور ملازمہ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ وہ مہمانوں کا انتظار ہی کر رہے تھے اور مہمانوں کی آمد پر وہ دونوں فوراً ہی مستعد ہو گئے۔ عورت کا نام منظوراں اور آدمی کا نام خدا بخش تھا۔

''اس مکان میں فون موجود ہے۔'' لطیف حسین نے ان لوگوں سے کہا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ جیب سے نکال کر ان کو دے دیا۔ ''آپ جب چاہیں مجھے فون کر کے بلا سکتی ہیں۔ یہ بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔ اگر فون میں کوئی خرابی ہو جائے تو آپ خدا بخش سے کہہ کر مجھ کو بلوا لیجئے گا۔''

''بہت بہت شکریہ سر۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''ہم لوگ بس فوری طور پر اپنا کام شروع کر دینا چاہتے ہیں۔ ابتداء میں آپ کی مدد کی ضرورت پڑے گی، تو اگر آج شام کو آپ سے ملاقات ہو جائے؟''

''ٹھیک ہے۔'' لطیف حسین نے کہا۔ ''میں خود ہی یہاں آ جاؤں گا۔''

لطیف حسین کے جانے کے بعد ان دونوں نے غسل کیا اور لباس وغیرہ تبدیل کر کے ذرا سکون کا سانس لیا۔ ان کے کہے بغیر ہی منظوراں ان کے لئے چائے لے کر آ گئی تھی۔

''ارے.....'' خالدہ نے قدرے حیرت سے کہا۔ ''ہم نے تو تم سے چائے کے لیے نہیں کہا تھا۔''

''مجھے معلوم ہے بی بی جی۔'' منظوراں نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''آپ لوگ کراچی سے آئی ہیں اور کراچی والے چائے بہت پیتے ہیں۔ دو سال پہلے بھی کراچی سے کچھ مہمان آ کر یہاں ٹھہرے تھے، وہ تو دن میں کئی کئی بار چائے بنوا کر پیتے تھے۔''

منظوراں اگرچہ اردو بول رہی تھی، لیکن اس کا لہجہ ٹھیٹھ پنجابی تھا اور اس کی اردو میں پنجابی کے الفاظ کی فراوانی تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کو اردو بولنے کی زیادہ مشق نہیں ہے لیکن وہ ان دونوں کی باتوں کو پوری طرح سمجھ سکتی تھی۔

چائے پینے کے بعد انہوں نے اس جگہ کا اچھی طرح سے جائزہ لیا جہاں انہیں ٹھہرایا گیا تھا۔

''پولیس والے کے لیے ضروری ہے کہ جب بھی وہ کسی مہم پر جائے اور کسی اجنبی جگہ

پر قیام کرے، تو اس جگہ کا اور اس کے اطراف واکناف کا اچھی طرح سے جائزہ لے لے۔'' خالدہ مکرم نے ماریہ سے کہا۔ ''کیونکہ پولیس والوں کو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہئے..... نہ معلوم کب نکل بھاگنے کی ضرورت پیش آ جائے۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔'' ماریہ ایک دم ہنس پڑی۔ ''پولیس والے بھی ایسا کرتے ہیں اور چور بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ میرے ابا مرحوم کہا کرتے تھے کہ چور جب کہیں چوری کرنے کے لیے جاتا ہے تو سب سے پہلے اپنے فرار کا راستہ تلاش کر کے اس کو اچھی طرح سے دیکھ لیتا ہے۔''

''وہ ٹھیک کہتے تھے۔'' خالدہ مکرم نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ ''چور اور ڈاکو کوئی کام مکمل پلاننگ کے بغیر نہیں کرتے۔''

کچھ دیر کے بعد وہ دونوں اپنے کام کی ایک ڈھیلی ڈھالی منصوبہ بندی کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

شام کو انسپکٹر لطیف حسین بھی ان کے پاس آ گیا۔

''ہاں جناب.....'' لطیف حسین نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''اب بتائیے کہ میں آپ لوگوں کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ سر کہ ہمیں ایک گھرانے کی تلاش ہے جس کے سربراہ کا نام حمید الحسن تھا۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''ہم نہیں جانتے کہ یہ شخص اب زندہ بھی ہے یا نہیں، کیونکہ یہ بہت پرانی بات ہے کہ یہ خاندان بسوں کے اڈے کے قریب کسی بستی میں رہتا تھا۔ اس شخص کے بارے میں ہم اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں جانتے کہ اس کا کم از کم ایک بیٹا ہے جس کا نام فرید الحسن تھا، وہ زندہ ہے اور کراچی میں ہی ہے۔'' اور اس کے ساتھ ہی خالدہ مکرم نے مختصر طور پر فرید کے جرم اور اس کے ساتھ وابستہ سلسلہ واقعات کے بارے میں انسپکٹر لطیف حسین کو بتایا۔ لطیف حسین حیرت سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔

''عجیب وغریب کیس ہے اور عجیب وغریب آدمی ہے۔'' اس نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔ ''پھانسی پر لٹکنے کے لیے تیار ہے اور زبان نہیں کھولتا، یہ واقعی ایک مینٹل کیس ہے۔''

''اور ہمیں اس شخص کے دماغ کے اندر اترنا ہے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''جبکہ اس نے سارے راستے بند کر رکھے ہیں اور ان پر پہرے بٹھا دیئے ہیں۔''

''یہ غلام نبی صاحب جیسے لوگوں کا ہی دل گردہ ہے جو وہ ایسے ایسے کاموں میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔'' لطیف حسین نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''ورنہ بھلا کس کو کیا پڑی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جواتنی کھوج کرتا پھرے.....اور آپ لوگوں کے حوصلے کی بھی واقعی داد دینی پڑتی ہے۔''

''ہمیں اس خاندان کا کوئی ایک شخص بھی مل جائے تو وہ ہمارے لیے اس شخص کے دماغ میں داخل ہونے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔

''کوئی نہ کوئی تو مل جائے گا۔'' لطیف حسین نے کہا۔ ''اس چھوٹے سے شہر میں تو لوگ ایک دوسرے کی سات پشتوں تک سے واقف ہوتے ہیں۔ میں کل صبح کو ہی کسی کو وہاں بھیجتا ہوں۔''

''بہتر ہوگا کہ میں اور ماریہ خود بھی وہاں جائیں۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خود بھی اس جگہ کو اچھی طرح سے دیکھنا چاہتے ہیں جہاں فرید کا خاندان رہتا تھا یا رہتا ہے۔ ہمارے لیے اس جگہ سے ذاتی طور پر واقف ہونا ہمارے کام میں مدد دے گا۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے کہا۔ ''آپ لوگ بھی چلیے، تو پھر کل صبح کو میں آتا ہوں۔''

''شکریہ سر!'' ماریہ نے کہا۔ ''اس ایک شخص حمید الحسن کے علاوہ ہمارے پاس ایک دوسرا سراغ بھی ہے، لیکن اس سراغ کا تعلق قاتل کے خاندان سے نہیں بلکہ مقتول کے خاندان سے ہے۔ قاتل اور مقتول دونوں ہی کے خاندانوں کا تعلق چکوال سے ہے۔ یہ دوسرا سراغ ایک عورت ہے۔''

''اچھا؟'' لطیف حسین نے پوچھا۔ ''کون ہے یہ عورت؟ کہاں رہتی ہے؟''

''کچھ نہیں معلوم۔'' ماریہ نے کہا۔ ''صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ایک عمر رسیدہ عورت ہے۔ کافی بوڑھی ہوچکی ہے۔ معلوم نہیں زندہ بھی ہوگی یا نہیں۔ اس کا نام شکوراں ہے اور وہ مقتول کے والدین صفدر علی اور صابرہ کے ساتھ طویل عرصے پہلے چکوال سے کراچی چلی گئی تھی اور ان لوگوں کے ساتھ ہی رہتی تھی لیکن کراچی میں مقتول کی شادی کے کچھ عرصے کے بعد وہ واپس چکوال آگئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ چکوال میں مقتول کے خاندان کی ساری تاریخ سے بخوبی واقف ہوگی۔''

''تو گویا اب صورت حال کچھ یوں ہے کہ آپ لوگوں کو قاتل کے خاندان کے ایک شخص اور مقتول کے خاندان کے ایک شخص سے محض جزوی اور نامکمل واقفیت ہے۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک شخص بھی مل جائے، یا ان سے تعلق رکھنے والا کوئی اور شخص تو یہ گتھی سلجھ سکتی ہے۔''

''جی ہاں۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''دونوں خاندانوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت

کیا تھی اور ان کے مابین اگر کوئی تنازع تھا تو وہ کیا تھا۔ اس کا صحیح علم اگر ہمیں ہو جائے تو شاید ہم قتل کی وجہ تک پہنچنے کی راہ تلاش کرسکیں۔''

''پہلے ہمیں حمید الحسن پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔'' ماریہ بلگرامی نے کہا۔ ''ہمیں اس کے نام کے ساتھ ساتھ اس کے رہنے کے ٹھکانے کے بارے میں بھی تھوڑا بہت علم ہے۔''

''ایسا ہی کریں گے۔'' لطیف حسین نے کہا۔ ''لیکن ساتھ ہی میں شکوراں کی تلاش کا کام بھی شروع کردینا چاہتا ہوں۔ کم از کم کچھ شناختی علامتیں تو موجود ہیں ہی.....ایک ایسی عورت جو چکوال سے کراچی جا کر ایک طویل عرصے تک وہاں مقیم رہی اور جس خاندان کے ساتھ وہ مقیم رہی اس کے سربراہ کا نام صفدر علی اور اس کی بیوی کا نام صابرہ تھا اور ان کے دو بیٹے تھے۔ اکبر علی اور حیدر علی۔ یہ بھی اچھی خاصی معلومات ہیں۔ ان کی مدد سے بھی کام کا آغاز تو کیا ہی جاسکتا ہے۔''

''بس تو پھر آغاز کر دیجیے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''اگر آپ کے لیے ممکن ہو تو شکوراں کی تلاش کے کام پر کسی کو لگا دیجیے۔ اس میں فوری کامیابی کی تو کوئی امید نہیں..... کچھ نہ کچھ وقت تو ضرور لگے گا۔''

اگلے روز صبح کو لطیف حسین گاڑی لے کر ان لوگوں کے ٹھکانے پر آگیا۔ خالدہ اور ماریہ پہلے سے تیار تھیں۔ ان سب لوگوں میں سے کوئی بھی پولیس کی یونیفارم میں نہیں تھا۔

''پولیس کی یونیفارم دیکھ کر لوگ ڈر جاتے ہیں۔'' لطیف حسین نے کہا تھا۔ ''وہ تعاون نہیں کرتے، اگر کچھ معلوم بھی ہوتا ہے تو ڈر کے مارے نہیں بتاتے۔''

''ڈر بھی انہیں دو طرفہ ہوتا ہے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''پولیس کا خوف تو اپنی جگہ پر ہوتا ہی ہے جو انہیں بہت ہی پریشان کن چکروں میں ڈال سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان غنڈوں اور بدمعاشوں کا خوف بھی ہوتا ہے جو پولیس سے تعاون کرنے کی پاداش میں ان لوگوں کو پریشان کرسکتے ہیں۔ اس طرح سارا معاملہ خراب ہو جاتا ہے۔''

وہ لوگ عام شہریوں کے انداز میں اس بستی میں پہنچے جو بسوں کے اڈے کے قریب واقع تھی۔ یہ کوئی خاص نشانی تو تھی نہیں۔ بسوں کے اڈے کے قرب و جوار میں تو خاصی آبادی تھی اور اب تو شاید پہلے کے مقابلے میں تبدیلیاں بھی بہت ہوگئی تھیں۔ کس طرح تلاش کیا جائے؟ بہرحال تلاش تو کرنا ہی تھا۔

ان تینوں کے ساتھ ایک حوالدر بھی تھا۔ وہ لطیف حسین کا خاص اور قابل اعتماد آدمی تھا اور اس کا نام بہادر خاں تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بستی کے قریب کئی ہوٹل تھے۔لطیف حسین بہادر خاں کے ساتھ ایک ہوٹل کے کاؤنٹر پر پہنچا لیکن کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی۔ وہ ایک نوجوان کم عمر لڑکا تھا۔ وہ شاید اس بستی کے پرانے لوگوں سے واقف نہیں ہوگا۔ پھر بھی لطیف حسین نے اس کے پاس جا کر اس بات کی۔

''جوان، کیا تم حمید الحسن نامی کسی شخص کو جانتے ہوئے جو اس بستی میں کہیں رہتا تھا؟'' اس نے پوچھا۔ ''یا شاید اب بھی رہتا ہو۔''

''کوئی اتہ پتہ؟'' نوجوان نے پوچھا۔ ''مکان کی کوئی نشانی وغیرہ؟''

''نہیں۔'' لطیف حسین نے کہا۔ ''گھر کا پتہ نہیں ہے۔ اصل میں حمید الحسن کی تلاش میں اس کی دو رشتہ دار خواتین باہر سے آئی ہوئی ہیں۔ انہیں اس کے گھر کا پتہ تو نہیں معلوم۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ بسوں کے اڈے کے آس پاس کہیں رہتا تھا۔''

''میں کسی حمید الحسن کو نہیں جانتا۔'' نوجوان نے کہا۔ ''مگر آپ ٹھہریں۔ میں خانو چاچا کو بلاتا ہوں۔ وہ یہاں کے پرانے لوگوں کو جانتے ہیں، شاید انہیں کچھ پتہ ہو۔''

اس نے ایک آدمی کو آواز دے کر کہا کہ وہ خانو چاچا کو اس کے پاس بھیج دے۔

چند منٹ بعد ایک کافی عمر رسیدہ آدمی ان لوگوں کے پاس آ گیا۔ نوجوان نے اسے ساری بات بتا دی۔

''نہیں..... میں کسی حمید الحسن کو نہیں جانتا۔ میں پچھلے پندرہ سال سے اس علاقے میں رہ رہا ہوں، میں کسی حمید الحسن کو نہیں جانتا۔ اس نام کا کوئی آدمی ادھر نہیں رہتا۔''

ان لوگوں نے اپنی تلاش جاری رکھی اور متعدد لوگوں سے پوچھا۔ پوچھتے پوچھتے وہ بستی کے ایک دوسرے سرے تک جا پہنچے، جو اس جگہ سے کافی دور تھا۔ اس دوران ان کو حمید نامی تو کئی لوگوں کا پتہ چلا تھا لیکن ان میں سے حمید الحسن کوئی نہیں تھا۔

بستی کے بالکل دوسرے سرے پر پہنچ کر انہیں حمید الحسن مل گیا۔

وہ لوگ اسی طرح پرانے اور عمر رسیدہ لوگوں سے حمید الحسن کے بارے میں پوچھتے پھر رہے تھے کہ ایک بوڑھے نے ان کو بتایا کہ حمید الحسن یہاں قریب ہی رہتا ہے۔

''ہمیں ذرا اس کا گھر بتا دو۔'' لطیف حسین نے کہا۔ ''کچھ مہمان اس سے ملنے کے لیے بہت دور سے آئے ہیں۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' اس شخص نے کہا اور انہیں ساتھ لے کر جلدی سے ایک مکان کے دروازے پر جا پہنچا۔ پرانی طرز کا چھوٹا سا، بوسیدہ سا مکان تھا۔ اس شخص نے

زور زور سے دروازے پر دستک دی۔ دستک کے جواب میں دروازہ کھولنے والا بھی ایک خاصا بوڑھا آدمی تھا۔ وہ دروازے پر اتنے بہت سے لوگوں کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔

''حمید۔'' ساتھ آنے والے شخص نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے کچھ رشتے دار باہر سے آئے ہیں، تمہارا گھر تلاش کر رہے تھے۔''

''میرے رشتے دار؟'' بوڑھے نے آنکھوں پر ہاتھ سے چھجا بنا کر آنے والوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے رشتے دار؟ کہاں سے آئے ہیں بھائی؟''

''تمہارا نام حمید الحسن ہے نا؟'' لطیف حسین نے گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں.....'' اس نے کہا۔ ''میرا نام حمید الحسن ہے..... مگر آپ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟''

''یہ خواتین کراچی سے آئی ہیں۔ انہیں تمہاری ہی تلاش ہے۔ تم حمید الحسن ہو نا؟''

''ہاں جی..... میں حمید الحسن ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اور تمہارا فرید الحسن نام کا ایک بیٹا ہے؟'' خالدہ نے اس سے اگلا سوال کیا۔

''فرید الحسن؟ بیٹا؟'' بوڑھے کے چہرے پر ایک غم انگیز تاثر نمودار ہوا۔ ''نہیں جناب، آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے تو کوئی بھی بیٹا نہیں ہے۔ بس ایک بیٹی ہے وہ اپنے میاں کے ساتھ لاہور میں رہتی ہے۔ کبھی سال دو سال میں ایک بار بچوں کو ساتھ لے کر ملنے کے لیے آ جاتی ہے۔ میں تو یہاں بالکل اکیلا رہتا ہوں۔ بڑی تکلیف ہے جی۔ گھر والی بھی گزر چکی ہے، کوئی اور بھی نہ ہو تو اکیلے بندے کی بڑی مشکل ہو جاتی ہے جی.....'' بوڑھا بے تکان بولے جا رہا تھا۔ ''نسرین اور اس کا میاں زبیر تو کتنی بار مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ میں ان کے ساتھ لاہور چلوں اور وہیں رہوں۔ مگر آپ خود ہی سوچیں جی..... بیٹی داماد کے گھر جا کر رہنا بھلا کوئی اچھی بات ہے۔''

ان لوگوں نے بوڑھے کو خوب بولنے دیا تاکہ وہ اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نکال لے۔ پھر جیسے ہی اس نے ذرا سا وقفہ کیا لطیف حسین جلدی سے بولا۔ ''کیا اس علاقے میں حمید الحسن نام کا کوئی اور شخص بھی رہتا ہے؟''

''نہیں جی۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔ ''اور تو کوئی نہیں رہتا۔ بس میں ہی ہوں اور میں وہ نہیں ہوں جس کی آپ کو تلاش ہے، کیونکہ میرا تو کوئی بیٹا نہیں ہے۔ بس جی، مرضی میرے رب کی۔'' بوڑھے نے ایک بار پھر سلسلہ گفتگو شروع کر دیا۔ ''بڑی تمنا تھی میری اور مرنے والی کی بھی کہ ہمارے گھر ایک بیٹا ہو جائے، مگر اوپر والے کو منظور نہیں تھا سو نہیں ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شکر ہے اس کا کہ بیٹی بھی ایک ہی دی۔ اگر دو چار ہوتیں تو کتنا بوجھ ہو جاتا۔ میں اکیلا بندہ..... کیا کیا کرتا۔''

''اچھا بابا جی۔'' لطیف حسین نے موقع پاتے ہی کہا۔ ''ہم لوگ چلتے ہیں۔ تم کو تکلیف دی، معاف کرنا۔''

معاً بوڑھے کو یہ احساس ہوا کہ اس نے ان لوگوں کو ابھی تک دروازے کے باہر ہی کھڑا کر رکھا ہے اور ان سے اندر آنے کے لیے نہیں کہا ہے۔

''ارے..... آپ لوگ اندر تو آیئے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں آپ لوگوں کے لیے کچھ لسی پانی کا بندوبست کروں۔ آپ لوگ اتنی دور سے آئے ہیں۔ میری بھی بڑھاپے میں عقل ماری گئی ہے۔''

''نہیں نہیں بابا جی۔'' ماریہ نے جلدی سے کہا۔ ''ہم لوگ بس اب چلیں گے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' اور اس کے ساتھ ہی وہ لوگ وہاں سے چلے آئے۔

اس کے بعد اس پورے علاقے میں انہیں کوئی اور حمید الحسن نہیں ملا۔

''کہیں ہم لوگوں سے کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی ہے؟'' خالدہ نے کہا۔ ''یہاں حمید نام کے تو کئی لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا، ہوسکتا ہے ان میں سے ہی کوئی حمید الحسن ہو..... اور لوگ اسے اس کے پورے نام سے نہ جانتے ہوں۔''

''یہ بھی ہوسکتا ہے۔'' لطیف حسین نے کہا۔ ''اس صورت میں ہم ایک بار پھر سے تلاش کریں گے۔ اصل میں ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ حمید الحسن یہاں کب تک رہتا تھا، یعنی فرید کو اپنا گھر چھوڑے ہوئے کتنا زمانہ ہو گیا۔ اگر اس بات کا علم ہوتا تو کام شاید کچھ آسان ہو جاتا۔''

''اس کا ایک حل میری سمجھ میں آ رہا ہے سر۔'' ماریہ نے کہا۔ ''ہے تو ذرا محنت طلب، لیکن شاید اس کے ذریعے سے کچھ بات بن جائے۔''

''ہاں، بتایئے..... کیا حل ہے؟''

''اگر ہم اس علاقے کے ووٹروں کی پرانی فہرستیں حاصل کر سکیں اور ان میں حمید الحسن کا نام تلاش کریں تو شاید کچھ سراغ مل جائے۔ ظاہر ہے کہ نام کے ساتھ مکان کا پتہ بھی درج ہوگا۔''

''ہاں۔'' لطیف حسین نے ماریہ کو توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو واقعی ایک طریقہ ہوسکتا ہے اور یہ کوئی زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ ووٹروں کی تمام پرانی لسٹیں ہمیں

مل جائیں گی۔ سارا ریکارڈ ایک سے زائد جگہوں پر محفوظ ہوگا۔ میں آج ہی سے کوشش شروع کر دیتا ہوں۔''

دن کا زیادہ تر حصہ تو گزر ہی چکا تھا۔ اگرچہ کوئی کامیابی تو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مگر بہرحال یہ سب کچھ ان لوگوں کے تجربے میں اضافے کی حیثیت رکھتا تھا۔ شہر سے، بستی کے لوگوں سے، وہاں کی مخصوص فضا سے واقف ہونے کا موقع ملا تھا۔

لطیف حسین نے ان دونوں کو کافی دیر تک شہر کی سیر کرائی اور وہاں کی خاص خاص جگہیں دکھائیں۔ پھر ان کو ان کی قیام گاہ پر چھوڑ دیا۔

''میں کوشش کر کے کل ہی اس علاقے کے ووٹروں کی لسٹیں حاصل کر لوں گا۔'' اس نے جاتے جاتے کہا۔ ''ویسے..... اس امکان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ شاید اس کے نام کا اندراج ووٹر لسٹ میں نہ ہو، کیونکہ اکثر لوگوں کے اور خاص طور پر کچی آبادیوں وغیرہ کے لوگوں کے نام ووٹرز لسٹ میں شامل ہو جانے سے رہ جاتے تھے۔''

''ہاں، یہ ہوسکتا ہے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''اگر ایسا ہوا تو پھر کوئی اور راستہ نکالیں گے۔ ایک بار پھر سے اس علاقے کے ان سارے لوگوں کا جائزہ لیں گے جن کے نام حمید ہیں یا حمید تھے۔ شاید ان میں سے ہی کوئی حمید الحسن نکل آئے۔ مشکل تو یہ ہے کہ ہم وقت کا تعین نہیں کر سکتے۔ معلوم نہیں، وہ کس زمانے میں یہاں رہتا تھا۔''

اگلے ہی دن لطیف حسین نے گزشتہ ادوار میں تیار ہونے والی علاقے کی ساری ہی ووٹرز لسٹیں حاصل کر لیں۔ الیکشن سے پہلے نئی لسٹیں تیار ہوتی تھیں اور ان میں ردوبدل ہوتا رہتا تھا۔ اب ان ڈھیروں لسٹوں میں ایک نام تلاش کرنا تھا۔ تاہم آسانی یہ تھی کہ صرف ایک مختصر اور محدود سے علاقے کی لسٹوں کو دیکھنا تھا۔

خالدہ مکرم اور ماریہ نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا، اور وہ ان لسٹوں کو کھنگالنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کی یہ جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔

انہیں ایک بہت پرانی ورٹرز لسٹ میں حمید الحسن کا نام مل گیا۔ انہوں نے اس کے بعد کئی ووٹرز لسٹوں میں بھی اس نام کو تلاش کر لیا۔ جو ایک تسلسل کے ساتھ چلا آ رہا تھا لیکن کئی سال کے بعد بالکل نئے سرے سے بننے والی ووٹرز لسٹوں میں حمید الحسن کا نام شامل نہیں تھا۔

جس پرانی لسٹ میں حمید الحسن کا نام شام تھا، اس میں اس کے نام کے ساتھ اس کے مکان کا پتہ بھی درج تھا۔ ان لوگوں نے اسے ایک کاغذ پر درج کر لیا۔ یہ مرد ووٹروں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لسٹ تھی اور اس میں حمید الحسن کے گھر سے صرف اسی کا نام شامل تھا۔

''اگر یہ وہی حمید الحسن ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے گھر میں اس وقت اس کے علاوہ اور کوئی بالغ مرد موجود نہیں تھا۔'' ماریہ نے کہا۔

''بالکل۔'' خالدہ مکرم نے اس سے اتفاق کیا۔

''لیکن کوئی عورت تو ہو سکتی ہے۔ ہمیں اس کے گھر کے سارے افراد کے بارے میں جاننے کے لیے عورتوں کی ووٹرز لسٹ بھی دیکھنی ہوگی۔''

اس نے اسی وقت انسپکٹر لطیف حسین کو فون کیا اور اس سے اس سال کی خواتین کی ووٹرز لسٹ فراہم کرنے کی درخواست کی۔ لطیف حسین نے اگلے دن ان لوگوں کو خواتین کی ووٹرز لسٹ بھی فراہم کر دی۔

اس پتے پر ایک عورت کا اندراج تھا۔ اس عورت کا نام صابرہ تھا۔ صابرہ زوجہ حمید الحسن۔ اس کے علاوہ اور کوئی نام نہیں تھا۔

''تو اب اگر یہ ہمارا مطلوبہ حمید الحسن ہے تو اس کی بیوی کا نام صابرہ تھا اور اس گھر میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی بالغ مرد نہیں رہتا تھا۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''بچے اس وقت چھوٹے اور نابالغ ہوں گے۔''

ووٹرز لسٹ میں اس علاقے میں حمید نام کے تو بہت سے لوگ تھے۔ جن کے ناموں کے آگے پیچھے کوئی اور سابقہ یا لاحقہ لگا ہوا تھا، لیکن ''حمید الحسن'' صرف ایک ہی تھا۔ اس دوسرے حمید الحسن کا نام اس لسٹ میں شامل نہیں تھا جس سے ان لوگوں کی ملاقات ہوئی تھی اور ان لوگوں کو اس کی وجہ جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ووٹرز لسٹ میں نام شامل نہ ہو پانے کی بہت ساری وجوہات ہو سکتی تھیں۔

حمید الحسن اور اس کے مکان کی تلاش کے دوران لطیف حسین اور حوالدار بہادر خاں بھی موجود تھے۔

وہ لوگ جب اس پتے پر پہنچے جو حمید الحسن کے مکان کی حیثیت سے ووٹر لسٹ میں مندرج تھا، تو انہیں وہاں کوئی مکان نہیں ملا۔ اس جگہ ایک موٹر گیراج تھا جس میں گاڑیوں کی مرمت وغیرہ کا کام ہوتا تھا۔ اس گیراج کے مالک کا نام ظہور تھا۔

''حمید الحسن؟'' اس نے تعجب سے کہا۔ ''نہیں جناب، یہاں کوئی حمید الحسن نہیں رہتا۔ بلکہ یہاں کوئی بھی نہیں رہتا۔ کیونکہ یہ مکان نہیں ہے۔ یہ تو گیراج ہے جناب۔ یہاں گاڑیوں کی مرمت کا کام ہوتا ہے۔''

''لیکن کسی زمانے میں یہ مکان ہوا کرتا تھا۔'' حوالدار بہادر خاں نے کہا۔ ''اور یہاں لوگ رہتے تھے۔ حمید الحسن نامی ایک شخص اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔ اس کے کچھ عزیز بہت لمبے عرصے کے بعد اس کی تلاش میں کراچی سے آئے ہیں۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' ظہور نے کہا۔ ''میں نے تو بہت عرصہ پہلے یہ گیراج عبدالصمد سے خریدا تھا، میں آپ کو عبدالصمد کا پتہ بتا دیتا ہوں، آپ اس سے مل لیجئے۔ شاید وہ ان پرانے مکینوں کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔''

اس نے ان لوگوں کو عبدالصمد کا پتہ دے دیا اور یہ لوگ اسی وقت عبدالصمد کے پاس روانہ ہو گئے جو شہر کے ایک دوسرے حصے میں رہتا تھا۔

عبدالصمد ایک بوڑھا موٹر میکینک تھا۔ بینائی کم ہو جانے کی وجہ سے اس نے ایک عرصے سے کام چھوڑ دیا تھا اور اب گھر پر ہی رہتا تھا۔

''ہاں..... آپ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔'' اس نے ان کی بات سن کر کہا۔ ''کسی زمانے میں یہاں ایک مکان ہوا کرتا تھا اور اس میں رہنے والے کا نام حمید الحسن ہی تھا اور اس کی بیوی کا نام صابرہ تھا۔ ان کا ایک بیٹا تھا اور ایک بیٹی..... بیٹے کا نام فرید تھا..... فرید الحسن..... اور بیٹی کا نام دردانہ تھا۔ میں ان لوگوں سے کبھی ملا نہیں، لیکن مجھے کچھ دوسرے لوگوں سے ان کے بارے میں یہ باتیں معلوم ہوئی تھیں۔''

''وہ لوگ اب کہاں ہیں؟'' خالدہ مکرم نے اپنی شدید بے چینی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ جی..... بات یہ ہے کہ حمید الحسن کو تو کسی نے قتل کر دیا تھا۔'' عبدالصمد نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''اس کا کسی آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ دونوں میں مار پیٹ ہوئی تھی۔ حمید الحسن قتل ہو گیا تھا۔''

''اوہ.....'' خالدہ مکرم نے حیرت اور تاسف کے ساتھ کہا۔ ''اور اس کے بیوی بچے؟ وہ کہاں گئے؟''

''شوہر کے قتل کے بعد صابرہ نے یہ مکان بیچ دیا تھا۔'' عبدالصمد نے بتایا۔ ''اور پھر اس مکان کو توڑ کر یہاں گیراج بنا دیا گیا۔ صابرہ اپنی بیٹی دردانہ کے ساتھ ایک قریبی گاؤں میں چلی گئی۔ پھر سنا ہے دردانہ کی شادی ہو گئی اور وہ گوجرانوالہ چلی گئی۔ مجھے اس سے زیادہ نہیں معلوم.....''

''اور بیٹا؟ فرید الحسن؟'' ماریہ نے جلدی سے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بیٹا بھی کہیں چلا گیا۔'' عبدالصمد نے کہا۔ ''معلوم نہیں..... اس کے بارے میں کچھ ٹھیک سے پتہ نہیں۔''

''تو..... صابرہ بھی شاید اپنی بیٹی کے ساتھ گوجرانوالہ میں ہی ہو۔'' ماریہ نے کہا۔

''وہ اور کہاں جا سکتی ہے؟''

''شاید.....'' عبدالصمد نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔ ''اس بارے میں مجھے تو کچھ نہیں معلوم..... البتہ میں نے کسی سے سنا تھا کہ دردانہ کی شادی جس شخص کے ساتھ ہوئی ہے وہ خود بھی گوجرانوالہ میں ایک موٹر گیراج کا مالک ہے اور اس کا نام منور ہے، لیکن میں اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے دردانہ کی ماں صابرہ کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔''

عبدالصمد مزید کچھ نہیں بتا سکا۔ ان لوگوں کے بارے میں اس کی مختصر سی معلومات کا خزانہ یہاں ختم ہو جاتا تھا، تاہم یہ مختصر سی معلومات بھی بہت اہمیت رکھتی تھی۔ انہوں نے فرید کے گھر والوں کے بارے میں کافی کچھ جان لیا تھا اور اس سلسلے میں اہم ترین بات یہ تھی کہ فرید کے باپ حمید الحسن کو قتل کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پرانی دشمنی کا کوئی شاخسانہ ضرور موجود تھا۔

''ہمیں اب فرید کی ماں صابرہ اور بہن دردانہ کو تلاش کرنا ہوگا۔'' ماریہ نے ان لوگوں کے ساتھ اس ساری صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور ہم انہیں گوجرانوالہ میں ہی تلاش کر سکیں گے، موٹر گیراج کے مالک منور کے ذریعے.....''

''گوجرانوالہ میں ہمیں کوئی نہ کوئی موٹر میکینک ایسا ضرور مل جائے گا جس کی مدد سے منور کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔'' لطیف حسین نے کہا۔ ''میں خود تو آپ لوگوں کے ساتھ گوجرانوالہ نہیں جا سکوں گا، لیکن میں آپ کو وہاں کے ایک شخص کا پتہ دے دوں گا اور یہاں سے اس کو فون بھی کر دوں گا۔ وہ وہاں سب انسپکٹر ہے اور اس کا نام نواز خاں ہے۔ اصل میں وہ رشتے میں میرا کزن بھی ہوتا ہے۔ وہ آپ کی ہر ممکنہ مدد کرے گا۔ آپ رہائش وغیرہ کے سلسلے میں بالکل فکرمند نہ ہوں۔ نواز خاں خود ہی سارا بندوبست کر دے گا۔''

ان لوگوں کے ابتدائی منصوبے میں تو چکوال کے علاوہ اور کہیں جانا شامل نہیں تھا، لیکن اب گوجرانوالہ جانے کی ضرورت بھی پیش آ گئی تھی۔ وہاں جانے کے بعد یہ امید بندھی تھی کہ شاید فرید کی ماں اور بہن سے ملاقات ہو جائے اور اس الجھے ہوئے معاملے کی اصل صورتِ حال واضح ہو جائے۔

''ہم گوجرانوالہ جائیں گے خالدہ آپا۔'' ماریہ نے خالدہ مکرم سے کہا۔ ''جب ہم نے اتنا کچھ معلوم کر لیا ہے تو ہم آگے کی معلومات بھی حاصل کر لیں گے۔ ہم اس کام کو ادھورا نہیں چھوڑیں گے۔''

خالدہ مکرم نے فون پر کراچی میں غلام نبی سے بات کی اور اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ اب تک جو کچھ معلوم ہو چکا تھا اسے جان کر غلام نبی نے کافی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔

''یہ بہت اہم بات ہے کہ فرید کے باپ حمید کو قتل کیا گیا تھا۔'' غلام نبی نے کہا۔ ''اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان دونوں خاندانوں کے درمیان کسی پرانے تنازعے کا ہی تسلسل ہے۔ ویسے تو تم لوگ خود بہتر سمجھ سکتی ہو کہ کیا کرنا ہے، تاہم اگر ضرورت محسوس کرو تو اس کیس کی پرانی فائل نکلوا کر دیکھ سکتی ہو اور اس سے تمہیں اس کی نوعیت کا پورا اندازہ ہو جائے گا۔''

☆======☆======☆

خالدہ مکرم اور ماریہ گوجرانوالہ پہنچ گئیں۔ سب انسپکٹر نواز خاں نے ان دونوں کا بہت پُرتپاک خیر مقدم کیا اور ان کی رہائش کا معقول بندوبست کر دیا۔ اسے چکوال سے انسپکٹر لطیف حسین کا فون مل چکا تھا۔

''یہ کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے۔'' سب انسپکٹر نواز خان نے ان دونوں سے کہا۔ ''موٹر گیراج کے مالک منور کو ہم تلاش کر لیں گے۔ یہاں شہر میں بہت سارے موٹر میکینک ہیں، ان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔''

سب انسپکٹر نواز خاں نے اگلے دن اپنا کام شروع کر دیا اور دو دن کے اندر اندر اس نے چار ایسے موٹر میکینکوں کا پتہ لگا لیا جن کے نام منور تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی سی دکانیں تھیں جنہیں گیراج کہا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک منور حسن تھا۔ ایک منور الدین تھا۔ ایک محمد منور تھا۔ ایک منور علی خان تھا۔ نواز خاں، خالدہ اور ماریہ کو اپنے ساتھ لے کر باری باری ان چاروں میکینکوں کے پاس گیا، کیونکہ اصل کام منور علی موٹر میکینک سے نہیں، بلکہ اس کی ماں اور بہن سے تھا۔ منور علی تو محض شناخت کی ایک علامت تھا۔ سب انسپکٹر نواز خاں پولیس کی وردی میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں گیا تھا بلکہ سادہ لباس میں ملبوس ایک عام شہری کی حیثیت میں گیا تھا، کیونکہ وہ اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھا کہ لوگ پولیس والوں کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور اکثر حقائق کو چھپا لیتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان دونوں کو اس وقت بڑی مایوسی ہوئی جب ان پر اس امر کا انکشاف ہوا کہ ان چاروں میکینکوں میں سے کوئی بھی ان کا مطلوبہ میکینک نہیں تھا۔ ان میں سے کسی کی بیوی کا نام بھی دردانہ نہیں تھا، دو تو بالکل نوجوان لڑکے تھے، اور ابھی ان کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی دو شادی شدہ تھے، مگر وہ مطلوبہ منور نہیں تھے۔

چوتھے منور نے، جو منور علی خان تھا اور خاصا عمر رسیدہ آدمی تھا۔ ان دونوں کی بات سننے کے بعد غور سے ان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ لوگ منور سے آخری بار کب ملی تھیں؟''

''سچ تو یہ ہے کہ ہم اس سے بھی نہیں ملے۔'' خالدہ مکرم نے اس کے احمقانہ سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم اس سے ملے ہوتے تو ہم اس کو پہچان نہ لیتے۔''

''میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اس کی خیر خیریت کے بارے میں آخری بار کب معلوم ہوا تھا؟'' منور علی خاں میکینک نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''ہمیں ایک طویل عرصے سے اس کی خیر خبر نہیں ملی۔'' خالدہ مکرم نے گول مول سا جواب دیا۔ وہ وقت کا تعین تو کر ہی نہیں سکتی تھی۔

''میں اس وجہ سے پوچھ رہا ہوں کہ بہت برس پہلے منور علی نامی میرا ایک ہم نام یہاں ہوا کرتا تھا جس کا اپنا موٹر گیراج تھا۔'' منور علی خاں نے کہا۔ ''وہ یہاں کا رہنے والا نہیں تھا۔ چکوال سے یہاں آ کر آباد ہوا تھا اور اس کی بیوی کا نام دردانہ تھا۔''

''بالکل..... بالکل..... وہی.....'' ماریہ نے اپنے ہیجان پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''وہی..... وہی..... منور علی..... چکوال والا..... دردانہ کا شوہر، تو اب وہ کہاں ہے؟''

''اس کا تو زمانہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔'' منور علی خاں نے بتایا۔ ''میرا دوست تھا۔ لوگ ہم دونوں میں فرق کرنے کے لیے ہمیں بڑا منور علی اور چھوٹا منور علی کہتے تھے۔''

''اوہ..... تو چکوال والے منور علی کا انتقال ہو گیا..... اور اس کی بیوہ دردانہ..... وہ کہاں ہے آج کل؟''

''اس کی کوئی بیوہ نہیں ہے۔'' منور علی خاں نے خاصی ناگواری کے ساتھ جواب دیا۔ ''میاں کی موت کے کچھ عرصے کے بعد ہی دردانہ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس کے میاں کا نام خیر الدین ہے اور منور علی کے موٹر گیراج کا مالک وہی ہے۔ میں آپ لوگوں کو اس کے گیراج کا پتہ بتا سکتا ہوں۔''

''آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''ہمیں خیر الدین کے گیراج کا پتہ بتا دیجیے۔'' منور علی نے ان کو پتہ بتا دیا۔

وہ لوگ جب خیر الدین کے گیراج پر پہنچے تو ان کی خیر الدین سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ خیر الدین چند روز کے لیے کاروباری سلسلے میں لاہور گیا ہوا تھا البتہ اس کے گھر والے شہر میں ہی موجود تھے۔ گیراج والوں نے گھر کا پتہ بتا دیا۔

''اب آپ دونوں ہی وہاں جائیں گی۔'' سب انسپکٹر نواز خاں نے ان دونوں سے کہا۔ ''گاڑی میں بہادر خاں باہر موجود رہے گا۔ اگر مدد کی کوئی ضرورت ہو تو اس کو بتا دیجیے گا۔''

''شکریہ۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''سب سے پہلے تو ہمیں اس امر کی تصدیق کرنی ہے کہ یہ دونوں خواتین وہی ہیں جن کی ہمیں تلاش ہے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''فرید کی ماں اور بہن..... بلکہ سچ پوچھیے تو ابھی ساری ہی چیزوں کی تصدیق ہونی باقی ہے۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ تو کچھ بھی نہیں جان سکے ہیں۔''

''آپ کی بات ویسے تو ٹھیک ہے خالدہ صاحبہ، کہ ابھی تک یہ سارا کام مفروضوں کی ہی بنیاد پر ہو رہا ہے، لیکن یہ ٹھوس حقیقت ہے کہ چکوال میں بسوں کے اڈے کے قریب بستی میں رہنے والا حمید الحسن نامی صرف ایک ہی شخص ایسا تھا جس کے بیٹے کا نام فرید الحسن تھا۔'' نواز خان نے کہا۔ ''پچھلے بیس پچیس سال کے عرصے میں وہاں حمید الحسن نامی کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں تھا جس کے بیٹے کا نام فرید الحسن ہو..... تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ خاندان ہی آپ کا مطلوبہ خاندان ہے۔''

''جی ہاں۔'' ماریہ نے کہا۔ ''قرائن سے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ان دو خواتین سے ملاقات کے بعد صورت حال کافی واضح ہو جائے گی۔ ہمارے پاس فرید کی تازہ ترین تصویر بھی موجود ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اسے اپنا گھر چھوڑے ہوئے کتنا عرصہ گزرا ہے۔ تاہم شاید اس کی ماں اور بہن اس کی تصویر کو پہچان لیں۔''

سب انسپکٹر نواز خاں نے خالدہ مکرم اور ماریہ بلگرامی کو خیر الدین کے گھر کے دروازے تک چھوڑ دیا۔ حوالدار بہادر خاں نے گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی کر دی۔ خالدہ مکرم اور ماریہ نے دروازے پر دستک دی۔

دروازہ کھولنے والی ایک درمیانہ عمر کی عورت تھی۔ اس عورت پر نظر ڈالتے ہی ماریہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور خالدہ دونوں کے دلوں سے ایک ساتھ تمام خدشات فوری طور پر دور ہو گئے۔ اس امر میں شبے کی رتی برابر گنجائش نہیں تھی کہ یہ عورت فرید الحسن کی بہن تھی۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی ان دونوں کے ذہن میں فرید کا چہرہ ابھر آیا تھا۔

''ہم لوگ بالکل صحیح جگہ پر آ پہنچے ہیں۔'' خالدہ مکرم نے دل ہی دل میں کہا۔

''ہم لوگ کراچی سے آئے ہیں اور ہمیں بیگم صابرہ زوجہ حمید الحسن سے ملنا ہے۔'' خالدہ مکرم نے جان بوجھ کر فرید کی ماں کا نام لیا۔

عورت نے ان دونوں کو کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''کون ہیں آپ لوگ؟'' اس نے ان دونوں کو دروازے پر ہی روک کر پوچھا۔

''آپ غالباً ان کی بیٹی دردانہ ہیں۔'' خالدہ مکرم نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' دردانہ نے حیرت سے کہا۔ ''میں دردانہ ہوں لیکن آپ مجھے کیسے پہچانتی ہیں؟ میں تو آپ لوگوں سے کبھی نہیں ملی۔''

''دیکھیے ہم لوگ بہت دور کا سفر کر کے کراچی سے صرف آپ لوگوں سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔'' ماریہ نے کہا۔ ''ہمیں آپ سے اور آپ کی والدہ صاحبہ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''اندر آ جائیے۔'' دردانہ نے کہا۔ اس کے انداز میں صرف تجسس اور استعجاب تھا۔ کسی قسم کی گرم جوشی نہیں تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ ان دونوں خواتین کے آنے سے خوش نہیں ہوئی ہے بلکہ پریشان ہوئی ہے لیکن یہ ضرور جاننا چاہتی ہے کہ یہ کون ہیں اور کیوں آئی ہیں۔

دردانہ ان دونوں کو اندر لے گئی اور اس نے انہیں ایک صاف ستھرے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ کمرے کی سجاوٹ سے خوش ذوقی کا اظہار ہوتا تھا اور خوشحالی کا بھی۔

''آپ دونوں کراچی سے بیگم صابرہ کی تلاش میں یہاں آئی ہیں؟'' دردانہ نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے خاصے چبھتے ہوئے انداز میں کہا اور تیز نظروں سے انہیں گھورا۔

''جی ہاں.....'' خالدہ مکرم نے جواب دیا۔ ''ہم کراچی سے بیگم صابرہ کی تلاش میں یہاں آئے ہیں؟''

''کیوں؟'' دردانہ نے پوچھا۔ ''آپ کو ان کی تلاش کیوں ہے؟ اور آپ کون

ہیں؟''

''آپ کے ان سوالوں کا جواب دینے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس بات کی تصدیق کر لیں کہ ہم صحیح جگہ پر پہنچے ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ لوگ وہی ہیں نا، جن کا خاندان چکوال میں بسوں کے اڈے کے قریب واقع بستی میں رہتا تھا اور آپ لوگ کے مکان کا پتہ یہ تھا۔'' خالدہ مکرم نے چکوال کے اس پرانے مکان کا پتہ بتاتے ہوئے کہا۔

''جی..... جی ہاں۔'' دردانہ نے قدرے سنبھل کر کہا۔ اس کے چہرے پر کچھ اور زیادہ پریشانی اور گہری سنجیدگی نیز درشتی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

''آپ اور فرید دو بھائی بہن تھے۔'' خالدہ مکرم نے بات کو آگے بڑھایا۔ ''اور آپ کے والد کو کسی جھگڑے کے دوران ہلاک کر دیا تھا؟''

''جی..... جی ہاں.....'' دردانہ نے مختصر سا جواب دیا۔

خالدہ مکرم اور ماریہ کے ذہن میں اب پوری تصویر بالکل واضح ہو گئی تھی۔ انہوں نے فرید الحسن کے خاندان کو تلاش کر لیا تھا۔ صرف ایک ہی ثبوت اپنی جگہ پر مکمل اور ناقابلِ تردید حیثیت کا حامل تھا اور وہ تھا دردانہ کا وجود۔ دردانہ اور فرید کی شکلوں میں ایسی غیر معمولی مشابہت موجود تھی کہ ان دونوں کو ایک نظر دیکھ کر ہی کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ سگے بھائی بہن ہیں۔

''اچھا تو اس کا مطلب ہے کہ ہم بالکل صحیح جگہ پر آ گئے ہیں۔'' خالدہ مکرم نے مسکراتے ہوئے خوشدلی کے ساتھ فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''اب آپ مہربانی کر کے ہمیں اپنی والدہ صاحبہ سے ملوا دیجیے۔ باقی باتیں ان کی موجودگی میں ہی ہوں تو اچھا ہے۔ ہمیں اپنی بات دہرانی نہیں پڑے گی۔''

''امان یہاں نہیں ہیں۔'' دردانہ نے خالدہ مکرم کو کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''وہ اب کہیں بھی نہیں ہیں۔ ان کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔''

''اوہ.....'' خالدہ نے افسوس کے ساتھ کہا۔ ''بہت افسوس کی بات ہے، خدا ان کی مغفرت کرے۔ اچھا اب ہم اصل معاملے کی طرف آتے ہیں۔ بات یہ ہے دردانہ صاحبہ کہ آپ کا بھائی فرید الحسن اس وقت کراچی میں سخت مشکل میں گرفتار ہے۔ اس نے بلا کسی وجہ کے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ اس نے اپنا جرم بھی قبول کر لیا ہے لیکن وہ اپنی اس حرکت کی وجہ بتانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ اس کی وکیل ہیں۔'' خالدہ نے ماریہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''انہیں عدالت کی طرف سے ملزم کی پیروی کے لیے مقرر کیا گیا ہے،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن ملزم بالکل تعاون نہیں کر رہا ہے۔ وہ یہ بتانے کے لیے بالکل تیار نہیں ہے کہ اس نے ایک ایسے آدمی کو کیوں قتل کر ڈالا جس کے ساتھ اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی..... ہم اس سلسلے میں آپ کی مدد چاہتے ہیں۔ اگر فرید کی مدد نہیں کی گئی تو عدالت اسے پھانسی کی سزا دے دے گی۔''

''دیتی ہے تو دے دے۔'' دردانہ نے شعلہ بار نگاہوں سے خالدہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میری طرف سے ایک بار نہیں، دس بار اسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے..... میری بلا سے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔''

ماریہ اور خالدہ دونوں نے اپنی اب تک کی زندگی میں اس سے زیادہ غیر متوقع الفاظ آج تک نہیں سنے تھے۔ ان دونوں کا ہی یہ خیال تھا کہ دردانہ اپنے بھائی کے بارے میں سنتے ہی بے چین ہو جائے گی اور اس کی ہر طرح مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی۔ آخر وہ اس کا اکلوتا بھائی تھا اور وہ خود اس کی اکلوتی بہن تھی۔ والدین مر چکے تھے۔ وہ دونوں بھائی بہن ہی تو ایک دوسرے کا سہارا بن سکتے تھے..... لیکن دردانہ نے تو بڑی سفاکی کے ساتھ یہ سب کچھ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

''کیا مطلب؟'' خالدہ مکرم نے حیرت سے کہا۔ ''آپ..... اپنے بھائی کی کوئی مدد نہیں کرنا چاہتیں؟ کیسی بہن ہیں آپ؟''

''دیکھئے۔'' ماریہ نے معاملے کو ایک اور پہلو سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جلدی سے مداخلت کی۔ ''ہم آپ پر یہ بات پہلے ہی واضح کر دیں کہ ہم آپ سے کسی قسم کی روپے پیسے کی مدد نہیں چاہتے۔ ہم تو خود اپنے خرچ پر یہاں تک آئے ہیں۔ ہمیں آپ سے ایک پائی بھی نہیں چاہئے..... نہ وکیل کی فیس نہ عدالتی خرچہ..... ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں سمجھنے میں مدد دیجئے کہ آخر کے دماغ میں ایسی کون سی گرہ موجود ہے جس نے اس کو ایک ایسے شخص کے قتل پر اکسایا جس کے ساتھ اس کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔''

''دیکھئے میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' دردانہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''فرید ہمارے باپ کی موت کے بعد گھر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور پھر اس نے کبھی بھی پلٹ کر میری اور اماں کی خبر نہیں لی۔ ہمیں اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم..... اب اگر وہ قاتل یا ڈاکو بن گیا ہے تو اس کو قانون کے مطابق سزا ہونے دیجئے..... میں اس کو بچانے کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟ میرا تو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور نہ ہی مجھے اس کے معاملات سے کوئی دلچسپی ہے۔''

''آپ کے والد کا قتل کس سن میں ہوا تھا؟'' ماریہ نے پوچھا اور دردانہ نے سن بتا دیا۔

''چلئے، آپ کا اس سے کوئی تعلق نہ سہی اور آپ کو اس کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہ سہی، لیکن آپ اس کی نہ سہی ہماری ہی کچھ مدد کیجئے۔ ہمیں اس کے بارے میں کچھ بتائیے۔'' خالدہ نے کہا۔ ''آخر اس کے دماغ میں ایسی کیا چیز تھی۔''

''اس کے دماغ میں کیا تھا اور کیا نہیں تھا، مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' دردانہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ گھر سے بھاگ گیا تھا۔ کیا معلوم کن کن لوگوں کی صحبتوں میں رہ کر قاتل اور بدمعاش بن گیا۔ اب اس نے جو کچھ کیا ہے اس کی سزا بھگتے.....''

''اچھا ایک بات بتائیے۔'' خالدہ مکرم نے پوچھا۔ ''آپ کے والد صاحب کے قتل کی کیا وجہ تھی؟ انہیں کس شخص نے قتل کیا تھا اور کیوں؟''

''میرے والد کا ایک شخص سے جھگڑا ہو گیا تھا۔'' دردانہ حتی المقدور اختصار سے کام لے رہی تھی۔ ''میرے والد پر اس شخص کی کچھ رقم واجب الادا تھی۔ وہ شخص اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرنے ہمارے گھر آیا تھا۔ والد صاحب کے ساتھ اس کی کچھ گرما گرمی ہو گئی۔ والد صاحب نے اس پر حملہ کر دیا اور اس شخص نے جوابی کارروائی کی جس کے باعث والد صاحب ہلاک ہو گئے۔''

دردانہ خاموش ہو گئی، صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ قدرتی بات تھی۔ یہ کوئی ایسا دل خوش کن موضوع نہیں تھا جس پر وہ خوشی کے ساتھ بات کرتی۔ تاہم وہ واقعات کی کچھ تفصیل تو بتا سکتی تھی لیکن وہ بھی نہیں بتا رہی تھی۔

''اور اس کے بعد..... اس کے بعد مقدمہ چلا ہو گا؟'' ماریہ نے پوچھا۔ ''قاتل کو سزا بھی ہوئی ہو گی؟ یہ سب کچھ تو ہوا ہو گا؟''

''جی ہاں!'' دردانہ نے بیزاری سے کہا۔ ''ہوا تھا، قاتل کو سزا ہو گئی تھی۔'' اتنا کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گئی۔

''اور آپ کا بھائی..... فرید الحسن.....''

''میں نے آپ کو بتایا تو.....'' دردانہ نے ماریہ کی بات کاٹ کر کہا۔ ''والد کی موت کے بعد وہ گھر سے بھاگ گیا تھا اور تب سے آج تک میں نے نہ تو اس کی شکل دیکھی اور نہ اس کے بارے میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔''

خالدہ اور ماریہ نے بہت سارے مختلف سوالات میں مزید معلومات حاصل کرنے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوشش کی، لیکن دردانہ سے وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ معلوم کر سکیں۔

خالدہ مکرم نے اس کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا تعلق پولیس سے ہے اور وہ اگر چاہے تو اس کو زبان کھولنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ کیونکہ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس معاملے میں پولیس کے اختیارات کا کم از کم استعمال کیا جانا تھا۔

خالدہ مکرم اور ماریہ نے دردانہ سے اس کے پہلے شوہر منور علی کے انتقال اور خیر الدین کے ساتھ دردانہ کی دوسری شادی کے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا۔ کیونکہ ان تمام باتوں کا فرید کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ فرید تو اپنی ماں اور بہن کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل چکا تھا۔

''کیا آپ ایک بار کراچی آ کر اپنے بھائی سے آخری ملاقات نہیں کرنا چاہتیں جو عنقریب اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانے والا ہے؟'' ماریہ نے آخری نفسیاتی حربہ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے علاوہ اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ والدین زندہ نہیں ہیں اور آپ اس کی اکلوتی بہن ہیں۔''

''نہ میں اس کی بہن ہوں اور نہ وہ میرا بھائی ہے۔'' دردانہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ان دونوں ناخواندہ مہمانوں سے جلد از جلد جان چھڑانا چاہتی تھی۔

ان دونوں کے گھر سے نکلتے ہی دردانہ نے جلدی سے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس نے ان کو ٹھیک سے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔

''بہت عجیب و غریب اور پُراسرار قسم کا رویہ ہے اس عورت کا۔'' ماریہ نے کہا۔

''صاف ظاہر ہے کہ وہ کچھ اہم باتیں ہم سے چھپا رہی ہے۔ اس کے دل میں اپنے بھائی کے لیے جو نفرت کا زہر بھرا ہوا ہے۔ اس کی کوئی وجہ اس نے ہمیں نہیں بتائی۔ ہمارے بار بار کے پوچھنے کے باوجود اس نے کچھ نہیں بتایا۔''

''جبکہ یہ بات ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس خاندان کی حقیقی شناخت میں کوئی غلطی نہیں کی ہے۔'' خالدہ نے کہا۔ ''فرید اور دردانہ کی شکلیں اس سچائی کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔ ہم نے فرید کے خاندان کو تو تلاش کر لیا ہے لیکن یہ معاملہ سلجھنے کے بجائے کچھ اور الجھ گیا ہے۔ فرید اپنے باپ کے قتل کے بعد اپنے گھر سے کیوں بھاگا؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔ اس کی ماں تو زندہ ہے نہیں۔ جو ہم اس سے بھی کچھ پوچھ سکتے۔ لے دے کے ایک بہن ہے جو آدھا سچ بول رہی ہے اور اس کی یہ کوشش اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ

اس معاملے کی تہہ میں کوئی خاص بات ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں خالدہ آپا۔'' ماریہ نے کہا۔ ''پنجاب کے لوگ اور خاص طور سے خواتین عموماً خوش اخلاقی کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں۔ آپ پنجاب میں کسی اجنبی کے گھر بھی کسی کام سے چلے جائیں تو وہ ضرور آپ کی خاطر داری کرے گا۔ ہم نے اس عورت کو بتایا کہ ہم لوگ صرف اس کی ماں سے ملنے کے لیے کراچی سے آ رہے ہیں اور اس نے ہم کو ایک پیالی چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارا آنا اس پر کس قدر گراں گزرا تھا۔ وہ تو ہم سے کوئی بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجبوراً اس نے ہم سے اتنی بات بھی کر لی۔''

''اگر ضرورت پڑی تو ہم اس کو بولنے پر مجبور کر سکتے ہیں، لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو ہمیں اور بھی کام کرنے ہیں۔ ان کے نتیجے میں ہم کچھ اور جان سکیں گے۔ پھر ضرورت ہوئی تو دوبارہ اس سے بات کریں گے۔''

وہ دونوں چکوال واپس آ گئیں اور انہوں نے انسپکٹر لطیف حسین کو اس ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

''آپ فکر مت کیجیے۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے کہا۔ ''ہم دردانہ کی زبان کھلوا سکتے ہیں۔ بھلا پولیس کے لیے یہ کون سی مشکل بات ہے؟ اسے سب کچھ سچ سچ بتانا ہوگا؟''

''شکریہ سر۔'' خالدہ نے کہا۔ ''لیکن ابھی نہیں، ہم چاہتے ہیں کہ جب ہم دردانہ سے دوبارہ بات کریں تو ہمارے پاس اتنی معلومات ہوں کہ وہ ہم سے کچھ بھی نہ چھپا سکے اور نہ کچھ جھوٹ بول سکے۔''

''ٹھیک ہے۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے کہا۔

''اب ہمیں اس کیس کی فائل دیکھنی ہے جو فرید اور دردانہ کے والد کے قتل کے بارے میں ہے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''اس واقعے کی ساری تفصیلات ہمیں اس کیس کی عدالتی فائل کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔ دردانہ نے تو سارے معاملے کو محض چند جملوں میں نمٹا دیا۔''

''بہت پرانا کیس ہے۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے کہا۔ ''آپ لوگوں نے یہ بہت اچھا کیا کہ سال معلوم کر لیا۔ اب ہمیں کیس کی فائل تلاش کرنے میں آسانی ہوگی۔''

حمید الحسن کے مقدمہ قتل کی فائل کی تلاش کر لیا گیا اور پھر خالدہ مکرم اور ماریہ نے مل کر اس کا بڑی تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

استغاثہ کی کہانی کے مطابق بسوں کے اڈے کے قریب واقع بستی کے ایک مکان میں رہنے والے حمید الحسن نامی ایک شخص کے صفدر علی نامی ایک شخص کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے اور صفدر علی کا حمید الحسن کے گھر آنا جانا تھا۔ دونوں خاندانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات تھے۔

حمید الحسن نے صفدر علی سے کچھ رقم قرض لی تھی، جو اس نے وعدے کے مطابق ادا نہیں کی۔ صفدر علی نے بار بار رقم کا تقاضا کیا، لیکن حمید الحسن نے ہر بار اس کی بات کو ٹال دیا۔

اس روز رات کے وقت صفدر علی حمید الحسن کے گھر آیا۔ اسے پیسے کی سخت ضرورت تھی اور وہ حمید الحسن سے رقم کی واپسی کا تقاضا کرنے آیا تھا، لیکن حمید الحسن نے انکار کر دیا۔ اس پر صفدر علی نے سخت رویہ اختیار کیا۔ دونوں میں جھگڑا شروع ہو گیا اور حمید الحسن نے صفدر علی کو گالیاں دیتے ہوئے اسے اپنے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ صفدر علی نے کہا کہ وہ اپنی رقم لئے بغیر نہیں جائے گا۔ اس پر حمید الحسن مشتعل ہو گیا اور اس نے قریب ہی رکھی ہوئی سبزی کاٹنے کی لمبی سی چھری اٹھا کر صفدر علی پر حملہ کر دیا۔ صفدر علی نے وار بچایا اور چھری حمید الحسن کے ہاتھ سے چھین کر اس کے پیٹ میں اتار دی۔ حمید الحسن بری طرح زخمی ہوا اور اس نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔

یہ واقعہ مقتول کی بیوی صابرہ اور بیٹی دردانہ کی موجودگی میں پیش آیا تھا۔ صابرہ نے اپنے شوہر کو اشتعال میں آنے سے روکنے اور نرم رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن حمید الحسن غیظ و غضب کے عالم میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کی بھی ایک نہ سنی اور صفدر علی پر چھری سے حملہ کر دیا نتیجتاً صفدر علی کو بھی اپنی حفاظت کے لیے جوابی کارروائی کرنی پڑی اور یوں حمید الحسن صفدر علی کے ہاتھوں مارا گیا۔

مقتول کی بیوی اور بیٹی نے عدالت میں گواہی دیتے ہوئے جو کچھ کہا تھا، اس سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی تھی کہ قصور سراسر مقتول کا تھا اور قاتل نے جو کچھ کیا وہ اپنی حفاظت کے لیے کیا۔ اس کا ارادہ حمید الحسن کو قتل کرنے کا ہرگز نہیں تھا۔

عدالت نے صفائی کے اس مؤقف کو تسلیم کیا کہ ملزم سے یہ جرم مجبوری کی حالت میں سرزد ہوا ہے، جس کی سب سے بڑی گواہ خود مقتول کی بیوی صابرہ اور بیٹی دردانہ تھیں۔ چنانچہ اس مخصوص صورت حال کے پیش نظر سیشن کورٹ نے ملزم کو صرف چار سال قید کی سزا دے دی۔ جیل کے ریکارڈ کے مطابق صفدر علی تقریباً دو سال کی مدت میں رہا ہو گیا تھا۔

یہ تھا اس مقدمے کا لبِ لباب..... ان دونوں نے اس پر مختلف پہلوؤں سے غور کرنا شروع کر دیا۔ اس گفتگو میں ان کے ساتھ انسپکٹر لطیف حسین بھی شریک تھا۔ جو اب اس

معاملے میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگا تھا۔ کیونکہ یہ اس کے ہی علاقے کا ایک پرانا لیکن الجھا ہوا اور غور و فکر کی دعوت دینے والا منفرد نوعیت کا کیس تھا۔

''اس سارے مقدمے کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک بات بالکل واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''اور وہ یہ کہ صابرہ اور دردانہ نے اپنے شوہر اور باپ کو بچانے کی کوئی کوشش نہیں بلکہ ان کی گواہی سراسر قاتل کی ہی حمایت میں جاتی ہے۔''

''ایک عام فطری اور نفسیاتی بات ہے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''شوہر یا باپ اگر خطا کار بھی ہے تو بھی بیوی یا بیٹی کی یہ کوشش نہیں ہوتی کہ وہ قاتل کے حق میں بیان دیں اور اس کو بری کرانے کی کوشش کریں جبکہ موجودہ کیس میں قاتل پورے طور سے معصوم بھی نہیں تھا۔ اصل میں تو کوئی کبھی بھی یہ نہیں جان سکے گا کہ اس لڑائی کی اصل صورت حال کیا تھی۔ اس قسم کے معاملات میں واقعات لمحوں کے اندر اس قدر تیزی کے ساتھ پیش آتے ہیں کہ صرف کیمرے کی ہی آنکھ انہیں پوری طرح دیکھ کر محفوظ کر سکتی ہے۔''

''جی ہاں۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے کہا۔ ''صابرہ اور دردانہ کے بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف حمید الحسن کو ہی موردِ الزام ٹھہرا رہی تھیں۔''

''اور اب ایک اور اہم بات یہ ہے کہ فرید کے گھر سے بھاگنے کی وجہ کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔'' خالدہ نے کہا۔ ''فی الحال اسے صرف ایک مفروضہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ شاید فرید کو اپنے باپ کے قتل کے کیس میں اپنی ماں اور اپنی بہن کا رویہ پسند نہ آیا ہو..... لیکن..... کیا اس وقت اس میں اتنی سمجھ تھی؟''

''سمجھ تو ہو سکتی ہے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''گو کہ ہم اس کا صحیح طور پر تعین نہیں کر سکتے کہ اس وقت فرید کی عمر کیا ہو گی، تاہم بعض بچے بہت حساس طبیعت کے مالک ہوتے ہیں اور فرید تو ایک بگڑا ہوا نفسیاتی کیس ہے۔''

وہ تینوں آپس میں اس کیس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک ماریہ چونک کر بولی۔ ''اوہو..... دیکھئے..... ہم نے ایک بے حد اہم نکتے پر تو غور ہی نہیں کیا۔''

''وہ کیا؟'' لطیف حسین نے جلدی سے پوچھا۔

''فرید کے باپ کو جس شخص نے قتل کیا تھا۔ اس کا نام صفدر علی تھا اور فرید نے کراچی میں جس شخص کو یعنی حیدر علی کو قتل کیا اس کے باپ کا نام بھی صفدر علی تھا..... تو..... کہیں یہ وہی صفدر علی تو نہیں ہے؟''

''مائی گاڈ!'' لطیف حسین کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''یہ تو واقعی نہایت اہم بات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے اور اگر یہ وہی صفدر علی ہے جس نے فرید کے باپ کو برسوں پہلے قتل کیا تھا تو پھر یہ معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ فرید کو اپنے باپ کے قاتل کی تلاش تھی لیکن اسے یہ معلوم ہو گیا کہ صفدر علی مر چکا ہے تو اس نے محض انتقاماً اپنے باپ کے قاتل کے بیٹے کو ہلاک کر دیا۔ ایک سیدھا سادا سا معاملہ بنتا ہے۔''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے اور ایسا نہیں بھی ہو سکتا ہے۔'' خالدہ مکرم نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''صفدر علی ایک بہت عام سا نام ہے اور اس نام کے ہزاروں لوگ ہوں گے۔ یہ ضروری نہیں کہ فرید کے ہاتھوں مارا جانے والا حیدر علی اسی صفدر علی کا بیٹا ہو جس نے فرید کے باپ کو مار دیا تھا لیکن ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ ہمیں اب اس نکتے پر خاص توجہ دینی ہو گی۔''

''بالفرض اگر ایسا ہے تو بھی اصل مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''اگر فرید نے اپنے باپ کے قاتل کے بیٹے کو قتل کیا ہے تو اس کو حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے اور پھر جب وہ سزائے موت کو گلے لگانے کے لیے تیار ہے تو یہ قبول کر لینے میں کیا ہرج ہے کہ اس نے اپنے باپ کے قاتل کے بیٹے کو ہلاک کیا ہے جبکہ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اس کے باپ کو حیدر علی کے باپ نے قتل کیا تھا؟ اگر یہ وہی صفدر علی ہے تو بھی فرید کے رویے کی وضاحت نہیں ہوتی۔''

''دراصل ناموں کی مماثلت بھی بعض اوقات بہت سی الجھنوں کا باعث بن جاتی ہے اور بعض اوقات تو عجیب قسم کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔'' خالدہ نے کہا۔ ''اب دیکھئے، ابھی ابھی مجھے ایک اور بات کا خیال آیا۔ فرید اور دردانہ کی ماں اور مقتول حمید الحسن کی بیوی کا نام صابرہ تھا اور اتفاق سے صفدر علی کی بیوی اور حیدر علی کی ماں کا نام بھی صابرہ ہی تھا..... یعنی یہاں قاتل اور مقتول دونوں ہی کی مائیں ہم نام تھیں۔''

''ہاں..... واقعی..... یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے کہا۔ ''اور اس سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ حیدر علی کا باپ صفدر علی وہی شخص ہو جس نے فرید کے باپ حمید الحسن کو قتل کیا تھا۔''

''اصل میں، اب ہمیں چکوال میں صفدر علی اور صابرہ کے خاندان کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''ہم نے فرید کے خاندان کے بارے میں تو بہت سی ضروری باتیں معلوم کر لی ہیں لیکن صفدر علی اور صابرہ کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔''

''اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس ان کے بارے میں کوئی سراغ موجود نہیں

ہے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''سوائے ایک نامعلوم اور مفقود الخبر عورت خالہ شکوراں کے..... اگر خالہ شکوراں کا پتہ چل جائے تو پھر اس خاندان کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے اور اس امر کی تصدیق بھی ہو سکتی ہے کہ آیا حیدر علی کا باپ وہی صفدر علی تھا جس نے فرید کے باپ کو قتل کیا تھا۔''

''آپ لوگوں کی عدم موجودگی میں، میں نے یہ کام شروع کروا دیا ہے۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے کہا۔ ''چکوال کوئی اتنی بڑی جگہ تو نہیں ہے۔ کئی لوگ اس وقت ایک ایسی بوڑھی عورت کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں جو چکوال سے کراچی جا کر وہاں ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد واپس چکوال آ گئی ہو۔ اس خاندان کے لوگوں کے نام بھی بتا دیے گئے ہیں۔ امید ہے کہ دو ایک دن میں کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

''مشکل یہ ہے کہ ہم لوگ زیادہ رک نہیں سکتے۔'' ایس آئی خالدہ مکرم نے کہا۔ ''پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ ہمیں گوجرانوالہ بھی جانا پڑا مگر فائدہ بہت ہوا۔ ہم بہت کچھ معلوم کرنے میں تو کامیاب ہو گئے ہیں لیکن ساتھ ہی بہت سے نئے سوالات بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر خالہ شکوراں کے ذریعے مقتول حیدر علی کے خاندان کے بارے میں بھی کچھ علم ہو جائے تو پھر نئے سرے سے سارے حالات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔''

''یہ ساری مشقت ہمیں صرف ایک شخص کی ناہموار اور غیر معتدل ذہنی کیفیت کی وجہ سے کرنی پڑ رہی ہے۔ اگر فرید خود ہی ہمیں سب کچھ بتا دیتا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔''

''لیکن پھر بات ہی کیا ہوتی ماریہ صاحبہ؟'' لطیف حسین نے ہنس کر کہا۔ ''پھر تو یہ کوئی کیس ہی نہ ہوتا۔ کچھ بھی نہ ہوتا۔ آپ ملزم کے بیان کی روشنی میں چند روز میں سارے معاملے کو نمٹا دیتیں، لیکن اب تو آپ نے ایک چیلنج قبول کیا ہے آپ ایک لڑائی لڑ رہی ہیں۔ ایسی لڑائیاں بھلا کون لڑتا ہے؟ کوئی بھی نہیں..... وکیل، پولیس والے، عدالتی کارندے، سب کے سب کیا کرتے ہیں؟ بس کیس کو دھکا دیتے ہیں اور اسے اپنی مرضی کا لباس پہنا کر رخصت کر دیتے ہیں اور لیجئے انصاف کے تقاضے پورے ہوئے۔ میں نے ڈی ایس پی غلام نبی جیسے لوگوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سچائی اور ذمہ داری کے ساتھ کام کرنا کس قدر دشوار ہوتا ہے اور آپ لوگ اسی جذبے کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ آپ ایک جنونی مجرم کے دماغ میں اترنے کا راستہ تلاش کر رہی ہیں۔ یہ ایک بہت اہم کوشش ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ لوگوں کو اس میں کامیابی حاصل ہو۔ اگر دو ایک دن میں خالہ شکوراں کا یا صفدر علی کے خاندانی پس منظر کا پتہ نہ چل سکا تو آپ لوگ واپس چلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائیے گا۔ یہاں چکوال میں اور اگر ضرورت پڑی تو گوجرانوالہ میں، میں اپنے طور پر اس کام کو جاری رکھوں گا اور آپ لوگوں کو نتائج سے فوری طور پر آگاہ کرتا رہوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ سر۔'' ماریہ نے کہا۔ ''آپ نے اب تک جو تعاون کیا ہے۔ اس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔''

''ہمارے پاس اور بھی کئی راستے ہیں۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''فرید کی بہن دردانہ نے تو تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا اور وہ اس معاملے کے بارے میں اصلیت کو چھپانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے، لیکن ہم اس کے شوہر خیرالدین سے بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ مانا کہ وہ دردانہ کا دوسرا شوہر ہے لیکن پھر بھی اسے اپنی بیوی اور اس کے خاندان کے ماضی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگا۔ اس نے اس عورت سے شادی کی ہے تو لازمی طور پر اس کے خاندان سے واقف ہونے کے بعد ہی کی ہوگی۔ ہمارے ہاں اور خاص طور سے قصباتی اور دیہی معاشرے میں شادیاں ویسے ہی تو نہیں ہو جاتیں۔ قصباتی اور دیہی معاشرے میں تو ذات، برادری، خاندان اور دوسری بہت سی باتوں کو دیکھا جاتا ہے اور پھر..... دردانہ تو بیوہ تھی۔ اس کے ساتھ دوسری شادی کرنے والے نے تو بہت چھان پھٹک کی ہوگی۔ ویسے دردانہ کی زبان سے سچ اگلوانے کے لیے ہم پولیس کے اختیارات کا بھی استعمال کر سکتے ہیں لیکن ابھی نہیں..... پہلے ہم اس کے شوہر سے بات کریں گے۔''

''آپ کا خیال صحیح ہے سر۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''ممکن ہے۔ جو باتیں دردانہ نے چھپائی ہیں وہ ساری کی ساری یا ان میں سے کچھ اس کے شوہر خیرالدین کے ذریعے معلوم ہو جائیں۔ اصل میں تو ہمیں اب یہ معلوم کرنا ہے کہ ان دونوں خاندانوں کے درمیان اگر کوئی روابطہ تھے تو ان کی نوعیت کیا تھی۔''

خالدہ مکرم نے کراچی فون کر کے غلام نبی سے دو بار بات کی تھی اور اب تک کی پیش رفت کے بارے میں اسے اختصار کے ساتھ بتا بھی دیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ اگر خالہ شکوراں کا جلد پتہ نہ چل سکا تو پھر وہ اور ماریہ کراچی آ جائیں گی اور ان کے ادھورے کام کو یہاں چکوال اور گوجرانوالہ میں انسپکٹر لطیف حسین پورا کرے گا اور نتائج سے انہیں آگاہ کر دے گا۔ ڈی ایس پی غلام نبی نے اس بندوبست پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا کہ انسپکٹر لطیف حسین ایک ذمہ دار اور قابل اعتماد پولیس افسر ہے اور وہ ضرور اس سلسلے میں وہ سب کچھ کرے گا جو اس کے بس میں ہے۔

اگلے دن جبکہ ایس آئی خالدہ مکرم اور ماریہ کراچی واپس جانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی تھیں کہ ان کے فون کی گھنٹی بجی۔ انسپکٹر لطیف حسین بول رہا تھا۔ فون خالدہ مکرم نے اٹھایا تھا۔

''ایک خوشخبری ہے خالدہ صاحبہ۔'' انسپکٹر لطیف حسین کی آواز خوشی سے کھنک رہی تھی۔ ''ہم نے خالہ شکوراں کو تلاش کر لیا ہے۔''

''واقعی؟'' خالدہ مکرم نے سخت اضطرابی اور ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''آپ نے اس کا پتہ کیسے چلا لیا؟ اور کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ وہی خالہ شکوراں ہے؟''

''بالکل وہی ہے۔'' لطیف حسین نے کہا۔ ''اس امر کی تصدیق ہو چکی ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔ پھر میں آپ کو بتاؤں گا کہ شکوراں ہمیں کس طرح ملی۔''

خالدہ مکرم نے جب فون بند کیا تو ماریہ حیرت اور خوشی کے عالم میں اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''تو بالآخر خالہ شکوراں کا پتہ چل ہی گیا؟'' اس نے خالدہ مکرم کی کہی ہوئی باتوں کو سن کر کہا۔

''ہاں ماریہ.....'' خالدہ مکرم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''قسمت نے ہمارا ساتھ دیا۔ خالہ شکوراں مل گئی ہے۔ اب صفدر علی اور صابرہ کے خاندان کے سارے اسرار و رموز کا بھی پتہ چل جائے گا۔''

وہ دونوں بڑی بے چینی کے ساتھ انسپکٹر لطیف حسین کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔ لطیف حسین نے وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

''میں تو خود جلد از جلد آپ لوگوں کے پاس پہنچ کر آپ کو اس تازہ کامیابی کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ قسمت نے ہمارا ساتھ دیا.....''

وہ دونوں منتظر تھیں کہ لطیف حسین انہیں اصل بات سے آگاہ کرے۔

''میں نے خالہ شکوراں کی تلاش کا کام جن لوگوں کے سپرد کیا ہوا تھا ان میں ایک لیڈی ہیڈ کانسٹیبل بھی شامل ہے۔ جس کا نام رشیدہ ہے۔'' لطیف حسین نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''رشیدہ کل ایک قریبی گاؤں میں اپنے رشتے داروں میں ایک شادی ہوگئی ہوئی تھی۔ اس شادی میں اس کی ملاقات اسی گاؤں میں رہنے والی ایک ایسی عورت سے ہوئی جو ایک طویل عرصے تک کراچی میں رہ چکی تھی۔ اس عورت کا نام شکوراں تھا اور وہ مہمان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیہاتی عورتوں کو کراچی کے بارے میں بڑی بڑی باتیں بتا کر انہیں حیرت زدہ کر رہی تھی۔
میں نے رشیدہ کو خالہ شکوراں کے تمام کوائف اچھی طرح سے بتا دیئے تھے جو اسے یاد تھے۔
رشیدہ ایک ہوشیار اور ذہین عورت ہے۔ اس نے باتوں باتوں میں خالہ شکوراں سے سب کچھ معلوم کر لیا کہ وہ کراچی میں کون سے علاقے میں رہتی تھی۔ اپنے کن رشتے داروں کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کے نام اور کام کیا تھے۔ تصدیق ہو گئی کہ یہ وہی خالہ شکوراں ہے جو کراچی کے علاقے کورنگی کے ایک کوارٹر میں اپنے رشتے داروں صفدر علی اور صابرہ کے ساتھ رہتی تھی کے جن دو بیٹے تھے۔ رشیدہ نے بیٹوں کے نام بھی معلوم کر لیے۔ اکبر علی اور حیدر علی..... تو اب کیا کسر رہ جاتی ہے؟''

''کچھ بھی نہیں..... کوئی بھی نہیں۔'' خالدہ مکرم نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''یہ سب کچھ تو بالکل واضح ہے اور آپ کی اس لیڈی کانسٹیبل کی ذہانت کی داد دینی چاہئے کہ اس نے یہ سب کچھ خوش اسلوبی کے ساتھ معلوم کر لیا۔''

''میں نے رشیدہ کو اس معاملے کے اہم نکات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ خالہ شکوراں کے بارے میں وہ ساری باتیں اچھی طرح سمجھا دی تھیں جو آپ لوگوں کی زبانی مجھے معلوم ہوئیں۔'' لطیف حسین نے کہا۔ ''نصیر پور چکوال کے قریب ایک گاؤں ہے۔ خالہ شکوراں وہیں رہ رہی ہے۔ اس کا پتہ وغیرہ سب معلوم ہو چکا ہے۔''

''تو..... رشیدہ نے یہ بھی معلوم کر لیا ہو گا کہ وہ اب کن لوگوں کے ساتھ رہتی ہے۔'' ماریہ نے پوچھا۔ ''اس کے اپنے عزیز رشتے دار.....''

''جی ہاں، رشیدہ نے بہت کچھ معلوم کر لیا ہے۔'' لطیف حسین نے کہا۔ ''خالہ شکوراں کا شوہر اس وقت ملازمت کے سلسلے میں اپنے شہر سے باہر چلا گیا تھا جب خالہ شکوراں کی عمر صرف بیس سال کی تھی۔ وہ دن اور آج کا دن..... وہ لوٹ کر واپس نہیں آیا اور نہ ہی اس کی کوئی خیر خبر ملی۔ دن پر دن اور سال پر سال گزرتے گئے۔ خالہ شکوراں کے کوئی اولاد بھی نہیں تھی جو اس کا سہارا بن سکتی۔ وہ نہ بیواؤں میں تھی نہ سہاگنوں میں۔ کئی لوگوں نے اس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ عدالت سے رجوع کرے اور اپنے شوہر کے ساتھ اپنے نکاح کی تنسیخ کروا کے پھر سے اپنا گھر آباد کر لے، کیونکہ ایک خاص مدت کے بعد مذہب اور قانون دونوں اس کی اجازت دیتے ہیں، لیکن خالہ شکوراں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ چونکہ اس کا اپنا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ اس لیے وہ اپنے دور یا نزدیک کے کسی نہ کسی رشتے دار کے ہاں رہتی رہی۔ وہ جہاں بھی جا کر رہتی۔ وہاں گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتی

اور کسی پر بوجھ نہیں بنتی تھی۔ اس کے عوض اس کو سر چھپانے کا ٹھکانہ اور دو وقت کی روٹی اور کپڑا مل جاتا تھا۔ اسی طرح اس نے اپنی تقریباً ساری زندگی گزار دی۔ اور ان دنوں وہ اپنے ایک عزیز کے گھر گاؤں نصیر پور میں رہ رہی ہے۔ وہاں وہ اس کے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے اور گھر کے کام کاج میں حصہ لیتی ہے۔ اس گھر کے لوگ اسے اپنے لیے ایک زحمت نہیں، بلکہ رحمت سمجھتے ہیں۔''

''تقدیر بھی انسان کے ساتھ کیسے کیسے مذاق کرتی ہے۔'' ماریہ نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''خالہ شکوراں بے چاری نے کون سا جرم کیا تھا جس کی یہ خوفناک سزا اس کو مل رہی ہے! بھلا بیس سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ اس غریب عورت نے اپنی ساری زندگی ایک بے نام انتظار میں گزار دی۔ ایک موہوم سی امید کے سہارے کہ شاید اس کا گم شدہ شوہر کبھی واپس آ جائے۔''

''ایسے لوگوں کے درد کا اندازہ لگانا کوئی آسان بات نہیں ہے ماریہ صاحبہ!'' انسپکٹر لطیف حسین نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ سب کچھ بہت ہی زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ امید کی شمع انسان کے دل میں جلتی اور بجھتی رہتی ہے اور انسان خود جل جل کر تمام ہوتا رہتا ہے۔''

''اور ان حالات میں اپنے آپ کو خوش اور مطمئن رکھنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ ایسا انسان تو اپنے آپ کو ہر وقت سولی پر لٹکا ہوا پاتا ہے۔'' ماریہ نے کہا۔

''جی ہاں۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے کہا۔ ''خالہ شکوراں ایسے ہی حالات کا شکار ہونے والی ایک عورت ہے۔ اس کا اپنا کوئی گھر۔ کوئی خاندان نہیں ہے۔ وہ بس دوسروں کے گھروں میں رہ کر ان کی اور ان کے گھروں کے خدمت کر کے اپنے لیے رزق حاصل کرتی رہی ہے اور اس نے ایک طویل عرصہ کراچی میں اپنے رشتے داروں صفدر علی اور اس کی بیوی صابرہ کے ساتھ گزارا ہے۔''

''تو گویا اب ہمیں اس خزانے کی کنجی مل گئی ہے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔

''جی ہاں۔'' لطیف حسین نے کہا۔ ''اور ہیڈ کانسٹیبل رشیدہ نے اس کے بارے میں ایک اور بات بھی بتائی۔ وہ یہ کہ خالہ شکوراں بہت سے خاندانوں کے اہم رازوں کی امین بھی ہے۔ وہ چونکہ وقفے وقفے سے مختلف گھرانوں میں رہتی رہی ہے اس لیے وہ ہر اس گھرانے کے اندرونی رازوں اور حالات سے بخوبی واقف ہے جہاں وہ رہ چکی ہے۔ وہ جس گھرانے میں بھی رہتی تھی۔ وہاں ایک فرد کی حیثیت سے ہی رہتی تھی اور ظاہر ہے کہ اس حیثیت میں گھر کا کوئی راز اس سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ چوبیس گھنٹے اس گھر میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موجود رہتی تھی۔''

''اسے اپنے قیمتی رازوں میں سے کچھ حصہ ہمیں ضرور منتقل کرنا پڑے گا۔'' ماریہ نے کہا۔''ہم کب اس سے ملاقات کے لیے چلیں گے؟''

''کل.....'' انسپکٹر لطیف حسین نے جواب دیا۔''ہم کل ہی گاؤں نصیر پور چلیں گے۔ ہیڈ کانسٹیبل رشیدہ بھی ہمارے ساتھ ہوگی۔ شکوراں کی شناخت تو اس نے کی تھی۔''

اس کے بعد وہ لوگ کافی دیر تک شکوراں کے ساتھ کی جانے والی گفتگو کی تیاری کرتے رہے انہیں اس سے بات چیت کے دوران ایک ایسا طریق کار اختیار کرنا تھا جس کے نتیجے میں شکوراں نہ تو ان سے کوئی بات چھپا سکے اور نہ کچھ جھوٹ بول سکے۔ انہوں نے اس سے ملاقات کے لیے ایک لائحہ عمل طے کرلیا۔

لطیف حسین کے رخصت ہو جانے کے فوراً بعد خالدہ مکرم نے کراچی میں ڈی ایس پی غلام نبی کو فون کیا اور اسے اس تازہ ترین کامیابی کی اطلاع دی کہ خالہ شکوراں کا پتہ چل گیا ہے اور کل وہ لوگ انسپکٹر لطیف حسین کے ساتھ اس سے ملاقات کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔

''یہ بہت بڑی خبر ہے۔'' غلام نبی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔''میں تمہیں کوئی مشورہ نہیں دوں گا کہ تم اس سے کس طرح سے بات کرو۔ کیونکہ تم خود ایک ذہین اور باصلاحیت پولیس افسر ہو اور تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ کس صورت حال میں کیا کرنا چاہئے اور لطیف حسین بھی ہوشیار آدمی ہے۔ ماریہ بھی تمہارے ساتھ ہوگی۔ تم تینوں مل کر ایک بہت اچھی ٹیم کی تشکیل کرتے ہو۔ لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی باتوں کو ان کی زبان تک لے آنا ایک مشکل فن ہے اور تم تینوں اس فن سے بخوبی واقف ہو۔''

''بہت بہت شکریہ سر۔'' خالدہ مکرم نے ممنونیت کے گہرے احساس کے ساتھ کہا۔ ''ہماری کوشش ہوگی کہ ہم اس سے سب کچھ معلوم کرلیں اور اس کے فوراً بعد ہم ضروری معلومات سے لدے پھندے کراچی واپس آجائیں گے۔''

''میں تم لوگوں کی واپسی کا انتظار کروں گا۔'' غلام نبی نے کہا۔

اگلی صبح کو وہ دونوں تیار ہو کر لطیف حسین کا انتظار کر رہی تھیں۔ ایس آئی خالدہ مکرم اس وقت اپنی پولیس کی یونیفارم میں تھی۔

لطیف حسین وقت مقررہ پر آ گیا۔ اس کے ساتھ لیڈی ہیڈ کانسٹیبل رشیدہ بھی تھی اور وہ دونوں بھی اپنی اپنی وردی میں ملبوس تھے۔

انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ وہ خالہ شکوراں کے پاس پولیس والوں کی حیثیت سے،

پولیس کی وردی میں ہی جائیں گے اور اسے یہ بتائیں گے کہ یہ ایک قتل کی تفتیش کا معاملہ ہے۔ جس میں پولیس کے ساتھ تعاون نہ کرنا یا حقائق کو چھپانا قانوناً جرم ہے وغیرہ وغیرہ۔

لیڈی ہیڈ کانسٹیبل نے کراچی سے آنے والی باوردی سب انسپکٹر لیس خالدہ مکرم کو سیلوٹ کیا اور اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ بڑی اسمارٹ اور چاق و چوبند پولیس افسر نظر آ رہی تھی وہ.....اور اس کے ساتھ وہ خاتون وکیل اور سماجی کارکن ماریہ بلگرامی..... دونوں ہی بڑی مستعد اور چوکس نظر آ رہی تھیں۔

''تم نے بہت شاندار کارنامہ سرانجام دیا ہے رشیدہ۔'' خالدہ مکرم نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔''سر تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے۔ تم واقعی ایک ذہین پولیس کارکن ہو۔''

''شکریہ میڈم!'' رشیدہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔''وہ جی.....بس اتفاق سے میں نے اس محفل میں اس عورت کی باتیں سن لیں جو کراچی کے بارے میں بڑی بڑھکیں مار رہی تھی۔ میں نے ایک عورت سے اس کا نام پوچھا تو اس نے شکوراں بتایا۔ بس تب مجھے ایک دم خیال آیا کہ سر نے مجھ سے جس عورت کے بارے میں کہا تھا اس کا نام بھی شکوراں تھا۔ پھر میں نے اپنا کام شروع کر دیا اور خوش قسمتی سے یہ وہی عورت نکلی۔''

''ایک پولیس والے کی خصوصیت یہی ہے کہ اسے اپنی آنکھیں اور کان ہر وقت کھلے رکھنے چاہئیں۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے کہا۔''اور ایک پولیس والے کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ وہ صرف ڈیوٹی کے اوقات میں ہی ڈیوٹی پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر وقت ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔ جس وقت بھی ضرورت ہو اسے فوراً ہی فعال ہو جانا چاہئے۔ تم نے ایک اچھی پولیس کارکن ہونے کا مظاہرہ کیا ہے۔''

☆======☆======☆

گاؤں نصیر پور چکوال کے مضافات میں واقع تھا۔ اس گاؤں کی اپنی کوئی علیحدہ خصوصیت یا شناخت نہیں تھی۔ یہ چکوال کے بہت سارے مضافاتی گاؤوں میں سے ایک تھا اور چکوال سے کوئی پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ وہ لوگ جلد ہی نصیر پور پہنچ گئے۔

نصیر پور ایک خاصا بڑا گاؤں تھا اور اس میں زندگی کی سرگرمیاں نظر آ رہی تھیں۔ گاؤں میں ایک بازار بھی تھا، جہاں کی دکانوں میں عورتوں کی کچھ تعداد بھی نظر آ رہی تھی۔ ان لوگوں کی گاڑی ایک مکان کے دروازے کے آگے جا کر رکی۔ جس کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ گاؤں کے بہت سارے مکانوں کے دروازے ادھ کھلے تھے اور بعض تو پورے کھلے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں کے لوگوں کو اس بات کا کوئی خوف نہ ہو کہ کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زبردستی ان کے گھروں میں گھس آئے گا۔ گاؤں میں امن وسکون کی فضا کا احساس ہوتا تھا۔

گاڑی کے ڈرائیور نے جو کانسٹیبل کی وردی میں تھا نیچے اتر کر دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر کے بعد ایک نوعمر لڑکا باہر نکل کر آیا اور دروازے پر پولیس والوں کی گاڑی کو دیکھ کر ایک دم سے خوفزدہ ہوگیا۔

''قاسم خاں ٹھیکے دار کا مکان یہی ہے؟'' پولیس کانسٹیبل نے لڑکے سے پوچھا۔

''جی ہاں، یہی ہے۔'' لڑکے نے جواب دیا۔ ''مگر ابا تو گھر پر نہیں ہیں۔ وہ شہر گئے ہوئے ہیں شام سے پہلے نہیں آئیں گے۔''

اسی وقت انسپکٹر لطیف حسین بھی گاڑی سے اتر کر نیچے آ گیا اور لڑکے کی بات سن کر اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہمیں تمہارے ابا سے کوئی کام نہیں ہے۔ ہمیں شکوراں سے کام ہے۔ شکوراں یہیں رہتی ہے؟''

''جی ہاں۔'' سہمے ہوئے لڑکے نے جواب دیا۔ ''وہ یہیں رہتی ہیں۔''

''اچھا..... تو ان کو بلا کر لاؤ''۔ لطیف حسین نے کہا۔ ''ان سے کہنا شہر سے پولیس والے آئے ہیں..... کچھ بات کرنا چاہتے ہیں''۔

''جی اچھا۔'' لڑکے نے کہا اور جلدی سے اندر غائب ہوگیا۔

چند منٹ کے بعد اندر سے دو عورتیں نمودار ہوتی۔ وہ نوعمر لڑکا بھی ان کے ساتھ تھا۔ ان میں سے ایک نوجوان عورت تھی اور دوسری بوڑھی عورت..... صاف ظاہر تھا کہ بوڑھی عورت ہی شکوراں ہوسکتی تھی۔ اس اثنا میں تینوں خواتین بھی گاڑی میں سے اتر کر نیچے آ چکی تھیں، جن میں سے دو پولیس کی وردی میں ملبوس تھیں۔

آنے والی عورتوں نے سہمی ہوئی خوفزدہ نظروں سے دروازے پر کھڑی ہوئی پولیس پارٹی کو دیکھا۔

''تم میں سے شکوراں کون ہے؟'' لطیف حسین نے سوال کیا اور جواب میں بوڑھی عورت نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔

''جی صاحب جی..... میں ہوں شکوراں۔''

''اچھا، تو تم شکوراں ہوں۔'' لطیف حسین نے رشیدہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور رشیدہ نے آہستہ سے گردن ہلا کر اس کے بیان کی تصدیق کر دی۔ اس اثنا میں شکوراں بڑے غور سے رشیدہ کو دیکھ رہی تھی۔ شاید اس نے اس کو پہچان لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے خوف کے سائے اور بھی زیادہ گہرے ہوگئے.....

لیکن اس نے رشیدہ سے کچھ کہا نہیں۔

''تم وہی شکوراں ہو جو کراچی میں کورنگی میں صفدر علی اور اس کی بیوی صابرہ کے ساتھ ایک لمبے عرصے تک رہتی رہیں اور پھر واپس چکوال آئیں؟'' لطیف حسین نے پوچھا۔

''جی ہاں صاحب جی..... میں..... میں وہی شکوراں ہوں۔ میں کراچی میں صفدر علی اور صابرہ کے ساتھ رہتی تھی۔ مگر..... بات کیا ہے صاحب جی؟ میں تو.....''

''سنو شکوراں!'' لطیف حسین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ لوگ تمہاری تلاش میں کراچی سے آئی ہیں۔'' اس نے خالدہ مکرم اور ماریہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو یہیں کسی جگہ بیٹھ کر بات ہوسکتی ہے، لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ہمارے ساتھ تھانے چلو..... وہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات ہو جائے گی۔''

''آپ انہیں تھانے نہ لے جائیے۔'' شکوراں کے ساتھ موجود دوسری عورت نے جلدی سے کہا۔ ''آپ یہیں بیٹھ کر ان سے بات کر لیجئے۔ میں بیٹھک کھول دیتی ہوں۔ آپ لوگ اندر بیٹھ کر بات کر لیجئے۔'' اور اس نے لڑکے سے کہا کہ وہ جا کر بیٹھک کھول دے۔ لڑکا جلدی سے اندر چلا گیا۔

''بات کیا ہے صاحب جی؟'' دوسری عورت نے سہمے ہوئے لہجے میں لطیف حسین سے پوچھا۔ ''پولیس کو ماسی شکوراں سے کیا کام آن پڑا؟''

''یہ بتائیں گی۔'' لطیف حسین نے خالدہ مکرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اتنی دور کا سفر کر کے کراچی سے یہاں آئی ہیں۔ صرف شکوراں سے ملنے کے لیے..... جسے کراچی میں اس کے گھر کے لوگ خالہ شکوراں کے نام سے جانتے تھے۔''

''جی ہاں صاحب جی.....'' شکوراں نے جلدی سے کہا۔ ''وہاں کراچی میں لوگ مجھے خالہ شکوراں ہی کہتے تھے۔ وہاں ماسی نہیں کہتے تھے۔''

اس اثنا میں لڑکے نے بیٹھک کھول دی تھی اور وہ دوسری عورت بیٹھک کے بیرونی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

''اچھا تو بات یہ ہے خالہ شکوراں کہ ہم لوگ کراچی سے ایک قتل کی تحقیقات کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔'' خالدہ مکرم نے شکوراں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گہری اور بھاری آواز میں کہا۔ ''اور تم سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ق ق ..... قتل؟'' شکوراں کی آواز کانپنے لگی۔ ''کس کا قتل؟ نا بیگم صاحبہ جی..... میرا تو کسی قتل سے کوئی واسطہ نہیں..... میں..... تو.....''

''دیکھو خالہ شکوراں، ڈرو نہیں۔'' خالدہ مکرم نے اس کی ہمت بندھائی۔ ''میں نے یہ نہیں کہا کہ تمہارا کسی قتل سے کوئی واسطہ ہے۔ ہم لوگ ایک قتل کی تفتیش کر رہے ہیں اور تم قتل ہونے والے شخص کے خاندان کے بارے میں سب کچھ جانتی ہو۔ قانون کو تمہاری مدد درکار ہے اور اتنی بات تو تم بھی جانتی ہو کہ قانون کی مدد نہ کرنا بھی جرم ہے اور جان بوجھ کر قانون کو دھوکا دینا اور جھوٹ بولنا بھی جرم ہے۔ ایک شہری کے لیے ضروری ہے کہ وہ قانون کی پوری مدد کرے۔ خاص طور سے ایسے معاملے میں جس کا تعلق ایک انسان کے قتل سے ہو۔''

''میں جھوٹ کیوں بولوں گی جی؟'' شکوراں نے کمزور آواز میں کہا۔ ''اگر مجھے کچھ معلوم ہے تو میں ضرور بتاؤں گی۔ کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ کس کا قتل ہوا ہے؟ آپ مجھے بتائیں.....''

''اچھا تو خاتون، آپ ذرا ہم لوگوں کو اکیلا چھوڑ دیجیے۔'' خالدہ مکرم نے خاتونِ خانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگ خالہ شکوراں سے تنہائی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ کی موجودگی میں وہ ہم سے کھل کر بات نہ کرسکیں۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' خاتونِ خانہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ لوگوں کے لیے کچھ چائے وغیرہ کا بندوبست.....''

''نہیں نہیں..... شکریہ..... بالکل نہیں.....'' خالدہ مکرم نے اس کو منع کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگ اس وقت اپنی ڈیوٹی کر رہے ہیں۔ ڈیوٹی کے دوران ہم کسی کے گھر کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں۔''

''جیسی آپ کی مرضی.....'' اور وہ عورت لڑکے کو ساتھ لے کر بیٹھک کے اندرونی دروازے سے اندر چلی گئی۔ لطیف حسین کے اشارے پر رشیدہ نے دروازے کو بند کردیا۔

''اچھا تو خالہ شکوراں، تم صفدر علی اور صابرہ کے بیٹوں اکبر علی اور حیدر علی کو تو ضرور اچھی طرح جانتی ہوگی؟'' گفتگو کا آغاز ماریہ نے کیا۔ جواب تک خاموش تھی۔

''لو جی..... کیوں نہیں جانوں گی؟'' شکوراں نے فوراً کہا۔ ''دونوں میری گودوں کے کھلائے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کی بہت خدمت کی ہے اور ان کے ماں باپ کی بھی بہت خدمت کی ہے''۔

''صفدر علی اور صابرہ چکوال کے ہی رہنے والے تھے اور یہاں سے کراچی میں جا بسے تھے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''تم ان کے ساتھ ہی کراچی گئی تھیں یا بعد میں گئیں؟''

''میں بھی ان کے ساتھ ہی کراچی گئی تھی۔'' شکوراں نے کہا۔ ''بس وہ دونوں تھے۔ ان کے دو چھوٹے چھوٹے بچے..... اکبر علی اور حیدر علی..... اور میں..... بس جی یہ پانچ بندے تھے جو ایک ساتھ کراچی پہنچے تھے۔''

''پھر تم نے ایک لمبا عرصہ کراچی میں گزارا۔'' ماریہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہاں تک کہ حیدر علی کی شادی بھی ہوگئی۔ اس کے بعد تم کراچی چھوڑ کر چکوال آگئیں۔ کیا اس عرصے کے دوران تم کبھی چکوال آئیں؟''

''جی نہیں۔'' شکوراں نے جواب دیا۔

''کیا صفدر علی یا صابرہ میں سے کوئی کبھی چکوال آیا؟'' ماریہ نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' شکوراں نے کہا۔ ''وہ دونوں پھر کبھی چکوال نہیں آئے۔''

''تم نے اتنے برسوں کے بعد چکوال واپس آنے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

''بڑھاپے نے مجھے ستانا شروع کردیا جی.....'' شکوراں کی آواز میں گہرا درد گھلا ہوا تھا۔ ''سمندری ہوا مجھے بیمار ڈال رہی تھی، جوڑوں میں بہت درد رہنے لگا تھا۔ سانس کی تکلیف بھی ہو رہی تھی۔ کافی علاج کروایا۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پھر کسی نے مشورہ دیا کہ آب وہوا کی تبدیلی کے لیے پنجاب چلی جاؤں۔ سوچا تو یہ تھا کہ کچھ دنوں رہ کر واپس کراچی چلی جاؤں گی، لیکن یہاں آئی تو پھر کئی برس گزر گئے۔ یہاں سے نکل ہی نہ سکی۔ عزیز رشتے دار مجھے بلاتے رہے اور اپنے گھروں میں رکھتے رہے۔ میں کسی سے انکار نہیں کرسکی بیگم صاحب..... اور جب تک بندے کے ہاتھ پیر چلتے رہتے ہیں وہ کام کرنے کے قابل رہتا ہے۔ تب تک وہ سب لوگ اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ جنہیں اس کی ضرورت ہوتی ہے اور جب اس کے ہاتھ پیر تھک جاتے ہیں تو پھر کوئی نہیں پوچھتا..... ابھی تو میرے ہاتھ پیر چل رہے ہیں۔ پنجاب واپس آنے کے بعد صحت بھی کافی ٹھیک ہوگئی..... بس جی..... اللہ مالک ہے..... ان دنوں میں یہاں ٹھیکے دار قاسم خاں کے گھر میں رہ رہی ہوں۔ میری نند کا سسرالی رشتے دار ہے۔ اچھے لوگ ہیں سارے گھر کا حساب کتاب میرے ہاتھ میں دے رکھا ہے۔''

ان لوگوں کو اندازہ ہوگیا کہ شکوراں کو بہت زیادہ بولنے کی عادت ہے اور اس کی اس عادت کی وجہ سے رشیدہ نے اس کو پہچان بھی لیا تھا۔ انہوں نے اس کو ٹوکا نہیں، بولنے دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس میں انہی کا فائدہ تھا۔ وہ ان معاملات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکتے تھے۔

''ان سے تو اس دن شادی میں ملاقات ہوئی تھی اور بہت سی باتیں بھی ہوئی تھیں۔''

شکوراں نے رشیدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کا خوف کافی دور ہو چکا تھا۔

''لیکن تب یہ پولیس کی وردی میں نہیں تھیں اور انہوں نے یہ بتایا بھی نہیں کہ پولیس کے لوگ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں..... اور آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کو کون قتل ہو گیا ہے۔''

''میں بتاتی ہوں کون قتل ہو گیا۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''حیدر علی قتل ہو گیا ہے..... صفدر علی اور صابرہ کا چھوٹا بیٹا..... جسے تم نے اپنی گود میں کھلایا تھا۔''

''ہائے ربا.....'' شکوراں کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔ ''حیدر علی! ہائے میرا حیدر علی؟ میرا بچہ..... ارے کیوں قتل کر دیا اسے؟ کس نے قتل کر دیا؟'' شکوراں ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور کچھ دیر تک اسی طرح روتی اور بین کرتی رہی۔ جب وہ ذرا پُرسکون ہوئی تو خالدہ مکرم نے دوبارہ سلسلہ گفتگو شروع کیا۔

''حیدر علی کو جس شخص نے قتل کیا ہے۔ اس کے خاندان کا تعلق بھی چکوال سے ہی ہے۔'' خالدہ نے کہا۔ ''ہم نے اس خاندان کے لوگوں کو چکوال میں تلاش کر لیا ہے اور ان کے بارے میں بہت سی ضروری باتیں معلوم کر لی ہیں، لیکن ہم مقتول کے خاندان کو چکوال میں اب تک نہیں تلاش کر سکے ہیں۔ اگر ہم مقتول کے خاندان کو بھی تلاش کر لیں تو پھر اس قتل کی وجہ کو آسانی کے ساتھ جان سکیں گے۔ ہمیں قاتل کی تلاش نہیں ہے۔ قاتل تو ہمارے قبضے میں ہے اور اس نے اپنے جرم کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔ نہ بھی کرتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کیونکہ ہمارے پاس عینی گواہ موجود ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ قاتل یہ نہیں بتا رہا ہے کہ اس نے قتل کیوں کیا۔ اس کے لیے ہم ساری چھان بین کر رہے ہیں.....''

''ہے ربا..... میرا بچہ قتل ہو گیا اور مجھے اس کی خبر بھی نہیں ہو سکی۔'' شکوراں ایک بار پھر رونے لگی۔ ''میں بھی کیسی بدبخت ہوں۔ ایک بار وہاں سے آنے کے بعد میں پھر کبھی وہاں گئی ہی نہیں..... ہائے..... اور وہ قاتل یہ بھی نہیں بتا رہا ہے کہ اس نے اسے کیوں قتل کر دیا۔ مگر بیگم صاحب..... یہ بات میں کیسے بتا سکوں گی کہ اس قاتل نے میرے بچے کو کیوں قتل کر ڈالا۔ میں بھلا اس بارے میں کیا جانتی ہوں۔''

''یقیناً تم یہ بات نہیں جانتی ہو گی۔'' ماریہ بولی۔ ''لیکن قاتل کے گھرانے کے بارے میں جان کر تم یہ ضرور بتا سکو گی کہ ان دونوں گھرانوں کے درمیان کس قسم کے تعلقات تھے اور کیا کوئی پرانی دشمنی اس قتل کی وجہ ہو سکتی ہے۔ قاتل کا نام فرید الحسن ہے۔

اس کے باپ کا نام حمید الحسن تھا۔ جسے صفدر علی نامی ایک شخص نے جھگڑے کے دوران قتل کر دیا تھا۔ فرید الحسن اس واقعے کے بعد سے اپنے گھر سے بھاگ گیا تھا اور پھر اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ برسوں بعد فرید الحسن نے کراچی میں حیدر علی نامی ایک ایسے شخص کو بلاوجہ قتل کر دیا جس کی اس کے ساتھ نہ کوئی دشمنی تھی نہ کوئی جھگڑا۔ اس نے اچانک ہی گلی میں چبوترے پر بیٹھے ہوئے حیدر علی کے سر پر لوہے کا بھاری سریا مار کر اسے ہلاک کر دیا۔''

اچانک شکوراں کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور خوف کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔ وہ بالکل خاموشی کے ساتھ ماریہ کی شکل دیکھ رہی تھی۔ سب لوگ خاموش ہو گئے تھے۔

''تم فرید الحسن ولد حمید الحسن کے خاندان کے بارے میں بھی ضرور کچھ نہ کچھ جانتی ہو گی۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''اور صفدر علی کے خاندان سے بھی تم خوب واقف ہو۔ اب ان دونوں خاندانوں کے تعلق کے بارے میں تمہیں جو کچھ بھی معلوم ہے۔ وہ سب ٹھیک ٹھیک بتا دو۔ بس ہم تم سے یہی جاننا چاہتے ہیں۔ کوئی بات چھپانا مت۔''

''تو..... تو..... فرید الحسن نے حیدر علی کو مار ڈالا؟'' شکوراں اس طرح بولی جیسے وہ خواب کے عالم میں بول رہی اور اس کے لیے یہ بات کوئی خاص غیر متوقع بھی نہ ہو۔

''ہاں..... مار ڈالا۔'' خالدہ نے جلدی سے کہا۔ ''کیا تم اس قتل کی وجہ جانتی ہو؟''

''جاننے کی کوشش کر رہی ہوں بیگم صاحبہ۔'' شکوراں نے اسی طرح کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔ ''آپ نے فرید الحسن کے خاندان کے بارے میں اور کیا معلوم کیا ہے؟ ذرا وہ بھی بتائیے۔''

''ہم نے بہت کچھ معلوم کر لیا ہے، لیکن بہت کچھ ابھی معلوم کرنا باقی ہے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''فرید الحسن کی ایک بہن ہے جس کا نام دردانہ ہے اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ گوجرانولہ میں رہتی ہے اور فرید الحسن اور دردانہ کی ماں کا نام صابرہ تھا۔ جو اب زندہ نہیں ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ حیدر علی کی ماں کا نام بھی صابرہ تھا اور وہ بھی اب زندہ نہیں ہے۔ دونوں کی ماؤں کا نام صابرہ تھا۔''

''نہیں.....'' شکوراں نے بھاری اور گہری آواز میں ایک سنسناتی ہوئی سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ ''وہ دو عورتیں نہیں تھیں..... وہ ایک ہی عورت تھی۔''

بات چیت اور سوال جواب میں وقت اسی طرح گزرتا گیا کہ ان میں سے کسی کو بھی اس کا احساس نہیں رہ سکا۔ وہ سب کے سب جیسے ایک طلسم کا شکار ہو گئے تھے۔ شکوراں نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صرف باتیں کرنے کی ماہر تھی۔ بلکہ اس میں قصہ گوئی اور داستان سرائی کی بھی جملہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ ان دونوں گھرانوں کے درمیان تعلقات کی ایک بے حد پیچیدہ اور پُرآشوب داستان مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی معمولی سے معمولی واقعہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی اسے بولنے سے نہیں روکا۔ بلکہ مزید سوالات کر کر کے بہت سارے نکتوں کی وضاحت بھی طلب کی۔ جو وہ بڑی آمادگی کے ساتھ فراہم کرتی گئی۔

اس دوران خاتون خانہ کئی بار آ کر کمرے میں جھانک کر جا چکی تھی اور بالآخر جب اس سے ضبط نہیں ہو سکا تو اس نے ایک بار پھر کمرے کے اندر آ کر شائستگی کے ساتھ کہا۔

''میں معافی چاہتی ہوں لیکن بہت دیر ہو گئی ہے۔ آپ لوگ ہمارے مہمان ہیں اور ہم نے آپ کو ابھی تک ایک پیالی چائے بھی نہیں دی ہے۔ آپ انکار نہ کیجئے گا۔ میں آپ لوگوں کے لیے چائے بھیج رہی ہوں۔''

''آپ کی مرضی۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے مسکرا کر کہا۔ ''ہم لوگ تو ابھی ماسی شکوراں سے کچھ اور باتیں کریں گے۔ ان کی وجہ سے ہمیں اپنے کام میں بہت مدد مل رہی ہے۔''

خاتون خانہ چلی گئی اور ان لوگوں کی گفتگو کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا۔ ذرا دیر کے بعد خاتون خانہ نے لڑکے کے ہاتھ ایک ٹرے بھجوا دی جس میں چائے کی پیالیوں کے علاوہ کھانے پینے کے بھی بہت سے لوازمات موجود تھے۔

چائے کے وقفے کے دوران بھی گفتگو کا تھوڑا بہت سلسلہ جاری رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شکوراں کی زبان تو رکے گی ہی نہیں۔ وہ تقریباً ساری اہم اور مفید باتیں بتا چکی تھی اور اب جو کچھ وہ کہہ رہی تھی اس کا ان اصل واقعات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

''جو کچھ مجھے معلوم تھا۔ وہ سب میں نے آپ لوگوں کو بتا دیا ہے۔'' بالآخر شکوراں نے کہا۔ ''کوئی بھی بات آپ سے چھپائی نہیں ہے، لیکن میرا تعلق حمید الحسن کے خاندان سے نہیں تھا۔ ان لوگوں کے گھر کی بہت سی اندرونی باتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جن سے میں واقف نہیں ہوں اور ان کے بارے میں شاید دردانہ آپ کو زیادہ بتا سکے۔ اگر ممکن ہو تو ایک بار اس سے بھی مل لیجئے۔''

ان میں سے کسی نے بھی شکوراں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ لوگ پہلے ہی گوجرانوالہ جا کر دردانہ سے مل چکے ہیں اور دردانہ نے ان سے بات کرنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ وہ شکوراں سے یہ بات کہہ کر اسے بدظن نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''ضرور ملیں گے۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے کہا۔ ''اور جو کچھ بھی وہ جانتی ہے۔ وہ اس سے اگلوا لیں گے۔''

وہ لوگ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

''بہت ساری باتیں اگرچہ اب سمجھ میں آ گئی ہیں، لیکن پھر بھی ہم فرید کے رویے کی وجہ کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے ہیں۔'' ماریہ نے کہا۔ ''جب اس نے حیدر علی کو قتل کر ہی دیا ہے تو آخر وہ اس کے اصل سبب کا اعتراف کیوں نہیں کر لیتا۔ اس کے دماغ میں نہ جانے کون سی ایسی گرہ پڑی ہوئی ہے جو اسے حقیقت کا اعتراف کرنے سے روک رہی ہے۔''

''شکوراں کو تو جو کچھ معلوم تھا۔ وہ اس نے ہمیں سب بتا دیا ہے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''اور اب میرے خیال میں ہم ایک بار پھر گوجرانوالہ جائیں گے۔ چند گھنٹوں کے لئے اور فرید کی بہن دردانہ سے بات کریں گے، لیکن اس طرح نہیں جس طرح ہم پہلے گئے تھے بلکہ اس طرح جس طرح ہم شکوراں کے پاس آئے۔ پولیس کے اختیار اور قوت کو اپنے جسموں پر سجائے ہوئے..... پھر دیکھیں وہ کیسے نہیں زبان کھولتی ہے۔''

''آپ کی بات بالکل درست ہے خالدہ صاحبہ۔'' انسپکٹر لطیف حسین نے اس کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آج ہی فون پر نواز خاں سے بات کرتا ہوں۔ وہ آپ کی پوری مدد کرے گا۔ آپ لوگ کل ہی گوجرانوالہ چلی جائیے اور اگر دردانہ چاہے تو گفتگو کے دوران اپنے شوہر خیر الدین کو بھی بلوا لے..... لیکن اس کو اپنی زبان بہرحال کھولنی پڑے گی۔''

''وہ دونوں بھائی بہن باتیں چھپانے کے ماہر اور شوقین معلوم ہوتے ہیں۔'' ماریہ نے کہا۔ ''فرید نے قتل کی اصل وجہ بتانے سے گریز کیا اور دردانہ اپنے بھائی کی جانب اپنے رویے کی وضاحت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔''

اگلے ہی دن صبح کو خالدہ مکرم اور ماریہ بلگرامی ایک بار پھر گوجرانوالہ کے لیے روانہ ہو گئیں۔ انسپکٹر لطیف حسین نے سب انسپکٹر نواز خاں کو گوجرانوالہ فون کر دیا تھا اور اسے ضروری ہدایات بھی دے دی تھیں۔ اس نے یقین دلایا تھا کہ وہ ان لوگوں کی پوری طرح سے مدد کرے گا۔

وہ لوگ گوجرانوالہ پہنچیں تو سب انسپکٹر نواز خاں ان کے خیر مقدم کے لیے موجود تھا۔

''معاف کیجئے گا۔'' ایس آئی خالدہ مکرم نے کہا۔ ''ہم لوگ ایک بار پھر آپ کو تکلیف دینے کے لیے یہاں آ گئے ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے۔'' نواز خاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں آپ لوگوں کے کچھ کام آسکوں تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔ آپ لوگ ایک ایسے مشن کے لیے کام کر رہی ہیں جس کا بنیادی مقصد انسانیت کی فلاح و بہبود ہے اور میں اس کام میں آپ کے ساتھ پوری طرح شریک ہوں۔''

پولیس کی گاڑی ایک بار پھر خیر الدین کے گھر کے دروازے کے باہر رکی، لیکن اس بار اس گاڑی میں ڈرائیور سمیت صرف ایک شخص ایسا تھا جو پولیس کی وردی میں نہیں تھا اور وہ تھی ماریہ بلگرامی۔

اتفاق سے خیر الدین اس وقت بھی گھر پر موجود نہیں تھا۔ گھر میں دردانہ اکیلی تھی۔ وہ پولیس والوں کو دیکھ کر سخت گھبرا گئی۔ یہ دونوں عورتیں تو پہلے بھی اس کے پاس آچکی تھیں لیکن تب یہ زیادہ عمر والی عورت پولیس کی وردی میں نہیں تھی..... اور ان لوگوں نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ ان کا تعلق پولیس سے ہے۔ اس دوسری عورت نے اپنے آپ کو وکیل ظاہر کیا تھا..... اور آج تو ان کے ساتھ پولیس کے دوسرے لوگ بھی تھے۔

''دردانہ.....'' خالدہ مکرم کے لہجے میں نرمی نہیں تھی۔ ''کیا ہم تمہارے گھر میں بیٹھ کر تم سے بات کریں یا تم کو تھانے لے چلیں؟ شاید وہاں تم زیادہ کھل کر بات کر سکو۔''

''نہیں نہیں۔'' دردانہ ایک دم گھبرا گئی۔ ''میں..... میں آپ سے یہیں بات کرلوں گی۔ مگر..... آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی ہیں؟ میں آپ کو سب کچھ تو بتا چکی ہوں۔''

''نہیں دردانہ..... تم نے سب کچھ نہیں بتایا ہے۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم اپنے بھائی سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہو اور وہ تم لوگوں سے اس قدر بیزار کیوں تھا کہ باپ کے قتل کے بعد گھر سے بھاگنے کے بعد اس نے پلٹ کر کبھی تم لوگوں کی خبر بھی نہیں لی..... تمہیں اس کے بارے میں وضاحت کرنی پڑے گی۔ یہ قتل کا معاملہ ہے کوئی مذاق نہیں ہے جو تم ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کرو۔ تمہیں سچ بولنا ہوگا۔''

''اور تم یہ بات بھی اچھی طرح جان لو کہ جو کچھ بھی تم کہو گی۔ ہم مختلف ذرائع سے اس کی تصدیق بھی کروائیں گے۔'' سب انسپکٹر نواز خاں نے کہا۔ ''اس لئے ہمارے ساتھ کوئی چال بازی کی کوشش نہ کرنا۔''

ان لوگوں نے دردانہ کو یہ نہیں بتایا کہ وہ شکوراں سے مل چکی ہیں اور انہیں شکوراں کے ذریعے بہت ساری معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔

پریشان اور خوفزدہ دردانہ انہیں اندر لے آئی اور وہ لوگ ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔

اس کے بعد سوال جواب کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ خالدہ مکرم اور ماریہ کے پاس شکوراں کی فراہم کردہ معلومات کا ایک ذخیرہ موجود تھا اور اس ذخیرے کی مدد سے دردانہ کو خود بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ ان لوگوں کو تو پہلے سے بہت کچھ معلوم ہے اور ان سے کچھ چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس نے ان لوگوں سے جھوٹ تو نہیں بولا۔ تاہم وہ ان بہت ساری باتوں کو یا ان کی تفصیلات کو چھپا گئی جنہیں وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے صرف ان لوگوں کے سوالات کے جوابات ہی دیئے اور ممکن حد تک اختصار سے کام لیا۔

دردانہ سے دوبارہ ملاقات کے نتیجے میں ان لوگوں کو ایک تو یہ فائدہ ہوا کہ شکوراں کی بیان کردہ بہت سی باتوں کی تصدیق ہوگئی اور دوسری کئی ایسی باتیں بھی ان کے علم میں آئیں جن سے شکوراں واقف نہیں تھی۔ اس طرح صورت حال کی ایک زیادہ مکمل تصویر ان کے سامنے ابھری۔ گوجرانوالہ سے وہ دونوں واپس چکوال آگئیں۔ انہوں نے سب انسپکٹر نواز کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ جس کی مدد اور تعاون کے نتیجے میں انہیں یہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ دونوں بہت خوش تھیں۔ ایک بے حد الجھی ہوئی گتھی کو انہوں نے بڑی حد تک سلجھا لیا تھا۔

''اب تو بس پلکوں کی سوئیاں باقی رہ گئی ہیں۔'' ایس آئی خالدہ مکرم نے ماریہ بلگرامی سے کہا۔ ''باقی ساری سوئیاں تو ہم نے نکال ہی لی ہیں۔''

''یہ بھی نکل جائیں گی۔'' ماریہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اصل میں تو یہ سوئیاں ہیں جو فرید کے دماغ میں گڑی ہوئی ہیں اور اس کے دماغ سے ان سوئیوں کو نکالنے سے پہلے ہمیں نہ جانے کہاں کہاں سے کتنی کتنی بہت ساری سوئیاں نکالنی پڑیں۔ تب کہیں جا کر سوئیوں کے نکلنے کا راستہ صاف ہوا۔''

''اب یہ کیس اگرچہ خاصا واضح ہوگیا ہے لیکن پھر بھی کئی سوالات حل طلب ہیں۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''اور وہ اسی وقت حل ہوں گے جب فرید اپنی زبان کھولے گا اور اب تو اسے زبان کھولنی ہی پڑے گی۔ وہ جو کچھ ہم سے چھپانا چاہتا تھا۔ وہ تو ہم نے معلوم کر ہی لیا ہے اور اس کے پاس چھپانے کے لیے اب زیادہ کچھ بچا نہیں ہے۔''

''اور اگر وہ اب بھی زبان نہ کھولے اور تعاون نہ کرے۔ تو بھی میں وکیل صفائی کی حیثیت سے عدالت میں اس کی کافی مدد کر سکتی ہوں۔ کیونکہ میں واقعے کی تہہ تک پہنچ چکی ہوں۔''

''ہاں.....'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''لیکن موجود صورت حال میں تم اسے عدالت سے شاید زیادہ رعایت نہیں دلوا سکو گی۔ بہر حال، کوشش تو کرنا ہی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ دونوں چکوال واپس آئیں۔ جہاں انسپکٹر لطیف حسین ان کی واپسی کا منتظر تھا۔
گوجرانوالہ سے سب انسپکٹر نواز خاں نے فون کر کے لطیف حسین سے بات کی تھی اور اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ دونوں چکوال واپس پہنچیں تو انسپکٹر لطیف حسین نے ان کو اس تازہ کامیابی پر مبارکباد پیش کی۔
''اس میں آپ کے تعاون کا گہرا دخل ہے سر۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''آپ کی مدد کے بغیر تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔''

☆======☆======☆

اگلے ہی دن وہ دونوں کراچی روانہ ہو گئیں۔ خالدہ مکرم نے فون پر ڈی ایس پی غلام نبی سے بات کر لی تھی اور اسے اپنی تازہ ترین کامیابی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ فون پر ساری تفصیلات تو نہیں بتائی جا سکتی تھیں۔ تاہم مختصراً اسے کچھ بنیادی باتیں بتا دی تھیں۔
''اتنی طویل اور صبر آزما محنت مشقت کے نتیجے میں اگر ہم ایک ذہنی طور پر منتشر انسان کی کچھ مدد کر سکیں تو یہ سودا برا نہیں ہے۔'' ڈی ایس پی غلام نبی نے فون پر کہا۔
ایس آئی خالدہ مکرم اور ماریہ بلگرامی واپس کراچی پہنچ گئیں اور اس کے فوراً ہی بعد ان لوگوں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں ڈی ایس پی غلام نبی ایس آئی اشرف علی اور اے ایس آئی جواد حسین شامل تھے۔
ماریہ بلگرامی اور ایس آئی خالدہ مکرم نے اپنے کام کے نتائج کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔
''ہمارے خدشات صحیح ثابت ہوئے۔'' غلام نبی نے ان کی ساری باتیں سننے کے بعد کہا۔ ''یہ واقعی ایک پرانی دشمنی کا شاخسانہ ہے اور عام حالات میں تو اس کا پتہ لگانا ناممکن تھا۔ میں تم لوگوں کی ہمت اور حوصلے کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم نے ایک ایسے قابل رحم انسان کی مدد کرنے کے لیے، جسے بآسانی نظر انداز کر کے پھانسی کے حوالے کیا جا سکتا تھا۔ اس قدر بھاگ دوڑ کی اور اس شخص کے مکمل عدم تعاون کے باوجود اس کے لیے انصاف تلاش کرنے کی کوشش کی۔''
اگلے روز ملزم فرید کی وکیل صفائی ماریہ بلگرامی۔ جسے عدالت کی طرف سے اس کی پیروی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اپنے مؤکل سے ملاقات کے لیے ایک بار پھر جیل پہنچی۔
ماریہ کا دل خوشی اور ہیجان سے بھرپور تھا۔ فرید سے ملاقات سے قبل وہ سوچ رہی تھی کہ ان لوگوں نے سارے معاملے کو سلجھا لیا ہے اور اب فرید اس سے کچھ نہیں چھپا سکے گا۔ کچھ بھی چھپانے کی فرید کی کوشش بے سود ثابت ہوگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کامیابی اور فتح مندی کے اس تابندہ احساس کے ساتھ وہ جیل پہنچی۔ قیدی سے ملاقات کا بندوبست پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ اسے ملاقات کے لیے ایک علیحدہ کمرے کی سہولت فراہم کی گئی۔

فرید نے خالی خالی نظروں سے اس نوجوان وکیل عورت کو دیکھا۔ جو اس کے منع کرنے کے باوجود ایک بار پھر اس کے سر پر سوار ہوگئی تھی۔

ماریہ نے فرید کو گہری اور چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس نے اپنے ترکش میں سے الفاظ کے تیر پہلے ہی نکال کر سیدھے کر لیے تھے۔

''ہاں تو فرید..... بالآخر تم نے اپنے باپ حمید الحسن کے قاتل صفدر علی کے بیٹے حیدر علی کو قتل کر کے اپنے اندھے انتقام کی آگ کو سرد کر ہی لیا۔''

''کیا؟'' فرید اس کی بات سنتے ہی ایک دم اچھل پڑا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ کیا کہہ رہی ہیں؟'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ''صفدر علی کا بیٹا؟ کیا حیدر علی صفدر علی کا بیٹا تھا؟ نہیں نہیں..... مجھے یہ نہیں معلوم تھا۔ میں نے اس کو صفدر علی کا بیٹا سمجھ کر نہیں مارا۔''

اور اب اچھلنے کی باری ماریہ کی تھی۔

مستقل طور پر اپنی زبان بند رکھنے والے اور اپنے اس خوفناک جرم کے حقیقی سبب کے بارے میں ایک لفظ بھی اپنے ہونٹوں پر نہ لانے والے ملزم فرید کو جیسے ایک دم کرنٹ لگ گیا تھا، جس کے نتیجے میں اس کے دماغ کے بند خلیوں نے اچانک کام شروع کر دیا تھا اور وہ بولنے لگا تھا..... لیکن اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ نے ماریہ کے ہوش و حواس پر بجلی گرا دی تھی۔

وہ تو پورے اہتمام کے ساتھ اور اس یقین کو اپنے دل میں بسائے ہوئے یہاں آئی تھی کہ اس نے قلعہ فتح کر لیا ہے اور بس، اب دروازہ کھول کر اندر جانے کی دیر ہے، لیکن اسے آن کی آن میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ساری محنت مٹی میں ملتی ہوئی نظر آئی۔ ان لوگوں کا اخذ کردہ حتمی نتیجہ بالکل غلط ثابت ہو رہا تھا۔

ماریہ نے اس اچانک افتاد کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے تیار کیا۔ وہ چند ثانیوں تک فرید کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتی رہی۔ اس کے لیے یہ سمجھنا ذرا بھی دشوار نہیں تھا کہ فرید جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس پورے معاملے میں فرید نے کہیں بھی، کبھی بھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ جو آدمی اپنے قاتل ہونے کا خود اقرار کر لے اور بہ رضا و رغبت پھانسی کے پھندے پر لٹکنے کے لیے تیار ہو، اس سے جھوٹ بولنے کی توقع نہیں

رکھنا چاہیے۔ اقبال جرم کر لینے والا کوئی قاتل جھوٹ صرف اس وقت بول سکتا ہے جب قتل اس نے خود نہیں، بلکہ کسی دوسرے شخص نے کیا ہو اور وہ اس کو بچانے کی کوشش میں قتل کا الزام اپنے سر لے رہا ہو اور یہاں ایسی کوئی صورت حال نہیں تھی۔ فرید نے کئی لوگوں کے سامنے یہ قتل کیا تھا اور یہاں کسی دوسرے شخص کو بچانے والا کوئی معاملہ موجود نہیں تھا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو فرید؟'' ماریہ نے سنبھل کر دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔ ''کیا تم کہ یہ بات نہیں معلوم تھی کہ حیدر علی نامی جس شخص کو تم قتل کر رہے ہو، وہ تمہارے باپ حمید الحسن کے قاتل صفدر علی کا بیٹا ہے؟''

''نہیں..... ہرگز نہیں۔'' فرید نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے یہ بالکل نہیں معلوم تھا۔ میں نے اسے صفدر علی کا بیٹا سمجھ کر ہرگز قتل نہیں کیا۔''

''تمہیں حیدر علی کے بارے میں کیا معلوم تھا؟'' ماریہ نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' فرید نے بجھے ہوئے لہجے میں شکستہ آواز میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے دماغ میں کوئی شدید کشمکش جاری ہے۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ اب بول رہا تھا۔ ماریہ کے سوالوں کے جوابات دے رہا تھا، لیکن اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ ماریہ کو کوئی خوشی عطا نہیں کر رہے تھے، بلکہ اس کو شدید مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس سے دوچار کر رہے تھے۔ ایسا تو کچھ بھی نہیں نکلا جیسا ان لوگوں نے سوچا تھا۔

''مجھے اس شخص کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ میں پہلی بار آپ کی زبان سے یہ بات سن رہا ہوں کہ وہ میرے باپ کے قاتل صفدر علی کا بیٹا تھا۔''

''اور..... کیا..... کیا..... تم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ تمہارا چھوٹا بھائی تھا؟''

''کیا؟'' فرید کے حلق سے نکلنے والی آواز کسی چیخ سے کم نہیں تھی۔ ''میرا چھوٹا بھائی؟ وہ میرا چھوٹا بھائی تھا؟ مگر نہیں..... میرا تو کوئی چھوٹا بھائی نہیں تھا۔'' فرید کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

''وہ تمہاری ماں صابرہ کا بیٹا تھا۔'' ماریہ نے اسے بتایا۔ ''صابرہ اور صفدر علی کا بیٹا.....''

اچانک فرید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ بچوں کی طرح زور زور سے سسکیاں لے کر رو رہا تھا۔

ماریہ سکتے کی سی کیفیت میں اس کو دیکھ رہی تھی اور خاموش تھی۔ اس نے اس کو تسلی دینے یا اس کے آنسو پونچھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ فرید کے لیے رو لینا ہی اچھا تھا۔ وہ جتنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیادہ رولیتا، اتنا ہی اچھا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر برسوں کی چھائی ہوئی دھند اور گرد کو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والا لہو ہی صاف کر سکتا تھا اور لہو جتنا زیادہ بہہ جاتا، دل و دماغ کی اتنی ہی زیادہ صفائی ہو جاتی اور اس کو بڑی حد تک سکون میسر آ جاتا، جس سے وہ برسوں سے محروم تھا۔ وہ شخص جو اب تک پتھر بنا ہوا تھا۔ جس کے چہرے کے نقوش بے جان مورتیوں کے نقوش کی طرح جامد اور بے روح معلوم ہوتے تھے۔ جو کسی سے دو باتیں کرنے کا بھی روادار نہ تھا۔ اب زار و قطار رو رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے خونِ دل کے سارے تیز رو دریا آنکھوں کے راستے بہا کر خود اندر سے بالکل خالی ہو جائے گا۔

کافی دیر تک سسکیوں کے ساتھ رونے کے بعد فرید قدرے پُرسکون ہوا تو اس نے بہت آہستہ سے کہا۔ ''نہیں..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ حیدر علی میری ماں کا بیٹا تھا۔ میں ایسی کسی بھی بات سے واقف نہیں تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں اس کو کبھی نہ مارتا..... لیکن آپ کو..... آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟ آپ کو کس نے بتایا کہ.....''

''بہت سے لوگوں نے۔'' ماریہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جن میں تمہاری بڑی بہن دردانہ بھی شامل ہے جو اس وقت اپنے شوہر کے ساتھ گوجرانوالہ میں رہ رہی ہے۔ ہم نے چکوال جا کر تمہارے خاندان کو تلاش کیا۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔''

''دردانہ.....'' فرید نے ہلکی سی سسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''اور..... اور..... اماں؟'' اس کی آواز بہت ہلکی ہو کر ایک پُراسراری سرگوشی میں بدل گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ماں کے بارے میں پوچھتے ہوئے ڈر رہا ہوں۔

''تمہاری اور حیدر علی کی ماں صابرہ کا تو کافی عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔'' ماریہ نے اسے بتایا۔

فرید پر ایک بار پھر رقت طاری ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا سارا وجود جو اس سے پہلے سنگ و آہن کا بنا ہوا تھا، اب موم میں تبدیل ہو گیا ہے اور یہ موم زخمی جذبات اور سلگتے ہوئے احساسات کی تیز آنچ میں پگھل پگھل کر فضا میں تحلیل ہوا جا رہا ہے

ماریہ اب پورے طور پر سنبھل چکی تھی اور اس نے خود کو اس اچانک نمودار ہو جانے والی نہایت غیر متوقع صورت حال کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ اب وہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے فرید کے غمناک جذبات کو زیادہ سے زیادہ ابھارنے کی کوشش کر رہی تھی، تاکہ وہ کسی کی ہمدردی اور توجہ کی ضرورت کو زیادہ سے زیادہ محسوس کرے اور پھر کھل کر بات چیت کرے۔

''تم کو نہیں معلوم تھا فرید۔'' ماریہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ ''تمہاری ماں صابرہ اس گھر میں رہتی تھی۔ جس گھر میں حیدر علی رہتا تھا۔ تمہاری ماں کا انتقال اسی گھر میں ہوا تھا لیکن تب تم معلوم نہیں کہاں ہو گے۔ جب تم کورنگی کے اس کوارٹر میں رہنے کے لیے آئے تھے تو تمہاری ماں اس وقت دنیا سے رخصت ہو چکی تھی..... البتہ ان کا بیٹا اور بہو..... حیدر علی اور زرینہ..... وہاں رہتے تھے۔ جو تمہیں بالکل نہیں جانتے تھے۔ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔''

''اور میں بھی تو ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔'' فرید کی آواز ایک بار پھر بھرانے لگی۔ ''میری ان لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ہائے..... یہ میں نے کیا کر ڈالا۔ میں نے حیدر علی کو مار ڈالا۔ حیدر علی نے تو میرا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔''

ماریہ فرید میں رونما ہونے والی اس حیرت انگیز تبدیلی کو پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ اب تک تو فرید نے ایک بار بھی اپنے کیے پر پچھتاوے یا ندامت کا اظہار نہیں کیا تھا، لیکن اب وہ کھل کر اظہار پشیمانی کر رہا تھا۔ ماریہ اس صورت حال سے تقویت حاصل کرنے لگی۔ ''اب جو کچھ یہ خود بتائے گا۔ وہی اصل سچائی ہو گی۔'' ماریہ نے دل ہی دل میں کہا۔ ''اور یہ ایسی سچائی ہو گی جسے کوئی بھی غلط ثابت نہیں کر سکے گا۔''

''اگر تمہیں یہ بات نہیں معلوم تھی کہ وہ تمہارے باپ کے قاتل کا بیٹا ہے فرید تو پھر تم نے اس کو کیوں مار ڈالا؟'' ماریہ نے بہت ہی نرم لہجے میں آہستگی سے کہا۔ ''دیکھو فرید..... اب وقت آ گیا ہے کہ تم سب کچھ صاف صاف بتا دو..... اب چھپانے کے لیے تمہارے پاس کیا رہ گیا ہے؟ میں تمہاری بہن دردانہ سے مل کر آئی ہوں۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

فرید کے چہرے پر مردنی سی طاری ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی ویرانی نمودار ہو گئی تھی جو اس کے وجود کے گہرے اندرونی دکھ کی آئینہ دار تھی۔

''آپ کو صفدر علی کے بارے میں بھی معلوم ہو گا۔'' فرید نے آنکھیں جھکا کر آہستہ سے پوچھا۔ ''وہ.....''

''وہ زندہ نہیں ہے۔'' ماریہ نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا۔ ''اس کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔''

فرید نے ایک لمبی اور گہری سانس لی۔ ''مرنا تو اسے میرے ہاتھوں چاہئے تھا..... لیکن سب قسمت کے کھیل ہیں وکیل صاحبہ..... مرتو وہ بھی گیا، لیکن اس طرح نہیں، جس طرح میں چاہتا تھا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے بعد فرید نے آہستہ آہستہ بولتے ہوئے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا۔ ماریہ نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ اس نے فرید کو بولنے دیا۔ فرید رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بہت سی گزری ہوئی باتوں کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ کچھ دیر تک بولتے رہنے کے بعد رک گیا اور قدرے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''باتیں تو بہت لمبی ہیں۔ مگر میں کوشش کروں گا کہ بس خاص خاص باتیں آپ کو بتاتا چلوں تاکہ آپ کا قیمتی وقت خراب نہ ہو۔''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' ماریہ نے فوراً کہا۔ ''فی الحال میرا سارا وقت تمہارے لئے ہے۔ تم جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہو کہو، کھل کر کہو اور بولتے رہو۔ جو کچھ تمہارے دل میں ہے وہ سب کہہ ڈالو۔ کوئی بھی بات چھپا کر مت رکھو۔ میں تمہاری دوست اور ہمدرد ہوں۔ مجھ سے باتیں کر کے تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔''

فرید پھر بولنے لگا۔ وہ اب ایک بالکل بدلا ہوا انسان تھا۔ اس کے وجود کی کرختگی، درشتی اور برہمی رخصت ہو چکی تھی۔ وہ ایک سیدھے سادے عام، غمزدہ صدموں کے مارے ہوئے انسان کی طرح اپنی داستان بیان کر رہا تھا۔ جس میں سے جگہ جگہ سے خون بہتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

فرید بہت دیر تک آہستہ آہستہ بولتا رہا اور ماریہ اس کے ایک ایک لفظ کو پورے غور سے سن رہی تھی۔ وہ اس کی باتوں کو صرف سن ہی نہیں رہی تھی بلکہ اپنے پرس میں رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر پر اس کو خاموشی سے ریکارڈ بھی کر رہی تھی۔ یہ اس لیے نہیں تھا کہ وہ اس ٹیپ کو عدالت میں پیش کرنا چاہتی تھی، بلکہ اس لیے تھا کہ وہ ملزم کی زبان سے نکلی ہوئی کسی بات کو بھول نہ جائے۔

فرید کو اپنی بات پوری کرنے میں کافی وقت لگا۔ شروع شروع میں تو وہ رک کر، سوچ سوچ کر بول رہا تھا کہ کہاں سے بات شروع کرے، کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ ابتدا میں شاید اس میں خود اعتمادی کی کافی کمی تھی، لیکن رفتہ رفتہ اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی زبان میں بھی زیادہ قوت اور روانی آتی گئی اور لب و لہجہ زیادہ پُر زور اور واضح ہوتا گیا۔

فرید کا اپنا بیان ختم ہوا تو ماریہ نے اس سے سوالات شروع کئے۔ فرید کے بولنے کے دوران وہ خاموشی سے اپنی ڈائری میں ان سوالات کو نوٹ کرتی جا رہی تھی۔ جو اس کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ وہ مداخلت کر کے فرید کے خیالات کے تسلسل اور بہاؤ میں خلل

نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

فرید نے اس کے ہر سوال کا جواب دیا اور ماریہ کو پورا یقین تھا کہ اس نے سب کچھ سچ بتایا ہے۔ فرید کے لیے جھوٹ بولنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی۔

''تم نے بہت اچھا کیا فرید کہ تم نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔'' ماریہ نے کہا۔

''اگر تم نے پہلے ہی ہمارے ساتھ تعاون کیا ہوتا تو ہمیں سچائی کی تلاش میں اس قدر مشقت نہ کرنی پڑتی، لیکن خیر..... سچ کی تلاش میں کچھ نہ کچھ محنت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔''

''بات یہ ہے وکیل صاحبہ کہ مجھے تو مرنا ہی تھا۔'' فرید نے اداس لہجے میں کہا۔ ''میں تو بس ایک ہی جھٹکے میں وہ سب کچھ کر گزرا جسے کرتے وقت مجھے بالکل ہوش نہیں تھا اور پھر جب ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو موت کی دہلیز پر کھڑے پایا۔ وکیل صاحبہ، اس واقعے کے بعد پھانسی تو میرا مقدر تھی ہی۔ مجھے کوئی نہیں بچا سکتا تھا، تو میں نے یہی سوچا کہ جب مرنا ہی ہے تو ساری دنیا کے سامنے ذلتوں اور رسوائیوں کے اس قدر داغ اپنے اوپر سجا کر کیوں مروں۔ بس خاموشی سے مر جاؤں۔ اسی لئے میں نے اپنی زبان بند رکھنے کا فیصلہ کیا تھا، مگر آپ نے تو سب کچھ معلوم کر لیا اور ویسے بھی وکیل صاحبہ، مجھے زندہ رہ کر کرنا ہی کیا تھا؟ کیا رکھا تھا میری اس منحوس زندگی میں.....''

''نہیں فرید.....'' ماریہ نے اس کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''زندگی کبھی منحوس نہیں ہوتی۔ زندگی انسان کے لیے قدرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جو اسے صرف ایک بار ملتا ہے، دوبارہ نہیں۔ انسان کو زندگی کی قدر کرنا چاہئے۔ زندگی دشوار اور تکلیف دہ ضرور ہو سکتی ہے، لیکن انسان کو اسے بہتر بنانے کی جدوجہد کبھی ترک نہیں کرنی چاہئے۔ یاد رکھو فرید..... امید اور جدوجہد..... یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کو زندہ رہنے اور زندگی کو بہتر بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ میں نے تمہاری پوری کہانی سن لی۔ تمہارا المیہ یہ ہے فرید کہ تم نے دکھوں کو اپنے اوپر طاری کر لیا اور تم نے دنیا کی ہر خوشی کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔ حالانکہ تم خوش رہ سکتے تھے۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا وہ کوئی دنیا سے انوکھی بات نہیں تھی۔ ہزاروں انسانوں کے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، لیکن وہ سب تمہاری طرح ذہنی مرض نہیں بن جاتے فرید..... لوگ مصیبتوں اور مشکلات سے لڑتے ہیں، ان کو برداشت کرتے ہیں اور ان پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں، تم نے امید اور جدوجہد کا راستہ ترک کر کے اپنے آپ کو ساری دنیا سے الگ تھلگ کر لیا۔ تم انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے ان انسانوں میں نہیں رہے۔ اگر تم لوگوں کو اپنا بناتے تو لوگ بھی تمہیں ضرور اپنا بناتے۔ یاد رکھو فرید..... اگر تم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوگوں سے دور ہو جاؤ گے تو جواباً لوگ بھی تم سے دور ہو جائیں گے اور اگر تم لوگوں کی جانب ایک قدم بڑھاؤ گے تو لوگ تمہاری جانب دو قدم بڑھائیں گے۔''

''مجھے..... اصل میں..... انسانوں سے وحشت ہونے لگی تھی وکیل صاحبہ.....'' فرید نے کمزور آواز میں کہا۔ ''اور اب..... اب مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہو رہی ہے اور اس بات کا یقین نہیں آتا کہ آپ نے صرف میری مدد کرنے کی غرض سے اس قدر مشقت جھیلی کہ آپ کراچی سے چکوال اور گوجرانوالہ کے چکر لگاتی رہیں اور نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتی پھریں۔ آپ کو بھلا کیا پڑی تھی یہ سب کچھ کرنے کی.....''

''تم یہ بات اس لیے کہہ رہے ہو فرید کہ تم نے ہمیشہ صرف اپنے دکھوں کے بارے میں سوچا۔'' ماریہ نے کہا۔ ''تم صرف اپنے دکھوں کے جال میں بری طرح الجھے رہے اور تم نے آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد پھیلے ہوئے دکھوں کے اس سمندر کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی جس میں لاکھوں انسان رات دن غوطے لگاتے رہتے ہیں۔ جانتے ہو، اگر انسان دوسروں کے دکھوں میں خود کو شامل کر لے تو اس کے اپنے دکھوں کی شدت کا احساس کم ہو جاتا ہے اور انسان جتنا زیادہ دوسروں سے دور لاتعلق اور بے حس رہتا ہے، اس کے اپنے دکھوں کی شدت اتنی ہی زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ تنہا ہوتا جاتا ہے اور جتنا زیادہ وہ تنہا ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی زیادہ وہ کمزور بھی ہوتا جاتا ہے۔ یاد رکھو..... انسان کی طاقت صرف اس کی اپنی ذات سے نہیں ہوتی۔ انسان کی طاقت ان دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر بڑھتی ہے جنہیں وہ اپنا سمجھتا ہے اور جن کے دکھ درد میں وہ شریک ہوتا ہے۔ تم نے صرف اپنے دکھ کو ہی دنیا کی سب سے زیادہ اہم چیز سمجھا۔ کیا تم میرے دکھوں کے بارے میں بھی کچھ جانتے ہو؟''

''آپ کے دکھوں کے بارے میں؟'' فرید نے حیرت سے کہا۔ ''آپ کو بھلا کیا دکھ ہو سکتا ہے؟ آپ..... وکیل ہیں..... پڑھی لکھی ہیں..... آپ کے پاس عزت ہے..... دولت ہے.....''

''میں پاگل بھی ہو سکتی تھی فرید۔'' ماریہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جو صدمے میں نے برداشت کئے ہیں۔ اگر میں ان سے ہار مان جاتی تو بہت ممکن ہے کہ میں اس وقت کسی پاگل خانے میں ہوتی۔ جانتے ہو..... میری ماں کو میرے سگے بھائی نے قتل کر دیا تھا۔''

''نہیں.....'' فرید نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ''سگے بیٹے نے ماں کو قتل کر دیا..... یہ کیسے

ممکن ہے؟''

''یہ ممکن ہے فرید اور مجھ بدنصیب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے ہیرو نچی بھائی نے، جو نشے کے مستقل استعمال کی وجہ سے ذہنی مریض بن گیا تھا۔ نشے کے لیے پیسے نہ دینے پر ہماری ماں کو مار ڈالا.....''

''اوہ..... یہ تو واقعی بڑے دکھ کی بات ہے۔'' فرید نے آہستہ سے کہا۔

''مگر میں نے اس صدمے کو برداشت کیا اور اپنی ماں کے قاتل کے منہ پر ٹھوکر نہیں ماری۔ وہ ذہنی مریض تھا۔ میں نے عدالت میں اس کی پیروی کر کے اس کو پھانسی سے بچایا۔ نشہ چھڑوانے کے لیے اس کا علاج کروایا اور اس نے نشہ چھوڑ بھی دیا..... لیکن پھر وہ جیل میں ہی مر گیا۔ اس کی صحت بالکل برباد ہو گئی تھی۔''

ماریہ ذرا دیر تک خاموش رہی اور پھر بولی۔ ''یہی سب کچھ نہیں فرید..... میرے گھریلو حالات ہمیشہ بہت ہی خراب رہے۔ میری ماں نے کبھی میرے باپ کی نہ عزت کی نہ ان سے محبت کی۔ انہوں نے ان کو اپنے شوہر کی حیثیت سے کبھی دل سے قبول ہی نہیں کیا اور میں اور میرا بھائی اس گھر کے دوزخ میں پلے بڑھے۔ تمہارے اور میرے حالات میں خاصی مشابہت پائی جاتی ہے، لیکن میں نے اپنے آپ کو دنیا سے الگ نہیں کیا۔ میں نے خود کو تنہائی اور علیحدگی کے جنگل میں بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا۔ میں نے زندگی میں جدوجہد کا راستہ اپنایا اور یہی وجہ ہے کہ آج میں اس قابل ہوں کہ ان لوگوں کی مدد کر سکوں جو میرے جیسے حالات کا شکار ہو جاتے ہیں۔''

''آپ کے حالات..... مجھے یقین نہیں آتا وکیل صاحبہ.....'' فرید نے رک رک کر کہا۔ ''آپ کو دیکھ کر تو کوئی کہہ نہیں سکتا کہ آپ اندر سے اس قدر دکھی ہوں گی۔''

''ہر انسان کے اپنے اپنے دکھ ہوتے ہیں فرید.....'' ماریہ نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کسی کے کم، کسی کے زیادہ..... اور دکھوں کی نوعیت بھی الگ الگ ہو سکتی ہے۔ انسان کو اتنا کمزور نہیں ہونا چاہئے کہ دکھ اس کو نگل جائیں۔''

''وکیل صاحبہ..... اب میرا کیا ہوگا؟'' فرید نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ ماریہ نے صاف طور پر محسوس کیا کہ فرید نے پہلی بار اپنے بارے میں مثبت انداز میں سوچنا شروع کیا ہے، وہ اب اپنے مقدمے کے بارے میں فکرمند ہو رہا ہے۔ ''میں پھانسی سے تو نہیں بچ سکوں گا نا؟''

''میرے بھائی نے جو ذہنی مریض تھا۔ جنون کے عالم میں میری ماں کو مار ڈالا تھا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے اپنے سینئر وکیل کی مدد سے اس کو پھانسی کے پھندے بچا لیا تھا۔'' ماریہ نے کہا۔
''اب میں خود ایک سینئر وکیل بن چکی ہوں۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ میں تم کو پھانسی سے بچالوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم نے جو کچھ کیا۔ وہ اپنے پورے ہوش وحواس میں رہ کر نہیں کیا اور یہی میں عدالت میں ثابت کرنے کی کوشش کروں گی، لیکن تم کو اپنے اس بیان پر قائم رہنا ہوگا جو تم نے ابھی دیا ہے۔''

ماریہ جب فرید سے ملاقات کر کے جیل سے باہر نکلی تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے ایک بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہے۔ جب وہ فرید سے گفتگو کرنے کے لیے آئی تھی تو امید اور یقین سے بھرپور تھی، لیکن فرید کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے ہی وہ آسمان سے زمین پر آگری تھی اور اسے اپنی ساری محنت خاک میں ملتی نظر آئی تھی، لیکن اب اس کی وہ کیفیت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اس کی محنت کا کوئی ایک لمحہ بھی بیکار نہیں گیا تھا۔ اس نے وہ سب کچھ پا لیا تھا جس کی اسے اتنے دنوں سے تلاش تھی۔

ماریہ کے سامنے اب ٹکڑوں میں بٹی ہوئی، منتشر حالت میں ایک ایسی عجیب وغریب اور پُر پیچ داستان تھی جو انسانی رشتوں کے گوناگوں نشیب وفراز، انسانوں کے بے حد مختلف انفرادی اور سماجی رویوں اور انسانوں کے باطنی وجود کی شکست وریخت اور تعمیر وتشکیل کے درمیان جاری ہم آویزشوں سے عبارت تھی۔ اس خوں ناب داستان میں بہت سے سارے کردار تھے جن کے آپس کے پُر آشوب روابط سے اس کی ایک مکمل شکل بنتی تھی۔

ماریہ نے اس داستان کے ٹکڑوں کو جگہ جگہ سے ٹوٹی پھوٹی اور نامکمل شکل میں اٹھا کر ایک جگہ جمع کیا تھا اور پھر اپنی تخلیقی محنت کے ذریعے انہیں ایک مربوط صورت میں مرتب کر لیا تھا۔ اس داستان کے کچھ ابتدائی ٹکڑے اس کو چکوال کی بسوں کے اڈے کے قریب والی بستی میں پڑے ہوئے ملے تھے۔ پھر کچھ ٹکڑے گوجرانوالہ میں دردانہ نے فراہم کئے اور سب سے زیادہ ٹکڑے تو ماریہ نے شکوراں سے سمیٹے۔ پھر دردانہ سے مزید کچھ ٹکڑے ملے اور سب سے آخر میں فرید نے بہت سے ٹکڑے پیش کئے۔

شکوراں اور دردانہ نے جو کچھ بتایا تھا۔ اس کا تعلق ان واقعات سے تھا جن سے وہ واقف تھیں یا جن میں ان کی شمولیت تھی۔ وہ دونوں اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی تھیں کہ گھر سے بھاگنے کے بعد فرید پر کیا بیتی۔ یہ تو صرف فرید ہی بتا سکتا تھا اور اس نے بتایا اور فرید پورے طور سے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کے گھر سے بھاگ آنے کے بعد وہاں کیا گزری۔

اب ماریہ نے سب کچھ معلوم کر لینے کے بعد ایک مکمل داستان تیار کر لی تھی۔ اگرچہ اسے فرید کے مقدمے کی پیروی کرتے وقت اس پوری داستان کو عدالت میں پیش کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کے سارے ٹکڑوں کا تعلق فرید کے مقدمے سے نہیں بنتا تھا، لیکن انسانی المیوں کے اس پورے سلسلے سے واقف ہو جانا صرف ماریہ کے لیے ہی نہیں، بلکہ ان سارے لوگوں کے لیے زندگی کے وقیع تجربات ومشاہدات میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا تھا جنہوں نے ایک ساتھ مل کر اس کیس پر کام کیا تھا اور سچائی کی تلاش کی کوشش کی تھی۔

☆======☆======☆

فرید نے جب ہوش سنبھالا تو اس نے اپنے آپ کو چکوال میں بسوں کے اڈے کے قریب واقع ایک بستی میں چار افراد پر مشتمل ایک مختصر سے کنبے کے ساتھ رہتے ہوئے پایا۔ اس کنبے میں اس کے والدین اور بڑی بہن شامل تھے۔ فرید الحسن کے باپ کا نام حمید الحسن، ماں کا نام صابرہ اور اکلوتی بڑی بہن کا نام دردانہ تھا۔ یہ ایک خوشحال گھرانہ تھا۔ ذاتی آبائی مکان تھا..... کچھ زمینیں تھیں، مویشی تھے۔ اچھی طرح گزر بسر ہوتی تھی۔

فرید کی بڑی بہن دردانہ اس سے تین سال بڑی تھی اور وہ اسکول جاتی تھی۔ فرید کو خود بھی بچپن سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور اس کی بڑی بہن جب گھر میں پڑھنے کے لیے بیٹھتی تو فرید بھی اس کے پاس بیٹھ جاتا تھا۔ وہ ابھی کافی چھوٹا تھا، مگر بہن کی دیکھا دیکھی خود بھی کچھ لکھنے پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس کے باپ نے اس کو بھی اسکول میں داخل کروا دیا۔ اسکول میں داخل ہونے سے پہلے وہ گھر پر دردانہ سے کچھ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا سیکھ چکا تھا۔

یوں تو فرید ماں اور باپ دونوں ہی کو پیارا تھا، لیکن باپ تو اس پر جان دیتا تھا اور خود فرید کو بھی اپنے ابا بہت اچھے لگتے تھے۔

شروع سے ہی کچھ ایسی بات موجود تھی کہ فرید کو ابا زیادہ اچھے لگتے تھے اور ابا خود بھی فرید کو بہت پیار کرتے تھے۔ گھر کے دوسرے افراد کے مقابلے میں ابا کا پیار فرید کو ہمیشہ زیادہ ہی لگتا تھا۔

فرید کو اس وقت ہی جبکہ اس نے ابھی پوری طرح سے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا، ایک ہلکا ہلکا سا یہ احساس تھا کہ اس کا گھرانہ دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک حصہ اس پر اور ابا پر مشتمل ہے۔ اگرچہ کسی تنازعے یا تفریق کی کوئی ٹھوس شکل موجود نہیں تھی، لیکن پھر بھی ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تفریق کا ہلکا سا احساس موجود تھا۔

اماں اور آپا زیادہ تر ایک دوسرے کے ساتھ رہتی تھیں۔ آپا اسکول جاتی تھیں اور اسکول سے واپس آنے کے بعد ان کا زیادہ تر وقت اماں کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ وہ دونوں مل کر گھر کا کام کاج کرتیں اور پھر جب خالی ہوتیں تو باورچی خانے یا کمرے میں الگ بیٹھ کر ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کیا کرتیں۔ ایسا نہیں تھا کہ فرید کو ان کے پاس جا کر بیٹھنے، ان کی باتیں سننے یا ان میں حصہ لینے کی ممانعت تھی، لیکن اس کے کچے دماغ میں اس خیال کی ایک ہلکی سی، غیر محسوس سی روضرور اٹھتی تھی کہ وہ دونوں اس بات کو پسند نہیں کرتیں کہ وہ ان کی گفتگو میں مداخلت کرنے جا پہنچے۔ آپا اور اس کا ساتھ اس وقت ہوتا تھا جب آپا پڑھنے کے لیے بیٹھتی تھیں۔ یہ عموماً شام اور رات کا وقت ہوتا تھا۔ آپا جب پڑھنے بیٹھتی تھیں تو اس کو بھی ساتھ ہی بٹھا لیتی تھیں۔ وہ اپنا سبق یاد کرتی تھیں، ہوم ورک کرتی تھیں اور ساتھ ہی اس کو بھی پڑھاتی جاتی تھیں۔ فرید کو اس وقت بہت اچھا لگتا تھا۔ اس وقت اسے آپا بہت ہی اچھی لگتی تھیں۔ کتاب پڑھتی ہوئی، کتاب میں سے کچھ یاد کرتی ہوئی۔ اپنی خوبصورت، پتلی پتلی، گوری گوری انگلیوں میں قلم دبائے ہوئے کاپی پر کچھ لکھتی ہوئی آپا..... اسے پڑھاتی ہوئی آپا..... اسے سبق دیتی ہوئی آپا..... یہ سب کچھ بہت اچھا تھا۔

مگر اس سے بھی زیادہ اچھا وہ وقت تھا جو وہ ابا کے ساتھ گزارتا تھا۔ ابا عام طور پر صبح کو کھانا کھانے کے بعد گھر سے چلے جاتے تھے۔ ان کو بہت سے کام رہتے تھے۔ جن میں ان کا زیادہ تر وقت گزر جاتا تھا۔ زمینوں کی دیکھ بھال وہ خود ہی کرتے تھے۔ ابا کو زمینوں سے بہت محبت تھی اور وہ فرید سے اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ اپنی زمینوں کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ابا جب سرِ شام واپس آتے تو فرید بے چینی کے ساتھ ان کا منتظر ہوتا۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر نہا کر کپڑے بدل لیتے اور ایک پیالی چائے پیتے۔ ماں اور آپا چائے نہیں پیتی تھیں، لیکن ابا شام کو گھر آنے کے بعد ایک پیالی چائے ضرور پیتے تھے اور جلد ہی انہوں نے فرید کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی فرید بھی بڑے شوق سے چائے پینے لگا تھا۔ چنانچہ شام کو ابا کے آنے کے بعد دو پیالی چائے بنتی تھی۔ چائے پینے کے بعد ابا اس کو ساتھ لے کر گھر سے باہر چلے جاتے اور کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی سیر کراتے۔ اگر فرید کسی چیز کی فرمائش کرتا تو ابا اس کو دلا دیتے۔ تاہم بعض ایسی چیزوں کی فرمائش پر وہ فرید کو منع بھی کر دیتے تھے جو ان کے خیال کے مطابق فرید کے لیے مناسب نہیں تھیں۔ کافی دیر کی سیر و تفریح

کے بعد ابا اسے گھر لے آتے اور جب تک آپا کے ساتھ پڑھائی یا کھانے کا وقت نہ ہو جاتا فرید ابا کے ساتھ ہی رہتا اور آپا اماں کے ساتھ رہتیں۔ کھانا پہلے ابا کھاتے تھے اور فرید ان کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ اماں اور آپا عام طور سے بعد میں باورچی خانے میں ہی بیٹھ کر کھانا کھا لیتی تھیں۔

پڑھائی کے ختم ہو جانے کے بعد فرید ابا کے پاس ہی جاتا، جو اسے اپنے پاس لٹا لیتے تھے اور اسے کوئی چھوٹی موٹی کہانی سناتے۔ اکثر فرید کہانی سنتے سنتے سو جاتا تھا۔ فرید کو یاد نہیں کہ کبھی اماں نے اس کو گود میں لے کر کہانی سنائی ہو۔ فرید تو ابا کے ساتھ پلنگ پر لیٹ جاتا اور اماں اور آپا ایک دوسرے کے ساتھ رہتیں

فرید اور دردانہ دونوں ہی اسکول کی تعلیم کے مدارج کامیابی کے ساتھ طے کر رہے تھے۔ فرید کو اپنا اور آپا کا لکھنا پڑھنا ہمیشہ بہت اچھا لگتا تھا۔ ابا یوں تو ان دونوں کے ہی لکھنے پڑھنے سے خوش تھے، لیکن فرید کی تعلیمی کامیابیوں سے انہیں بہت زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ ابا خود تو صرف اس حد تک پڑھے لکھے تھے کہ معمولی اردو لکھ پڑھ سکتے تھے اور قرآن شریف پڑھ سکتے تھے، لیکن اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں اور خاص طور سے فرید کی تعلیم کے سلسلے میں ان کے بڑے اونچے اونچے خواب تھے، لیکن فرید یہ بات کبھی وثوق کے ساتھ نہیں جان سکا کہ آیا اماں بھی ابا کے ان خوابوں میں اسی شوق اور آرزومندی کے ساتھ شریک تھیں۔

گھر کے حالات میں اس وقت ایک نئی تبدیلی نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ جب منور علی کی ان کے گھر میں آمد شروع ہوئی۔ اس وقت فرید ساتویں کلاس میں اور دردانہ میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ منور علی عمر میں دردانہ سے چند سال بڑا تھا۔

منور علی کے باپ کا نام صفدر علی تھا اور یہ خاندان بھی چکوال میں ہی رہتا تھا۔ صفدر علی کی بیوی کا نام زینت تھا۔ صفدر علی صابرہ کا کوئی بہت دور کا رشتہ دار تھا اور منور علی اس کی اکلوتی اولاد تھا۔

صفدر علی کے مالی حالات بہت اچھے تھے۔ اس کا باپ خاصی زمینیں اور جائیداد وغیرہ چھوڑ کر مرا تھا جن کی وراثت میں صفدر علی کے علاوہ اس کی بہن حُسنہ بھی شریک تھی۔ حُسنہ کے شوہر کا نام بشیر الدین تھا اور ان دونوں کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔

اگرچہ حمید الحسن اور صفدر علی، دونوں ہی کے خاندان چکوال میں رہتے تھے اور صابرہ کی اس خاندان سے دور کی کچھ رشتے داری بھی ہوتی تھی۔ تاہم دونوں خاندانوں کے درمیان کوئی خاص قریبی تعلقات نہیں تھے۔ صرف شادی اور غمی کے خاص خاص موقعوں پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی آنا جانا ہوتا تھا اور حمید الحسن تو شاذ و نادر ہی کبھی ان لوگوں کے گھر کا رخ کرتا تھا۔ وہ صفدر علی کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتا تھا۔ صفدر علی خود مکمل طور پر اَن پڑھ تھا اور اس نے اپنے بیٹے کی تعلیم پر بھی کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ منور علی نے صرف پانچویں کلاس تک پڑھا تھا اور اس کے بعد اس نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا دل پڑھائی میں بالکل نہیں لگتا تھا اور اسکول چھوڑ دینے کے بعد اس نے کتابوں سے مکمل طور پر ہی ناتا توڑ لیا۔ اس کے باپ نے کبھی اس طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دی کہ ان کا بیٹا کچھ پڑھ لے۔ اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ منور علی کا خاصا وقت احمد شاہ کے گیراج میں گزرتا تھا۔ احمد شاہ کا بیٹا موٹر میکینک تھا اور منور علی کا دوست تھا۔ منور علی گیراج میں بیٹھ کر خود بھی تھوڑا بہت کام سیکھتا رہتا تھا۔

اس روز صفدر علی کے ہاں نیاز کے چاولوں کی دیگیں پکی تھیں اور یہ چاول دور و نزدیک کے ملنے والوں، رشتہ داروں اور پڑوسیوں میں بھی تقسیم کئے گئے تھے۔ چاولوں کا حصہ لے کر منور علی حمید الحسن کے گھر آیا۔ وہ شام کا وقت تھا اور حمید الحسن بھی گھر پر موجود تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ چائے پی کر اس کو ساتھ لے کر باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ منور علی آن پہنچا۔

صابرہ نے اپنے رشتے دار کا بڑی خوشدلی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ وہ بہت دنوں کے بعد آیا تھا اور اس نے ایک طویل مدت کے بعد اس کو دیکھا تھا۔

''ارے..... تم تو اتنے بڑے ہو گئے ہو ماشاءاللہ۔'' صابرہ نے خوشدلی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی سال بھر پہلے تم کو دیکھا تھا۔ اس عرصے میں تو تم کبھی آئے ہی نہیں ہمارے گھر.....''

''بس چاچی، اتنے بہت سے کام لگے رہتے ہیں۔'' منور علی نے کہا۔ ''ابا کا بھی ہاتھ بٹانا پڑتا ہے..... اور یہ دردانہ..... یہ بھی اتنی بڑی ہو گئی..... میں تو اسے پہچان بھی نہیں سکا۔''

''لڑکیاں تو امربیل کی طرح بڑھتی ہیں بیٹا.....'' صابرہ نے کہا۔ ''وہ تو دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح بڑھ جاتی ہیں کہ احساس بھی نہیں ہوتا۔''

''آپ کیسے ہیں چاچا؟'' منور علی نے حمید الحسن سے مخاطب ہو کر کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' حمید الحسن نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم بتاؤ..... کون سی جماعت تک پڑھا تم نے؟''

''زیادہ نہیں پڑھا چاچا۔'' منور علی کے لہجے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ ''بس پانچ جماعتیں پڑھیں۔ پھر دل نہیں لگا تو پڑھائی چھوڑ دی اور اب تو اس بات کو بھی کتنا عرصہ گزر گیا..... کرنے کے لیے کام بہت ہے چاچا..... ویسے میں موٹر میکینک کا کام بھی سیکھتا رہتا ہوں۔''

''ہماری دردانہ تو اب ماشاءاللہ دسویں میں ہے اور فرید ساتویں میں آ گیا ہے۔'' حمید الحسن کے لہجے میں فخر و انبساط کی جھلک تھی۔

فرید نے محسوس کیا کہ اماں کو ابا کی یہ بات شاید پسند نہیں آئی۔ کیونکہ انہوں نے اس بیان میں شامل ہونے کی کوشش نہیں کی۔

فرید اب بڑا ہو چکا تھا اور ایک عرصہ ہوا کہ اس کو باپ کے ساتھ باہر جانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب اس کے اپنی مصروفیات تھیں، لیکن باپ کے ساتھ شام کی چائے پینا اب بھی روزمرہ کے معمولات میں شامل تھا اور کبھی کبھی ابا کے ساتھ باہر جانا بھی۔ آج بھی اسے ابا کے ساتھ باہر جانا تھا۔ اسے کھیلنے کے لیے ایک نئی فٹبال کی ضرورت تھی اور ابا نے کہا تھا کہ شام کو بازار چلیں گے اور فٹبال لے لیں گے۔

فرید نے منور علی کو اس سے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا لیکن وہ کبھی اسے اچھا نہیں لگا تھا اور آج بھی اسے یہ لڑکا بالکل اچھا نہیں لگا۔ جس نے پانچویں کلاس کے بعد اسکول چھوڑ دیا تھا اور اسے اس بات کا کوئی ملال بھی نہیں تھا بلکہ شاید خوشی اور اطمینان تھا۔

''ابا چلیں؟'' فرید نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ منور علی تو کافی دیر سے بیٹھا ہوا تھا اور اماں اور آپا کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ وہ تینوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ بہت گھلے ملے لگ رہے تھے۔

''ہاں چلو۔'' ابا نے اٹھتے ہوئے کہا اور منور علی سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''میں ذرا فرید کے ساتھ باہر جا رہا ہوں۔ اپنے باپ کو میرا اسلام کہنا اور چاولوں کے لیے بہت بہت شکریہ ادا کر دینا.....''

''بہت اچھا چاچا۔'' منور علی نے کہا اور اس نے جانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔

کافی دیر کے بعد جب دونوں باپ بیٹے گھر واپس آئے تو منور علی جا چکا تھا۔ ابا نے اس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ فرید کے ذہن سے تو اس کا خیال بھی محو ہو گیا تھا۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ منور علی کتنی دیر بیٹھ کر گیا۔ اگلی صبح تک وہ منور علی کو بالکل بھول چکا تھا۔

لیکن منور علی نے دوبارہ اپنی یاد دلا دی۔ چند روز کے بعد وہ پھر ان کے گھر آ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس روز وہ سہ پہر کے وقت آیا تھا، جبکہ ابا گھر پر موجود نہیں تھے۔

''میں ادھر سے گزر رہا تھا چاچی۔'' منور علی نے اپنی نظریں ''چاچی'' کے بجائے آپا کے خوبصورت چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔ ''سوچا ذرا کھڑے کھڑے آپ لوگوں سے بھی ملتا چلوں۔''

''ارے..... کھڑے کھڑے کیوں؟ بیٹھے بیٹھے کیوں نہیں؟'' آپا نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ تینوں ہنسنے لگے۔ فرید کوشش کے باوجود خود کو ان لوگوں کی ہنسی میں شریک نہیں کر سکا۔

''تمہارا گھر ہے بیٹا۔'' اماں نے کہا۔ ''جب جی چاہئے آؤ..... جتنی دیر جی چاہے بیٹھو..... ہم سب تمہارے اپنے لوگ ہیں۔''

''شکریہ چاچی۔'' منور علی نے کہا۔ ''اپنا سمجھا ہے تبھی تو آ گیا ہوں۔'' اور پھر وہ فرید سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اور تم کیسے ہو پڑھاکو خاں؟''

فرید کو اس کا یہ استہزائیہ انداز بالکل پسند نہیں آیا۔ اس نے اپنے اسکول کے استادوں اور دوسرے بزرگوں سے یہی سیکھا تھا کہ جو بچے پڑھنے والے ہوتے ہیں، انہیں اچھا سمجھا جانا چاہئے لیکن یہ منور علی تو اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے مختصر سے الفاظ میں اس کی بات کا جواب دیا۔

منور علی کافی دیر تک گھر میں موجود رہا اور اماں اور آپا اس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہیں۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ دونوں اس کے آنے سے بہت خوش ہوئی ہیں اور وہ خود بھی بہت خوش ہو رہا ہے۔ اس روز منور علی کچھ زیادہ ہی دیر تک گھر میں موجود رہا، لیکن ابا کے گھر واپس آنے سے پہلے پہلے وہ جا چکا تھا۔

جب ابا واپس آئے تو معمول کے مطابق ان کے لیے چائے بنائی گئی۔ جس میں ہمیشہ فرید کا بھی حصہ ہوتا تھا۔ اماں اور آپا میں سے کسی نے بھی ابا کو منور علی کے آنے کے بارے میں نہیں بتایا۔ خود فرید نے اس بات کی ضرورت نہیں محسوس کی کہ وہ ابا کو اس بارے میں بتاتا۔ ابا سے کرنے کے لیے اور بہت ساری باتیں تھیں۔

اس کے بعد منور علی جلدی جلدی ان لوگوں کے گھر آنے لگا اور فرید کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا انتظار کیا جاتا ہے اور خاص طور پر سے آپا اس کی منتظر رہتی ہیں۔ اماں اور آپا دونوں ہی اس کا پُرتپاک خیر مقدم کرتی تھیں اور پھر وہ تینوں کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے تھے۔ ان کے کھنکتے ہوئے قہقہوں کی آوازیں فرید کے کانوں میں پہنچتی تھیں جو دوسرے کمرے یا برآمدے میں موجود ہوتا تھا۔ فرید کو تو وہ کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔ فرید کو اس

بات کا بھی احساس تھا کہ اس کے ابا بھی منور علی کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

ایک روز منور علی ایسے وقت میں آیا جب ابا گھر میں موجود تھے۔ انہوں نے اس کو دیکھ کر کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ اماں اور آپا حسب معمول اس کی خاطر تواضع میں مصروف ہو گئیں۔ ابا نے منور علی سے کچھ زیادہ بات چیت بھی نہیں کی۔

کچھ دیر کے بعد منور علی چلا گیا۔

''اس کو زیادہ منہ مت لگایا کرو۔'' ابا نے اماں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ اور اس کا باپ دونوں ہی اچھے لوگ نہیں ہیں۔ دو چار دن پہلے صفدر علی کا سالا یونس مجھے ملا تھا وہ ان دونوں باپ بیٹوں کی بہت شکایت کر رہا تھا کہ صفدر علی نے اس کی بہن زینت کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ وہ اس کو بہت دکھ دیتا ہے۔ زینت آج کل کافی بیمار رہتی ہے اور کوئی بھی اس کے علاج پر ٹھیک سے توجہ نہیں دیتا۔''

''زینت ایسی تو کوئی خاص بیمار نہیں ہے۔'' اماں نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ ''ابھی کچھ دن پہلے وہ مجھے شہاب الدین کی بیٹی کی منگنی میں ملی تھی۔ مجھے تو وہ پہلے سے زیادہ ہی موٹی نظر آئی۔ خوب پھول رہی ہے۔''

''یونس کہہ رہا تھا کہ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ زینت کا اپنا بیٹا منور علی بھی اپنے باپ کے ساتھ مل کر ماں کو مسلسل تکلیفیں دیتا ہے اور اسے ذرا شرم نہیں آتی کہ یہ اس کی ماں ہے۔''

''خیر جی..... ان کے گھر کے قصے وہ جانیں۔'' اماں نے خاصی برہمی کے ساتھ کہا۔ ''ہمیں کیا پڑی ہے جو ہم بلاوجہ کی مداخلت کرتے پھریں۔ بچہ دو چار گھڑی کے لیے ہمارے پاس آ بیٹھتا ہے ہماری چاہت میں۔ تو ہم اس کو ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال تھوڑی دیں گے۔''

''پھر بھی..... ایسے لوگوں کو اپنے سے دور ہی رکھنا چاہئے۔'' ابا نے کہا۔ اماں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، لیکن ان کے اور آپا کے چہرے کے ناگوار تاثرات نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ انہیں ابا کی بات پسند نہیں آئی ہے۔ البتہ فرید کے دل میں منور علی کے لیے پہلے سے موجود ناپسندیدگی کا جذبہ کچھ اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ یہ کیسا بیٹا تھا جو اپنی ماں کو تکلیف دے رہا تھا۔

منور علی نے آنا جانا نہیں چھوڑا اور اس کے لیے اماں اور آپا کی گرم جوشی میں بھی کوئی کمی نہیں آئی۔ انہوں نے ابا کی بات کی کوئی پروا نہیں کی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر ایک دن وہ دونوں باپ بیٹے آئے۔ منور علی کے ساتھ اس کا باپ صفدر علی بھی آیا تھا۔ وہ حمید الحسن سے ملنے کے لیے آیا تھا کوئی زمین کا ٹکڑا تھا جس کی خرید و فروخت کا کچھ معاملہ تھا۔

ابا نے ان دونوں باپ بیٹوں کی آمد پر کسی خاص گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تاہم انہوں نے مہمانوں کے ساتھ سرد مہری بھی نہیں برتی۔ صفدر علی ابا سے زمین کے کسی ٹکڑے کے بارے میں بات چیت کرتا رہا۔ جسے وہ خریدنا چاہتا تھا لیکن اس کا مالک اسے بیچنے پر آمادہ نہیں تھا۔ مالک سے ابا کے بہت اچھے تعلقات تھے اور صفدر علی چاہتا تھا کہ ابا اپنے دوست سے اس کی سفارش کر دیں۔

ابا نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس کام میں اس کی مدد کریں گے۔

اماں اور آپا نے ان دونوں باپ بیٹوں کی کافی خاطر تواضع کی اور اماں نے اس کی بیوی زینت کے بارے میں پوچھا۔

''وہ تو زیادہ تر بیمار ہی رہتی ہے۔'' صفدر علی نے قدرے ناخوشگوار لہجے میں میں کہا۔

''بات یہ ہے بھابی کہ بہت کچھ آدمی کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ اب آدمی خود ہی اپنا خیال نہ رکھے۔ پرہیز نہ کرے احتیاط نہ کرے تو بیماری تو بڑھتی ہی جائے گی نا۔''

''ہاں بھائی، بندے کو سب سے پہلے خود اپنا خیال رکھنا چاہئے۔'' اماں نے کہا۔

''دوا علاج سے تو فائدہ اسی وقت ہوگا جب وہ بندہ خود بھی پوری طرح سے احتیاط برتے۔ میں نے زینت بھابی کو پچھلے دنوں دیکھا تھا وہ بہت موٹی ہو رہی تھیں۔ انہیں کھانے میں احتیاط برتنا چاہئے۔''

''علاج کون سے ڈاکٹر کا کروا رہے ہو؟'' ابا نے قدرے خشک لہجے میں صفدر علی سے پوچھا۔

''ڈاکٹری علاج اسے راس نہیں آتا۔'' صفدر علی نے جواب دیا۔ ''ڈاکٹری علاج سے تو ان کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ حکیم نور الدین کا علاج چل رہا ہے۔ وہ علاج کے ساتھ ساتھ روحانی علاج بھی کرتا ہے۔ اللہ نے اس کو بڑی روحانی طاقت دی ہے۔ امید ہے کہ اس کے علاج سے فائدہ ضرور ہوگا۔''

ابا نے مزید کچھ نہیں کہا۔ ذرا دیر کے بعد صفدر علی اور منور علی جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''پھر آنا بھائی۔'' اماں نے صفدر علی کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔ ''آج کتنے دنوں

کے بعد تم آئے ہو۔''

''آؤں گا بھابی ضرور آؤں گا۔'' صفدر علی نے کہا۔ ''ویسے منور علی بھی کبھار تم لوگوں کے ہاں آ جاتا ہے تو اس سے خیریت معلوم ہو جاتی ہے۔''

''بہت اچھا بچہ ہے۔'' اماں نے کہا۔ ''خدا اسے جیتا رکھے۔''

صفدر علی اور منور علی چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ابا اماں سے مخاطب ہو کر بولے۔

''ایک نمبر کا جھوٹا ہے۔ اس کا سالا یونس مجھے بتا رہا تھا کہ زینت بہت چاہتی ہے کہ اسے کسی ڈاکٹر کو دکھایا جائے، لیکن اس نے اسے حکیموں اور عاملوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اور ان دونوں باپ بیٹوں کو اس بات کا کوئی احساس بھی نہیں ہے کہ اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ یونس نے کئی بار صفدر علی سے کہا کہ وہ زینت کا علاج ڈاکٹر سے کرائے مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی..... نہ اس نے نہ اس کے بیٹے نے۔ عجیب ظالم لوگ ہیں!''

''یونس کو اگر اپنے بہنوئی اور بھانجے سے اتنی ہی شکایت ہے تو وہ اپنی بہن کو خود کیوں نہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا؟'' اماں نے خاصے بیزار اور برہم لہجے میں کہا۔

''میں نے یونس سے یہ بات کہی تھی۔'' ابا نے فوراً کہا۔ ''یونس نے کہا کہ وہ اپنی بہن کو خود ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا۔ ڈاکٹر نے دوائیں لکھی تھیں اور کچھ ٹیسٹ بھی لکھ کر دیئے تھے، لیکن پھر یونس کو خود کچھ عرصے کے لیے لاہور جانا پڑا اور صفدر علی اور منور علی نے نہ تو زینت کے ٹیسٹ کروائے اور نہ اس کے لیے دواؤں وغیرہ کا بندوبست کیا۔''

''منور علی کا کہنا یہ ہے کہ اس کی اماں اصل میں اتنی بیمار ہیں نہیں جتنا وہ ظاہر کرتی ہیں۔'' اماں نے کہا۔ ''وہ کہتا ہے کہ ان میں بیماری برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔''

''لعنت ہو ایسی اولاد پر جو اپنی ماں کے بارے میں اس قسم کی بات کرے۔'' ابا نے کہا۔

اس کے چند روز کے بعد منور علی پھر ان کے گھر آیا، لیکن اس بار بھی وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کا باپ صفدر علی بھی اس کے ساتھ تھا اور وہ دونوں ایسے وقت میں آئے تھے جب ابا گھر پر نہیں آئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ مٹھائی کا ایک بڑا سا ڈبہ بھی لے کر آئے تھے۔ صفدر علی نے مٹھائی کا وہ ڈبہ اماں کے حوالے کیا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی اماں کی آنکھیں بھی خوشی سے چمک رہی تھیں۔ آپا اور منور علی کی آنکھوں کی چمک ان سے الگ تھی۔

''کیا بات ہے بھائی؟'' اماں نے مسکرا کر پوچھا۔ ''یہ مٹھائی کیسی ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں نے اس روز ایک زمین کے بارے میں بھائی حمید الحسن سے بات کی تھی اور ان سے سفارش کروائی تھی۔ انہوں نے میرا کام کر دیا اور اس زمین کے مالک نے اس زمین کی فروخت کا سودا میرے ساتھ کرلیا ہے۔ یہ مٹھائی اسی خوشی میں ہے۔''

''مبارک ہو، بہت بہت مبارک ہو۔'' اماں نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''بھائی حمید الحسن کو بتا دینا۔'' صفدر علی نے کہا۔ ''اور ان سے میرا شکریہ بھی ادا کر دینا کہ انہوں نے میرا کام کر دیا۔''

''ضرور بتا دوں گی۔'' اماں نے کہا۔

صفدر علی تو کچھ دیر کے بعد چلا گیا، لیکن منور علی کافی دیر تک موجود رہا اور اماں اور آپا کے ساتھ کمرے میں بیٹھا ہوا باتیں کرتا رہا۔

اس شام جب ابا گھر آئے تو اماں نے بڑے مسرت آمیز انداز میں انہیں اس واقعے کی اطلاع دی اور انہیں وہ مٹھائی کھانے کو دی جو صفدر علی لے کر آیا تھا۔ ابا نے اس مٹھائی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور سرد لہجے میں بولے۔ ''مجھے اس بات سے کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے۔''

''کیوں؟'' اماں نے تعجب سے کہا۔ ''تم نے تو اس کی سفارش کی تھی گوہر خان سے؟ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہاری سفارش کے بعد ہی گوہر خاں اپنی وہ زمین اس کے ہاتھ فروخت کرنے پر آمادہ ہوا تھا؟''

''نہیں.....'' ابا نے کہا۔ ''میں نے گوہر خاں سے سفارش نہیں کی تھی۔ میں نے گوہر خاں کو سمجھایا تھا کہ وہ زمین کے اس ٹکڑے سے نجات حاصل کرلے جو اس کے اور اس کے بیٹوں کے لیے خطرے کا سبب بنا ہوا ہے۔ صفدر علی کی نظریں کئی برس سے زمین کے اس ٹکڑے پر لگی ہوئی تھیں اور وہ اسے حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن گوہر خاں اسے بیچنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ صفدر علی نے دو بار اس کی کھڑی فصلوں کو تباہ کروا دیا اور آخری بار تو اس کا بیٹا بھی جلتے جلتے بمشکل بچا۔ صفدر علی کے پولیس اور افسروں کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔ میں نے گوہر خاں کو سمجھایا کہ وہ اپنی اور اپنے بیٹوں کی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالے اور زمین کے اس ٹکڑے کو صفدر علی کے ہاتھ بیچ دے اور مجھے ایسا کرتے ہوئے کوئی خوشی نہیں ہو رہی تھی، لیکن میں جانتا ہوں کہ گوہر خاں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نہ تو اس کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ وہ مقدمہ بازی کر سکے اور نہ ہی اس کی اوپر تک پہنچ ہے۔ خواہ مخواہ مارا جاتا وہ بے چارہ۔''

ابا نے صفدر علی کی لائی ہوئی مٹھائی نہیں کھائی۔ فرید اپنے ابا کی زبانی صفدر علی اور اس

کے بیٹے منور علی کے بارے میں جتنی بھی نئی باتیں سنتا جاتا تھا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کے لیے اس کی ناپسندیدگی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا تھا، لیکن ان لوگوں کے لیے اماں اور آپا کی پسندیدگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

اب یوں ہونے لگا کہ کبھی کبھار دونوں باپ بیٹے ایک ساتھ کبھی کبھی الگ آنے لگے۔ منور علی تو پہلے ہی آتا جاتا تھا۔ اب صفدر علی نے بھی گاہے گاہے اس کے ساتھ یا الگ آنا شروع کر دیا، لیکن وہ لوگ عام طور سے ایسے وقت میں آتے تھے جب ابا گھر پر نہیں ہوتے تھے۔ اماں اور آپا آنے والوں کی خوشدلی کے ساتھ پذیرائی کرتیں۔ اب اکثر یوں ہوتا تھا کہ اماں باورچی خانے میں مصروف ہو جاتیں اور آپا اور منور علی الگ کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ ان کی ہنسی کی آوازیں کمرے سے باہر آ کر کھنکتی رہتیں۔

اس روز جب فرید اور آپا اسکول سے واپس آنے کے بعد دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک ابا گھر آ گئے۔ یہ ایک قدرے خلاف معمول بات تھی ابا عام طور سے دن کا وقت باہر ہی گزارتے تھے۔ ان کے لیے دوپہر کا کھانا ایک آدمی گھر آ کر لے جاتا تھا۔ فرید نے کئی بار ان سے پوچھا بھی تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا کھانے گھر کیوں نہیں آ جاتے۔ اس نے ان پر زور بھی دیا تھا کہ وہ دوپہر کے کھانے پر گھر آ جایا کریں، لیکن ابا نے اس سے یہی کہا کہ وہ کاموں کی وجہ سے باہر رہنا ہی زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت مختلف کاموں میں صرف کرنا چاہتے تھے۔

اس دن خلافِ معمول ابا کو دوپہر کے وقت گھر آتا دیکھ کر سب کو حیرت ہوئی۔ ابا کی شکل سے خاصی پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''ابھی ابھی ایک آدمی اطلاع دے کر گیا ہے۔'' ابا نے اماں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''صفدر علی کی بیوی زینت کا کچھ دیر پہلے انتقال ہو گیا۔ عصر کے وقت جنازہ اٹھایا جائے گا۔ ہمیں بھی وہاں جانا ہوگا۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' اماں نے فوراً کہا۔ ''ضرور جانا ہوگا۔ بڑے افسوس کی بات ہے..... یہ بھی بھلا کوئی اس کی مرنے کی عمر تھی؟''

''جب آدمی کا کلیجہ دکھوں سے چھلنی ہو جائے اور اوپر سے بیماریاں بھی اس کو کھانے لگیں تو پھر موت کے علاوہ اور کون سا راستہ رہ جاتا ہے؟'' ابا نے جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ سب لوگ صفدر علی کے گھر پہنچ گئے۔ جہاں اور بھی بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سارے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ مردوں کے لیے گھر سے باہر بہت سی چارپائیاں بچھا دی گئی تھیں۔ عورتوں کو گھر کے اندر بٹھانے کا بندوبست تھا۔ فرید کو یہ اختیار حاصل تھا کہ چاہے تو باہر مردوں کے ساتھ بیٹھے یا اندر عورتوں میں چلا جائے۔ وہ اندر کا ایک چکر لگا کر آیا۔ بڑی سوگوار سی فضا تھی۔ بہت سی خواتین گریہ وزاری کر رہی تھیں۔ کچھ خاموشی سے ایک طرف بیٹھی قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں۔ فرید کچھ دیر تک وہاں رکا رہا۔ پھر واپس آ کر ابا کے پاس پلنگ پر بیٹھ گیا۔

اس نے صفدر علی اور منور علی کو دیکھا۔ وہ دونوں آنے والوں سے مل رہے تھے اور ساتھ ہی دیگر انتظامات میں بھی مصروف تھے۔ فرید نے ان کے چہروں پر اس دکھ کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو ان کے دلوں کے اندر موجود ہونا چاہئے تھا، لیکن اسے وہاں ایسے دکھ کی کوئی خاص علامت نظر نہیں آئی۔

البتہ مرنے والی کا بھائی یونس بہت رو رہا تھا۔ فرید اس کو پہچانتا تھا۔ یونس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جبکہ صفدر علی اور منور علی کی آنکھیں خشک تھیں۔ شاید وہ اپنے حصے کے آنسو بہا چکے تھے یا انہوں نے سرے سے کوئی آنسو بہائے ہی نہیں تھے۔

یونس ابا کے گلے لگ کر بہت رویا۔ ابا اس کے شانے تھپتھپا کر اسے صبر کی تلقین کرتے رہے۔

عصر کی نماز کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی اور پھر مرنے والی کو قبرستان لے جایا گیا۔

تیسرے دن جب زینت کے قل ہوئے تو فرید ابا کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ آپا اور اماں الگ گئی تھیں اور وہ الگ ہی واپس آئیں۔

اس کے بعد بھی آپا اور اماں خود کئی بار صفدر علی کے گھر گئیں، لیکن ابا اس کے بعد پھر نہیں گئے اور فرید بھی نہیں گیا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد گھر میں ایک نیا تماشا شروع ہو گیا۔

اس روز صفدر علی اور منور علی فرید کے گھر آئے۔ ابا کے واپس آنے میں بہت دیر تھی۔ کچھ دیر تک تو سب لوگ ساتھ بیٹھے رہے۔ پھر صفدر علی نے اماں سے کہا کہ وہ ان سے علیحدگی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اماں اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئیں آپا اور منور علی دوسرے کمرے میں تھے۔ فرید برآمدے میں آ کر ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ ویسے بھی جب وہ لوگ سب اکٹھے ہوتے تھے تو وہ ان کے پاس نہیں بیٹھتا تھا کیونکہ اس کو وہ دونوں باپ بیٹے اچھے نہیں لگتے تھے اور ان کے برا لگنے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ وہ

اس کے ابا کو برے لگتے تھے کیونکہ وہ اچھے لوگ نہیں تھے۔

بہت دیر ہو گئی اور اماں اور صفدر علی کمرے سے باہر نہیں آئے۔ شاید ان کی بات چیت کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی تھی۔ کمرے سے آنے والی ان لوگوں کی سرگوشیوں میں ہونے والی گفتگو کی ہلکی ہلکی آواز جس میں گاہے گاہے ہلکے نسوانی اور بھاری مردانہ قہقہے بھی شامل ہو جاتے تھے، مکان کی فضا میں پُراسرار انداز میں سرسراتی رہی۔ دوسرے کمرے میں آپا اور منور علی تنہائی میں باتیں کر رہے تھے۔ ''یہ لوگ نہ جانے کیا باتیں کرتے ہیں کہ ان کی باتوں کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔'' فرید نے بیزاری سے سوچا۔

کافی دیر کے بعد صفدر علی اور اماں کمرے سے باہر نکلے اور صفدر علی نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔

''چل بھئی..... میں نے بات کر لی ہے۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیا ٹھیک ہو جائے گا؟'' فرید سوچ رہا تھا۔ ''کہاں کیا غلط ہو گیا ہے۔ جسے ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے؟'' لیکن اس نے ان میں سے کسی سے بھی کچھ نہیں پوچھا۔

آپا اور منور علی بھی کمرے سے باہر نکل آئے اور پھر دونوں باپ بیٹے چلے گئے۔

اس کے بعد یہ عجیب و غریب تماشا گھر میں اکثر ہونے لگا۔ ابا کی عدم موجودگی میں صفدر علی اور منور علی گھر آتے۔ اماں اور صفدر علی ایک کمرے میں جا بیٹھتے اور منور علی اور آپا دوسرے کمرے میں چلتے جاتے۔ اگرچہ کسی بھی کمرے کے دروازے اندر سے بند نہیں ہوتے تھے اور فرید کسی بھی کمرے میں جا سکتا تھا۔ لیکن وہ خود ہی نہیں جاتا تھا۔ اسے ان لوگوں کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ وہ کبھی کبھی ابا سے ان لوگوں کی آمد کا ذکر کر دیتا تھا۔ اماں اور آپا بھی ان لوگوں کی آمد کو خفیہ نہیں رکھتی تھیں۔ آخر صفدر علی اماں کا رشتے کا بھائی ہوتا تھا۔

☆======☆======☆

زینت کا ایک ہی بھائی تھا یونس، جو اس سے چھوٹا تھا۔ یہ دونوں بھائی بہن اپنے والدین کی واحد اولاد تھے۔

یونس کا باپ برکت ایک خاصا مالدار زمیندار تھا اور اس کو جو ملکیت اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی اس میں اس نے اپنی جدوجہد سے اور زیادہ اضافہ کر لیا تھا۔ اس کے دماغ میں بس ایک ہی سودا سمایا رہتا تھا اور وہ یہ کہ وہ اپنی ملکیت اور جائیداد میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرتا رہے۔ چنانچہ اس کی ساری توجہ اس امر پر مرکوز رہتی تھی اور وہ مختلف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طریقوں سے اپنی ملکیت اور دولت کو بڑھاتا رہتا تھا۔ جب بھی موقع ملتا تھا سستی سستی زمینیں اور جائیداد وغیرہ خرید لیتا تھا اور انہیں اپنی قلمرو میں شامل کر لیتا تھا۔ اس طرح اس نے اپنی آبائی ملکیت میں کافی اضافہ کر لیا تھا، حالانکہ اس کو اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ ایک بیٹی زینت اور بیٹے یونس کے علاوہ اس کے اور کوئی اولاد نہیں تھی اور جو کچھ برکت کے پاس تھا وہ اس کی کئی نسلوں کے لیے کافی تھا لیکن پھر بھی جائیداد میں اضافے کی اس کی خواہش ہمیشہ سے مضطرب رکھتی تھی۔

لیکن اس کا یہ اضطراب ایک دن بالکل اچانک ہی ختم ہو گیا۔ صرف یہی ایک اضطراب نہیں۔ اس کے سارے اضطراب۔ سارے تفکرات اور ساری ناآسودہ خواہشیں اور ناتمام آرزوئیں ختم ہو گئیں۔ جب چراغ زندگی گل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد گہرے اور بے نام سناٹوں کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا۔ برکت بھی ایک دن بالکل اچانک موت کے سناٹوں میں تحلیل ہو کر نیستی کا حصہ بن گیا۔

جب برکت کی موت واقع ہوئی تو اس وقت زینت کی شادی ہو چکی تھی۔ زینت کے شوہر کا نام صفدر علی تھا۔

برکت ایک ہوشیار اور دنیا دار آدمی تھا۔ وہ اپنی دونوں اولادوں سے بے حد محبت کرتا تھا اور دونوں بھائی بہن بھی ایک دوسرے پر جان دیتے تھے لیکن برکت جائیداد اور وراثت کے معاملے میں خون کے رشتوں کی ناپائیداری اور بے ثباتی سے بخوبی واقف تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی میں ہی اپنی جائیداد اپنے بیٹے اور بیٹی کے درمیان تقسیم کر دی تھی۔ بیٹے کو اس نے زیادہ حصہ دیا تھا۔

زینت جس گھر میں بیاہ کر گئی وہ بھی ایک مالدار زمیندار گھرانہ تھا اور ان لوگوں کے پاس بھی کافی جائیداد تھی۔ زینت کے ان کے گھر میں آ جانے سے ان کی دولت اور جائیداد میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ زینت کی اپنی سسرال میں زبردست آؤ بھگت کی گئی کیونکہ وہ خالی ہاتھ نہیں آئی تھی۔ بہت بھاری اور قیمتی جہیز ساتھ لانے کے علاوہ وہ ایک بڑی جائیداد بھی اپنے ساتھ کر آئی تھی۔

جب تک برکت زندہ تھا تب تک وہ ساری زمینوں اور جائیداد وغیرہ کا کام خود ہی سنبھالتا تھا۔ زمینوں پر سارا کام مشترکہ ہوتا تھا اور وہ زینت کے حصے کی آمدنی کی رقم اس کو دے دیتا تھا۔ زینت کی شادی کو سات آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ ایک بیٹے کی ماں بھی بن چکی تھی۔ جس کا نام منور علی تھا اور جائیداد میں اس کے حصے کے سلسلے میں بھی یہی

بندوبست چلا آ رہا تھا۔ اس کے سسرال والوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہیں بغیر کسی محنت کے رقم حاصل ہو جاتی تھی اور دوسری بات یہ تھی کہ زمین کی اگر تقسیم کر دی جاتی تو اس طرح اس سے حاصل ہونے والی آمدنی میں بھی فرق پڑ جاتا۔ زینت کا شوہر صفدر علی اس صورت حال سے بالکل مطمئن تھا۔

برکت کا انتقال ہو گیا تو یونس نے اپنی بڑی بہن کو یہ پیشکش کی کہ اگر وہ چاہے تو سابقہ بندوبست کو ہی چلنے دیا جائے اور اگر وہ اس پر راضی نہ ہو تو زمین کی تقسیم کر دی جائے۔ زینت اپنے بھائی پر دم دیتی تھی۔ یہ زمین جو اس کی اور اس کے اکلوتے بھائی کی ملکیت تھی۔ اس کے باپ کی یادگار تھی وہ بھلا اس کے سینے پر لکیر کیونکر کھینچ سکتی تھی؟ اس نے اپنے شوہر سے اس سلسلے میں اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی اور اپنے بھائی سے کہہ دیا کہ پہلے والے بندوبست کو اسی طرح جاری رہنے دیا جائے۔

صفدر علی کو اپنی بیوی کی یہ بات زیادہ پسند نہیں آئی، لیکن اس نے اس سے جھگڑا نہیں کیا۔ زینت تو اس کے لیے دودھ دینے والی گائے تھی اور دودھ دینے والی گائے کی تو دو لاتیں بھی برداشت کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ اس نے زینت کی یہ لات خاموشی سے برداشت کر لی۔ رقم تو بہر حال آ ہی رہی تھی۔

کئی سال گزر گئے اور اس دوران صفدر علی کو اپنے برادر نسبتی یونس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ صفدر علی ایسا اللہ کا نیک بندہ نہیں تھا کہ سب کچھ یونس پر چھوڑ کر اطمینان سے گھر بیٹھا رہتا۔ وہ صورت حال سے پوری طرح باخبر رہتا تھا۔ اسے رتی رتی علم رہتا تھا کہ اس سال مختلف فصلوں کی کیا حالت رہی ہے۔ کتنا خرچہ کیا گیا ہے اور کتنا منافع حاصل کیا گیا ہے۔ خرید و فروخت وغیرہ کتنے کی ہوئی ہے۔ چونکہ سب کچھ بالکل ٹھیک تھا۔ اس لیے اس نے کبھی یہ ضروری نہیں سمجھا کہ وہ ان زمینوں پر زینت کے شوہر کی حیثیت سے خود قبضہ کر لے اور ان کا انتظام سنبھال لے اور جہاں تک زینت کا تعلق تھا تو اس کی جانب سے ایسی کسی کارروائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ اپنے بھائی سے الگ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ اگرچہ جائیداد اور اس کے انتظامات کی حد تک تو معاملات ٹھیک ٹھاک تھے، لیکن باقی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔

زینت بہت چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا منور علی کچھ لکھ پڑھ لے اور اس نے اس کو بار بار اسکول بھیجنے کی کوشش بھی کی، لیکن منور علی کو اسکول سے کبھی کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہو سکی اور زینت کو سب سے زیادہ افسوس اس بات پر ہوتا تھا کہ اس کے شوہر نے اپنے بیٹے کے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رجحان کی کبھی حوصلہ شکنی نہیں کی، بلکہ الٹا حوصلہ افزائی ہی کی۔ منور علی اگر لکھنے پڑھنے سے گریزاں تھا تو صفدر علی نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ وہ اسکول جائے۔ اس نے اس کو تعلیم سے رغبت دلانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور اس عمل میں زینت تنہا تھی۔ مگر منور علی ماں کی بات کو دو کوڑی کی بھی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اسے اسکول سے بھاگنے میں باپ کی شہ حاصل تھی تو وہ اور بھی شیر رہتا تھا۔

بات اس وقت سے اور بھی زیادہ خراب ہونی شروع ہوئی جب صفدر علی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ زینت اپنے بھائی اور بھاوج سے ان کی بیٹی نوشابہ کے لیے منور علی کے رشتے کی بات چلائے۔

یونس کے گھرانے کا انداز بالکل مختلف تھا۔ یونس اور اس کی بیوی سلیمہ اپنے بچوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دے رہے تھے۔ یونس کی بیٹی نوشابہ بچپن سے ہی اسکول جاتی تھی اور اس وقت وہ ساتویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ یونس اور سلیمہ اکثر زینت سے اس بات پر کھل کر اظہار افسوس کیا کرتے تھے کہ اس کا بیٹا منور علی اسکول کیوں نہیں جا رہا۔ زینت بڑے دکھ کے ساتھ ان کو یہی بتاتی تھی کہ ان دونوں باپ بیٹوں کو تعلیم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

زینت کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا بھائی کبھی اپنی بیٹی کے لیے منور علی کا رشتہ قبول نہیں کرے گا اور وہ خود بھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ نوشابہ کا رشتہ اس کے بیٹے سے ہو۔ وہ اپنے بیٹے کو نوشابہ جیسی لڑکی کے لیے مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے شوہر سے صاف انکار کر دیا۔

''تم کوشش کرو تو یہ رشتہ ہو سکتا ہے۔'' صفدر علی نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ بات معلوم ہے کہ منور علی نوشابہ کو بہت پسند کرتا ہے اور پھر نوشابہ ہمارے گھر کی بہو بن کر آ جائے گی تو یونس کے ساتھ ہمارے تعلقات اور زیادہ پختہ ہو جائیں گے۔ جائیداد کے معاملات بھی.....''

''جائیداد کے معاملات کا اس سے کیا تعلق ہے؟'' زینت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جائیداد کے معاملات جیسے اب ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں، ویسے ہی آئندہ بھی چلتے رہیں گے۔ مگر یونس اور نوشابہ منور کو اپنا داماد بنانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔''

''کیوں نہیں تیار ہوں گے؟'' صفدر علی نے جھلا کر کہا۔ ''آخر کیا خرابی ہے ہمارے بیٹے میں؟ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اگر وہ پڑھ نہیں رہا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اسے کون سا نوکری کرنی ہے؟''

صفدر علی نے بہت چاہا کہ زینت اپنے بھائی اور بھاوج سے اس معاملے پر بات کرنے کے لیے تیار ہو جائے، لیکن زینت نے صاف انکار کر دیا۔ خود منور علی نے بھی اپنی ماں سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ نوشابہ سے اس کے رشتے کی بات چلائے لیکن زینت نے اپنے بیٹے کو سمجھایا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

''میں اس قسم کی بات کہہ کر تمہارے ماموں کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی۔'' زینت نے منور سے کہا۔ ''میں جانتی ہوں۔ اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ انہیں یہ رشتہ قبول نہیں ہوگا، لیکن انہیں میری بات کو رد کرتے ہوئے بہت دکھ ہوگا اور میں اپنے بھائی کو دکھ نہیں دینا چاہتی۔''

''یہ ہم لوگوں کو دکھ دے سکتی ہیں، مگر اپنے بھائی کو دکھ نہیں دے سکتیں۔'' صفدر علی نے جو یہ باتیں سن رہا تھا بیزاری اور برہمی سے کہا۔ ''ان کے لیے سب کچھ ان کا بھائی ہے۔ ہم لوگ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔''

زینت نے رشتے کی بات چلانے سے بالکل منع کر دیا تھا، لیکن صفدر علی اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ زینت کے بغیر ہی اکیلا یونس اور سلیمہ کے گھر پہنچ گیا اور اس نے نوشابہ کے لیے اپنے بیٹے منور کا پیغام دے دیا۔

''زینت اس لیے میرے ساتھ نہیں آئی کہ وہ خواہ مخواہ ڈرتی اور گھبراتی ہے۔'' صفدر علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس کو بہت سمجھایا کہ اپنے لوگوں سے کیا ڈرنا اور گھبرانا..... یہ تو بہت زیادہ خوشی کی بات ہوگی اگر یہ رشتہ ہو جائے۔ مگر وہ آنے پر تیار نہیں ہوئی تو میں نے سوچا کہ اس بار میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا اور اگلی بار اس کو ساتھ لے کر آؤں گا۔''

یونس اور نوشابہ نے بڑی نرمی، خوش اسلوبی لیکن پوری قطعیت کے ساتھ اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ نوشابہ کی شادی میں ابھی بہت دیر ہے، اسے ڈاکٹر بننا ہے اور اس میں ابھی کم از کم دس سال لگیں گے..... اور دس سال میں تو دنیا بہت بدل جاتی ہے۔''

یونس اور نوشابہ کا دوٹوک اور واضح جواب سن کر صفدر علی بہت برافروختہ ہوا اور اس نے گھر واپس آنے کے بعد ان دونوں کے خلاف سخت برہمی کا اظہار کیا، جنہوں نے رشتے داری کا کوئی خیال نہیں کیا تھا۔ اس کی اس برہمی میں اس کا بیٹا منور بھی برابر کا شریک تھا۔

''مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ لوگ نہیں مانیں گے۔'' زینت نے کہا۔ ''یہ کوئی جوڑ ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں ہے، تم وہاں گئے ہی کیوں تھے؟''

''ارے کیا جوڑ نہیں ہے؟'' صفدر علی نے غصے میں بھناتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے بھائی کی بیٹی میں کوئی سرخاب کے پر تو نہیں لگے ہوئے ہیں۔ اس جیسی کتنی لڑکیاں مل جائیں گی ٹکے ٹکے میں۔ میرے بیٹے کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تمہارے بھائی کی بیٹی پر..... میں نے تو صرف یہ چاہا تھا کہ گھر میں ہی رشتہ ہو جائے تو اچھا ہے۔''

صفدر علی کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ یونس اس کو زیادہ پسند نہیں کرتا ہے، لیکن صفدر علی نے اس بات کو کبھی آگے اس لیے نہیں بڑھنے دیا کہ یونس کی وجہ سے وہ بہت سارے بکھیڑوں سے بچا ہوا تھا۔ اس کی بیوی کے حصے کی جو جائیداد تھی اس کی آمدنی بلا ہاتھ پیر ہلائے مل جاتی تھی۔ اس لیے بلاوجہ یونس سے کوئی محاذ آرائی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

لیکن اب تو معاملہ کچھ اور تھا۔ یونس نے اس کی توہین کی تھی۔ اس کے بیٹے کے رشتے کو ٹھکرا دیا تھا اور یونس کی بہن زینت اپنے شوہر اور بیٹے کا ساتھ دینے کے بجائے کھلم کھلا اپنے بھائی کا ساتھ دے رہی تھی۔

دونوں میاں بیوی کے رویوں میں نمایاں فرق کے باعث گھر کی فضا میں تھوڑی بہت کشیدگی تو پہلے ہی موجود رہتی تھی۔ اب اس میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا..... اور کچھ ہی دنوں کے بعد صفدر علی کی جانب سے کیے جانے والے ایک نئے مطالبے نے اس گھر کی کشیدگی کو مزید بڑھا دیا۔

''میں نہیں چاہتا کہ تمہاری جائیداد کی دیکھ بھال یونس ہی کرتا رہے۔'' اس شام صفدر علی نے اپنی بیوی سے کہا۔ منور علی بھی ان دونوں کے پاس موجود تھا۔ ''میں اب خود اس جائیداد کی دیکھ بھال کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اب اس کا انتظام خود سنبھالنا ہے۔''

''مگر کیوں؟'' زینت نے حیرت اور ناپسندیدگی کے ساتھ کہا۔ ''تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟ ہمیشہ سے یونس ہی اس جائیداد کی دیکھ بھال کرتا چلا آ رہا ہے، اب کیا ہو گیا؟ یونس نے تو کبھی ایک پائی کا بھی ہیر پھیر نہیں کیا۔''

''پہلے کی بات اور تھی۔'' صفدر علی نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اب میں اس قصے کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ تم یونس سے کہہ دو کہ وہ تمہارے حصے کی جائیداد کا انتظام میرے حوالے کر دے۔''

''نہیں۔'' زینت نے سختی سے کہا۔ ''میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔ اگر میں ایسا کروں گی تو یونس یہ سمجھے گا کہ ہمیں اس پر اعتماد نہیں رہا ہے۔''

''سمجھتے ہیں تو سمجھنے دو اماں۔'' منور علی نے آنکھیں نکال کر اپنی ماں سے کہا۔ ''جب ماموں کو ہمارا کوئی خیال نہیں تو ہم کیوں.....''

''چپ رہو تم۔'' زینت نے بڑے زور سے اس کو ڈانٹا۔ ''بڑوں کے بیچ میں تم کو بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیوں ضرورت نہیں ہے؟'' صفدر علی نے بگڑ کر کہا۔ ''وہ کوئی دودھ پیتا بچہ تو نہیں ہے، بڑی عمر کا لڑکا ہے..... اور پھر..... سب سے زیادہ توہین تو اس کی ہوئی ہے۔ تمہارے بھائی نے اس کو ٹھکرا دیا ہے۔''

''ہم اپنی زمینیں خود سنبھال لیں گے۔'' منور علی نے اکڑتے ہوئے کہا۔ ''کوئی ضرورت نہیں ہے انہیں ماموں کے پاس رکھنے کی۔ تم ان سے کہہ دو کہ وہ ہماری زمینیں ہمارے حوالے کر دیں۔''

''میں یہ بات یونس سے کبھی نہیں کہوں گی۔'' زینت نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''یونس ان زمینوں کو ہمیشہ سے سنبھالتا چلا آیا ہے اور آئندہ بھی وہی سنبھالے گا۔''

گھر کی فضا میں تلخیاں کچھ اور زیادہ گھل گئیں۔ گھر میں اب واضح طور پر صف بندی ہو چکی تھی اور ایک مستقل محاذ آرائی کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک طرف زینت اکیلی تھی، دوسری طرف وہ دونوں باپ بیٹے تھے اور کشیدگی تھی۔ برہمی تھی اور تصادم تھا۔

دونوں باپ بیٹے مل کر زینت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ اپنی زمینوں کی نگرانی کا کام اپنے بھائی سے واپس لے لے، لیکن زینت اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ یہ زمینیں اس کی تھیں۔ اس کے باپ نے اس کو دی تھیں اور کسی دوسرے شخص کا ان پر حق نہیں تھا۔ اس کا بھائی شروع دن سے ہی ان کی نگرانی کا کام کرتا رہا تھا۔ وہ اب اسے نکال کر اپنے مرے ہوئے باپ کی روح کی تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔

اور اب صورت یہ بن گئی تھی کہ صفدر علی سے زیادہ منور علی اپنی ماں سے بدتمیزی اور زبان درازی کرتا تھا۔ اس کے دل میں اپنے ماموں کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی تھی اور اس کی ماں اس شخص کی حمایت کر رہی تھی اور اس کے لیے نرم گوشہ اپنے دل میں رکھتی تھی۔ منور علی کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔

زینت نے اس دباؤ کا پورے طور سے مقابلہ کیا۔ اس نے ہرگز ان لوگوں کی بات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں مانی اور اپنے مؤقف پر ڈٹی رہی۔

گھروں میں ہونے والی باتیں صرف گھروں کی چار دیواری تک محدود نہیں رہتیں۔ خصوصاً چھوٹی جگہوں میں۔ جہاں لوگ ایک دوسرے کے حالات سے واقف رہنے کی دانستہ کوشش کرتے ہیں۔ صفدر علی کے گھر میں شدت اختیار کرنے والی کشیدگی کے بارے میں رفتہ رفتہ دوسرے لوگوں کو بھی معلوم ہونے لگا اور اگرچہ زینت نے اپنے بھائی یا بھاوج سے اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ پھر بھی ان لوگوں تک یہ خبر پہنچ گئی۔ یونس اس صورت حال سے سخت پریشان ہوا۔ وہ اپنی بہن کو جسے بہت چاہتا تھا۔ کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا، لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ صفدر علی کا مطالبہ پورا نہیں کر سکتا تھا۔ اس معاملے کا تعلق اس کی بیٹی کی زندگی سے تھا۔ وہ اپنی بہن کو خوش رکھنے کے لیے خود ذاتی طور پر کوئی بھی دکھ برداشت کرنے کے لیے تیار تھا، لیکن وہ اپنی بیٹی کی زندگی کا سودا نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم زینت کی جائیداد کے نظم و نسق سے دستبردار ہو جانے میں اسے کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس نے زینت سے ملاقات کے دوران اس معاملے پر صاف طور سے گفتگو کی۔

''تم اپنی جائیداد کا انتظام صفدر بھائی کے حوالے کر دو آپا۔'' اس نے کہا۔ ''وہ اگر ایسا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے، اس میں ہرج ہی کیا ہے۔''

''اس میں ہرج ہے یونس۔'' زینت نے کہا۔ ''اول دن سے آج تک اس ساری جائیداد کا کام تم سنبھالتے چلے آ رہے ہو۔ صفدر علی کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اب اگر وہ کام تم سے واپس لے لیا جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ مجھے تم پر بھروسہ نہیں رہا اور پھر..... وہ جائیداد خالص میری ہی ہے۔ مجھے اپنے باپ سے ملی ہے۔ اس پر صرف میرا اختیار ہے۔ میں جو چاہوں کروں۔ صفدر علی کے پاس اچھی خاصی زمین جائیداد موجود ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نیک لوگ نہیں۔ میں نے ایک دن صفدر علی اور اس کی بہن حُسنہ کی باتیں سنی تھیں۔ ان دونوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ میں کھڑکی کے باہر موجود ہوں۔ حُسنہ، صفدر علی سے یہ کہہ رہی تھی کہ وہ میری جائیداد کو اپنے نام کروا لے تاکہ سب کچھ صفدر علی کے قبضے میں آ جائے۔ حُسنہ کہہ رہی تھی کہ اس کا میاں بشیر الدین اس بات کے لیے تیار ہے کہ میری جائیداد کی ساری دیکھ بھال کرے گا اور صفدر علی سے اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں لے گا۔ صفدر علی کہہ رہا تھا کہ اس کے دل میں بھی بالکل یہی بات ہے کہ وہ میری جائیداد کو اپنے نام کروا لے۔ مگر وہ اس کام میں جلدی نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے اپنی بہن سے صاف صاف کہا کہ وہ نوشابہ کے ساتھ منور کی شادی کے ذریعے تمہاری جائیداد تک رسائی حاصل کرنا

چاہتا تھا، لیکن تم لوگوں نے اس شادی سے انکار کر کے معاملے کو خراب کر دیا۔ اگر آج میں اپنی جائیداد کا انتظام صفدر علی کے حوالے کر دوں گی تو کل پھر یہ مطالبہ بھی سامنے آ جائے گا کہ پھر اپنی جائیداد اس کے نام کر دوں اور وہ، اس کی بہن حُسنہ اور حُسنہ کا میاں بشیر الدین، وہ سب کے سب اس جائیداد کا جو جی چاہے کریں اور میری دو کوڑی کی حیثیت نہ رہ جائے۔''

''حُسنہ اور بشیر الدین کی نیت کو تو میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔'' یونس نے کہا۔ ''دونوں ہمیشہ دوسروں کا مال گھسیٹنے کی تاک میں رہتے ہیں، لیکن صفدر بھائی کو تم سے ایسا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔ آخر تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ تمہارے اکلوتے بیٹے ہی کا تو ہے۔''

''میں تو اس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔'' زینت نے کہا۔ ''لیکن یہ لوگ نہیں سمجھتے۔ میں کون سا جائیداد کو اپنی چھاتی پر اٹھا کر قبر میں لے جاؤں گی؟ لیکن جب تک میں زندہ ہوں میں اپنی مضبوطی رکھنا چاہتی ہوں۔''

صفدر علی کے اگلے مطالبے کے لیے زینت کو زیادہ دنوں تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔

''اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارے بھائی سے تمہاری جائیداد کا انتظام واپس لینے سے تمہارے بھائی کی بے عزتی ہوگی تو پھر ایسا کرو کہ اپنی اس جائیداد کو میرے نام کر دو۔'' اس شام صفدر علی نے زینت سے کہا۔ منور علی بھی اس موقع پر موجود تھا۔ ''جب جائیداد میرے نام ہو جائے گی تو پھر مجھے اختیار ہوگا کہ میں اس کا انتظام جس طرح چاہوں چلاؤں اور تمہارے بھائی کی بھی کوئی بے عزتی نہیں ہوگی۔

''نہیں.....'' زینت نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''میری جائیداد کا انتظام جس طرح چل رہا ہے اسی طرح سے چلنے دو۔ جائیداد میرے نام ہے یا تمہارے نام، رقم تو تمہیں برابر مل رہی ہے۔ کیا میں وہ رقم کسی اور کو دے دیتی ہوں؟''

''سوال رقم کا نہیں ہے اماں۔'' منور علی نے خشک لہجے میں کہا۔ ''ہم نہیں چاہتے کہ تمہاری جائیداد پر ماموں سانپ بن کر بیٹھے رہیں۔''

''بس بس.....'' زینت نے غصے سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''خبردار جو ایسی بے ہودہ باتیں زبان سے نکالیں۔ اپنے بڑوں کے بارے میں ایسا کہتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

''کن بڑوں کی بات کر رہی ہوں اماں؟'' منور علی نے ترکی یہ ترکی جواب دیتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے کہا۔ ''بڑوں کو بھی تو چھوٹوں کا کچھ خیال ہونا چاہئے۔''

اس روز کے بعد سے گھر کی فضا اور زیادہ مکدر رہنے لگی۔ صفدر علی مسلسل زور دے رہا تھا کہ زینت اپنی جائیداد اس کے نام کر دے۔ اس کا مطالبہ اب صرف جائیداد کے انتظام کی تبدیلی کا نہیں تھا..... وہ تو اب صاف صاف جائیداد کی اپنے نام منتقلی چاہتا تھا۔ اس کا بیٹا اس کے مطالبے کا پوری طرح سے حامی تھا اور اپنے ماموں سے برملا نفرت کا اظہار کرتا تھا۔ ان دونوں کے مقابلے میں زینت تھی جو چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ کسی صورت بھی اپنی جائیداد سے دستبردار نہیں ہوگی۔ اس نے صفدر علی کی بیوی کی حیثیت سے اس گھر میں جتنے بھی دن گزارے تھے۔ اس کی جائیداد کا انتظام اس کے بھائی کے ہاتھ میں رہا تھا جس سے مستقل آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ اس قابل اعتماد اور مضبوط سہارے سے محروم ہوگئی تو اس گھر میں اس کی حیثیت کیا رہ جائے گی۔ ویسے بھی صفدر علی اکثر اشارتاً اس سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر چکا تھا کہ اس کے ایک سے زائد بیٹے ہوتے۔ خواہش تو زینت کی بھی یہی تھی، لیکن وہ پوری نہیں ہو سکی۔

شوہر اور بیٹے کے شدید مخالفانہ رویئے نے رفتہ رفتہ زینت کے اعصاب کو شل کرنا شروع کر دیا۔ وہ بیمار رہنے لگی۔ گھر سے اس کی دلچسپی اور بھی کم ہونے لگی۔ یونس اور اس کی بیوی سلیمہ کا ان لوگوں کے گھر آنا جانا بالکل بند ہو چکا تھا، کیونکہ رشتے سے انکار کے بعد سے دونوں باپ بیٹے اس گھر میں ان کے وجود کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ زینت خود ہی کبھی کبھار بھائی کے گھر چلی جاتی تھی، لیکن اس کے شوہر اور بیٹے کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی اور جب بھی انہیں اس کا علم ہوتا کہ زینت اپنے بھائی کے گھر گئی تھی تو گھر میں بہت زور کا جھگڑا ہوتا تھا۔ صفدر علی اور منور علی دونوں یونس اور اس کی بیوی کو کھل کر گالیاں دیتے اور زینت کو دھمکیاں دیتے کہ اگر اس نے ان لوگوں کے گھر میں قدم رکھا تو اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا اور ساتھ ہی یہ مطالبہ روز بروز شدت پکڑتا جا رہا تھا کہ وہ اپنی جائیداد صفدر علی کے نام کر دے۔

زینت کی بیماری تیزی سے بڑھتی گئی، لیکن اس کے شوہر اور اس کے بیٹے نے اس کے علاج کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ زینت سے اب گھر کا کام کاج بھی ٹھیک سے نہیں ہو پاتا تھا۔

انہی دنوں ایک روز شکوراں جو صفدر علی کی دور کی رشتے دار تھی۔ زینت کی بیماری کا احوال سن کر اس سے ملنے کے لیے صفدر علی کے گھر آئی۔ شکوراں اس وقت کسی ایسے رشتے

دار کے ہاں رہ رہی تھی جہاں اس کی ضرورت تقریباً ختم ہو چکی تھی اور شکوراں کو اپنے لیے کسی نئے گھر کی تلاش تھی۔ جہاں اسے رہنے کا سہارا مل سکے۔ وہ ایک عرصے سے یونہی بے گھری کی زندگی گزار رہی تھی۔

صفدر علی نے خود ہی شکوراں کو یہ پیشکش کی کہ وہ ان لوگوں کے گھر آ کر رہے۔ کیونکہ زینت کی مسلسل بیماری کی وجہ سے گھر کا سارا انظام الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔

شکوراں کو تو خود ہی ایک پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ اس نے فوراً ہی صفدر علی کی پیشکش قبول کر لی۔

زینت نے خالہ شکوراں کو اپنے گھر میں رکھنے کی مخالفت نہیں کی۔ وہ شکوراں سے بہت اچھی طرح واقف تھی۔ شکوراں ایک بہت دردمند اور محبت کرنے والی عورت تھی۔ وہ جن جن گھروں میں بھی جا کر رہتی تھی وہاں کے سب لوگوں کی بلا تخصیص، بے لوث خدمت انجام دیتی تھی اور کسی کو بھی اس سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ زینت کو اس بات کا کوئی خوف نہیں تھا کہ شکوراں چونکہ صفدر علی کی رشتے دار ہے۔ اس لیے وہ صفدر علی کے ساتھ مل کر زینت کی گھریلو مشکلات میں اضافے کا سبب بنے گی بلکہ اسے امید تھی کہ شکوراں اس کے ساتھ ہمدردی کرے گی۔

اگلے ہی دن شکوراں اپنے مختصر سامان کے ساتھ صفدر علی کے گھر آ گئی۔

اور یوں شکوراں انسانی رشتوں کے پیچ و خم کے اس عجیب و غریب جال میں داخل ہو کر اس داستان کا ایک لازمی حصہ بن گئی۔ اس وقت اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ قدرت نے اس کو اس داستان میں کتنا اہم کردار ادا کرنے کے لیے منتخب کر لیا ہے۔

زینت اور شکوراں بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئیں اور زینت نے رفتہ رفتہ اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو اب تک اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ شکوراں ایک قابل اعتماد راز داں تھی۔ اسے زینت سے گہری ہمدردی تھی، لیکن وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اس گھر میں اس کی ایسی حیثیت نہیں تھی کہ وہ کسی معاملے میں اپنی مرضی منوا سکے۔ یہ گھر اس کے لیے دوسرے تمام گھروں کی طرح جہاں وہ اس سے پہلے رہ چکی تھی، ایک ایسی پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا جہاں اسے قیام و طعام کی سہولتیں تو حاصل تھیں، لیکن دیگر معاملات میں اس کے اختیارات بہت محدود تھے۔ ہر گھر میں اس کے اختیارات کا دائرہ اس گھر کے لوگ ہی متعین کرتے تھے اور خالہ شکوراں اس دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرتی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زینت کی بیماری جب بہت زیادہ بڑھ گئی تو یونس ایک بار خود اس کو لے کر ایک مشہور ڈاکٹر کے پاس گیا۔ زینت کو ابھی تک باقاعدہ ڈاکٹری علاج میسر نہیں آیا تھا۔ حکیمی اور روحانی علاج پر ہی گزارہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نے زینت کو کئی ٹیسٹ وغیرہ لکھ کر دیئے۔ ان میں سے بعض ٹیسٹوں کے لیے زینت کو کسی بڑے شہر میں جانے کی ضرورت تھی۔ یونس نے اپنے بہنوئی پر بہت زور دیا کہ وہ زینت کو ٹیسٹ کے لیے لے جائے، تاکہ پھر اس کا باقاعدہ علاج شروع ہو سکے۔ اس نے یہ بھی پیشکش کی کہ اگر صفدر علی اجازت دے تو وہ خود اپنی بہن کے باہر سے ٹیسٹ کروانے کے لیے تیار ہے، لیکن صفدر علی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔

خالہ شکوراں کی آمد سے زینت کو بہت بڑا سہارا مل گیا تھا۔ زینت بہت بیمار تھی اور شکوراں نے اس کا بہت خیال رکھا۔ فی الحقیقت اس گھر میں زینت کا خیال رکھنے والا اب شکوراں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس کے شوہر اور بیٹے کے پاس اس کے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ دونوں اپنی دنیا میں مست تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ زینت کے مرنے اور جینے سے بالکل بے نیاز ہو چکے ہیں۔ شکوراں ہر طرح سے زینت کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتی تھی اور زینت کے لیے اس کا دم بہت غنیمت تھا۔ زینت اب اتنی زیادہ بیمار ہو چکی تھی کہ وہ خود سے اپنے بھائی کے گھر نہیں جا سکتی تھی اور اس کے بھائی کا داخلہ تو اس گھر میں ممنوع تھا۔

زینت نے شکوراں کو اپنا رازداں بنا لیا تھا۔ شکوراں کی اس خصوصیت سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھی کہ اس کا گہرا اور وسیع سینہ کتنے ہی گھرانوں کے خفیہ اور اہم رازوں کی آماجگاہ ہے اور وہ ان رازوں کی حفاظت کرنا جانتی ہے۔ زینت نے شکوراں سے کوئی بھی بات نہیں چھپائی۔

زینت کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی تو شکوراں نے خاموشی سے یونس سے بات کی اور اس نے اس کو اس کی بہن کی خراب حالت کے بارے میں بتایا۔

''میں صفدر علی اور منور علی سے چھپ کر تمہارے پاس آئی ہوں۔'' شکوراں نے یونس سے کہا۔ ''اگر ان لوگوں کو پتہ چلے گا تو وہ کھڑے کھڑے مجھ کو گھر سے نکال دیں گے۔ تم اپنی بہن کے لیے کچھ کرو ورنہ وہ مر جائے گی۔''

''میں کیا کروں؟'' یونس نے شدید بے بسی اور غم و غصے کے عالم میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''میں تو انہیں خود ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا اور آگے بھی ان کا علاج جاری رکھنا چاہتا تھا، لیکن صفدر علی نے تو اس کی اجازت ہی نہیں دی۔ ٹھیک ہے میں اب صفدر علی سے دوبارہ بات کرتا ہوں۔ میں آپا کو کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر لے آؤں گا اور اپنے پاس رکھ

کر ان کا علاج کرواؤں گا۔''

''صفدر علی سے بات کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' شکوراں نے اداسی کے ساتھ کہا۔ ''میں اچھی طرح جانتی ہوں وہ نہیں مانے گا۔ زینت اس کی بیوی ہے۔ وہ تمہاری بہن ضرور ہے، لیکن اس پر اختیار تو اس کا ہی ہے۔''

''تو پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟'' یونس نے بے بسی کے ساتھ کہا۔

''اپنے اور اس کے خاندان کے بزرگوں کو جمع کرو۔'' خالہ شکوراں نے کہا۔ ''ان کے سامنے اس معاملے کو رکھ کر ان سے کہو کہ وہ صفدر علی کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ تمہیں زینت کا علاج کروانے کی اجازت دے۔''

''ٹھیک ہے۔'' یونس نے کہا۔ ''میں ایسا ہی کرتا ہوں۔''

''مگر ایک بات کا خاص طور سے خیال رکھنا۔'' شکوراں نے کہا۔ ''میرا نام کبھی بھولے سے بھی تمہاری زبان پر نہ آنے پائے۔''

یونس نے کہا۔ ''بھلا میں تمہارا نام اپنی زبان پر لا سکتا ہوں؟'' یونس نے فوراً ہی اس سلسلے میں کام کرنا شروع کر دیا، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوا۔ اس کے اگلے ہی دن زینت کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بھائی کے علاوہ اور کسی کے لیے بھی اس کی موت شاید ہی گہرے صدمہ کا باعث بنی ہو۔

''خالہ شکوراں۔'' زینت کے انتقال کے چند دن کے بعد ہی صفدر علی نے کہا۔ ''زینت تو چلی گئی اور اب ہمارے گھر کو سنبھالنے کے لیے کوئی عورت نہیں رہ گئی ہے۔ اب تم کہیں اور نہ جاؤ۔ بس یہیں ہم لوگوں کے ساتھ رہو۔ گھر کو سنبھالو۔ میں اور منور، بس دو ہی آدمی ہیں اس گھر میں اور تیسری تم ہو تو تم اس گھر میں مالکن بن کر رہو۔''

زینت کی المناک موت کے باوجود خالہ شکوراں کے لیے یہ پیشکش بہت پُرکشش تھی۔ زندگی میں مفاہمت کے بغیر بھلا کہاں گزارا ہوتا ہے؟ اسے کسی نہ کسی کے گھر میں کسی نہ کسی کے ساتھ تو رہنا ہی تھا، تو یہاں کیوں نہیں؟ زینت بے چاری تو دکھ جھیلتے جھیلتے اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی اور اب اس گھر میں کوئی عورت موجود نہیں تھی۔ وہ بڑے اطمینان اور آزادی کے ساتھ یہاں رہ سکتی تھی اور اس گھر کو سنبھال سکتی تھی۔ اس نے صفدر علی کی پیشکش کو قبول کر لیا۔

زینت کی موت کے کچھ ہی دنوں کے بعد صفدر علی اپنے بیٹے کے ساتھ یونس کے گھر پہنچا اور اس نے یونس سے کہا کہ وہ اپنی مرحومہ بیوی کی زمینوں کا انتظام خود سنبھالنا چاہتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔

''جیسی تمہاری مرضی۔'' یونس نے بے دلی اور غم و غصے کے ساتھ کہا۔''اس کی موت کے بعد جو کچھ اس کا تھا۔ وہ اب تمہارا اور منور کا ہے۔'' اور اس نے بلا کسی حیل و حجت کے زینت کی زمین اور جائیداد کا حساب کتاب صفدر علی کے سپرد کر کے خود کو اس ذمہ داری سے علیحدہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں خاندانوں کے درمیان تمام تر تعلقات ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔

☆======☆======☆

شام کا وقت تھا اور حمید الحسن آ چکا تھا۔ سب لوگ گھر ہی تھے اور فرید گھر میں کچھ اضطرابی قسم کی فضا محسوس کر رہا تھا۔ اماں اور آپا قدرے بے چین نظر آ رہی تھیں اور ان دونوں کی نظریں وقفے وقفے سے دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں کسی کا انتظار ہو۔ فرید ابا کے ساتھ چائے پی چکا تھا اور آج تو اماں اور آپا نے چائے کے ساتھ کئی چیزیں بھی بنائی تھیں۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

''دیکھو فرید..... دروازے پر کون ہے۔'' اماں نے جلدی سے کہا۔ ان کے لہجے میں ایک اضطرابی اور ہیجانی کیفیت تھی۔

فرید نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اسے دروازے پر صفدر علی نظر آیا۔ صفدر علی اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ اس کے بیٹے منور کے بجائے آج ایک دوسرا شخص تھا اور یہ تھی خالہ شکوراں..... فرید شکوراں کو خوب پہچانتا تھا اور اسے یہ بات بھی معلوم تھی کہ شکوراں صفدر علی کے گھر میں رہ رہی ہے۔

اماں اور آپا تو ان دونوں کو دیکھتے ہی کھل اٹھیں۔ فرید کو ایسا لگا جیسے انہیں ان لوگوں کی آمد کا پہلے سے علم تھا اور وہ انہی کا انتظار کر رہی تھیں۔

مہمانوں کو اندر بلا لیا گیا۔ ابا نے ان کو دیکھ کر کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا۔

''کیسی ہو خالہ شکوراں؟'' ابا نے دعا سلام کے بعد صفدر علی کے بجائے شکوراں کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا۔

''اچھی ہوں۔'' خالہ شکوراں نے ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔''تم کیسے ہو؟ یہاں سب لوگ کیسے ہیں؟''

''ہم سب لوگ ٹھیک ہیں۔'' حمید الحسن نے جواب دیا۔ اماں اور آپا صفدر علی کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی تھیں۔

ذرا دیر کے بعد آپا اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کا بندوبست کرنا تھا۔

آپا کے وہاں سے جاتے ہی صفدر علی ابا سے مخاطب ہو کر بولا۔''بھائی حمید الحسن تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔''

''ضروری بات؟'' ابا نے چونک کر کہا۔''ہاں ہاں کہو..... ضرور کہو.....''

''تم کو تو معلوم ہے منور اب بے ماں کا بچہ ہے۔ اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو میں اس کو ساتھ لے کر آتا، لیکن اب وہ تو زندہ ہے نہیں..... خالہ شکوراں اس کی ماں اور بزرگ کی جگہ ہیں۔ تو میں ان کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔ تم یہ سمجھ لو کہ منور کے ماں باپ تم سے کچھ مانگنے کے لیے آئے ہیں۔''

''لیکن..... لیکن..... میں تم لوگوں کو کیا دے سکتا ہوں؟'' ابا نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔''تم لوگ مجھ سے کیا مانگ رہے ہو؟''

''ہم تم سے بیٹی مانگ رہے ہیں اور تمہیں بیٹا دے رہے ہیں۔'' صفدر علی نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔''ہماری دلی خواہش ہے کہ تم صفدر علی کو اپنی غلامی میں قبول کر لو۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' ابا نے ایک لمحے کے تامل کے بغیر فوراً ہی خشک اور سرد لہجے میں سیدھا اور دوٹوک جواب دے دیا۔''میری بیٹی کی شادی اس وقت تک نہیں ہو گی جب تک کہ وہ کم سے کم چودھویں جماعت پاس نہ کر لے۔''

''شوق سے کرے، چودھویں کرے، سولھویں کرے، اس سے بھی آگے کرے۔'' صفدر علی نے بھی فوراً ہی جواب دیا۔''کس نے روکا ہے؟ اور میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ کل ہی شادی کر دو۔ ایک بار بات پکی ہو جائے، بس پھر ٹھیک ہے۔ شادی تو دو ایک سال بعد بھی ہو سکتی ہے۔''

''نہیں بھائی صفدر علی۔'' ابا نے اس کی ساری باتوں کو فوراً ہی رد کرتے ہوئے کہا۔''بات صرف یہی نہیں ہے کہ میری بیٹی کی شادی میں ابھی دیر ہے بلکہ میری پڑھی لکھی لڑکی کے لیے یہ رشتہ مناسب نہیں ہے۔ تمہارے بیٹے نے پانچویں سے آگے پڑھ کر نہیں دیا۔ تم خود ہی سوچو، ان حالات میں یہ شادی بھلا کس طرح ہو سکتی ہے؟''

''ارے بھائی حمید الحسن پڑھنے لکھنے سے فرق ان لوگوں کے لیے پڑتا ہے جنہیں دو دو ٹکے کی نوکریاں کرنی پڑتی ہیں۔ ہمارے تمہارے بچوں کو پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے؟ ہمارے گھروں میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ تم اللہ کا نام لے کر ہاں کرو اور اس بات کو چھوڑو کہ کون کتنی جماعتیں پڑھا ہوا ہے۔"

"نہیں بھائی۔" ابا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ تم اپنے بیٹے کے لیے کوئی اور اچھی سی لڑکی تلاش کر لو۔"

"خالہ شکوراں۔" صفدر علی نے کہا۔ "تم ہی کچھ سفارش کرو...... تم تو اب منور کی ماں کی جگہ ہو۔"

"جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں صفدر علی۔" خالہ شکوراں نے کہا۔ "اگر خدا نے ان دونوں کا جوڑا بنا دیا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکے گی۔"

پھر وہ ابا سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تم فیصلہ کرنے میں جلدی مت کرو حمید الحسن...... بیٹی کے لیے ایک اچھا رشتہ آیا ہے۔ اس پر اچھی طرح غور کرو۔ صابرہ سے بھی مشورہ کرو وہ تمہاری بیوی ہے...... بیٹی کی ماں ہے۔ اس کا بھی حق ہے بیٹی پر۔"

آپا ابھی تک باورچی خانے میں تھیں اور اماں خاموشی کے ساتھ یہ ساری گفتگو سنتی رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر کوئی خوشگوار تاثر نہیں تھا اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ان کو ابا کا یہ انکار بالکل پسند نہیں آیا ہے۔

"سوچیں گے بھائی صفدر علی، سوچیں گے۔" اماں نے ذرا کمزور لہجے میں کہا۔ "تم نے یہ بات چھیڑی ہے تو ہم لوگ بھی سوچیں گے۔"

"ہم نے سوچ لیا ہے۔" ابا نے فوراً تیزی سے کہا۔ "اس میں اور کیا سوچنا ہے بھلا؟ سوچنے کے لیے کچھ نہیں رکھا ہے۔ یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے۔"

"جلدی نہ کرو حمید الحسن، جلدی نہ کرو۔" خالہ شکوراں نے کہا۔ "جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔"

اسی وقت آپا باورچی خانے سے ٹرے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے وہاں آ گئیں، جس میں مہمانوں کے لیے کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ ان کے آنے پر گفتگو کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ صفدر علی نے اس کے بعد زیادہ بات چیت نہیں کی۔ اس نے کھانے پینے میں بھی کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا، البتہ خالہ شکوراں خوب باتیں کرتی رہی اور اس نے کھانے پینے میں بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔ شادی کے بارے میں پھر کوئی بات نہیں کی گئی۔

"ہم لوگ پھر آئیں گے۔" خالہ شکوراں نے جانے کے لیے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"تم جب جی چاہے آ سکتی ہو خالہ شکوراں۔" ابا نے کہا۔ "بے شک سو دفعہ آؤ...... لیکن رشتے کے خیال سے مت آنا۔ یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔"

کسی نے ابا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ صفدر علی کے چہرے کا رنگ سیاہ ہو رہا تھا۔ وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی اماں جیسے ابا پر پھٹ پڑیں۔ "تم نے کیوں صفدر علی کو صاف جواب دے دیا؟" اماں نے ماتھے پر ستر بل ڈال کر کہا۔ "میں پوچھتی ہوں کون سی برائی ہے، اس کے بیٹے میں؟"

"برائی؟" ابا غصے سے بولے۔ "تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے؟ کون سی اچھائی ہے اس کے بیٹے میں؟ جاہل کا لٹھ...... الف کے نام بے بھی نہیں جانتا...... بے غیرت اتنا کہ اپنی سگی ماں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرتا تھا۔ یہ اور اس کا باپ دونوں مل کر زینت کو کھا گئے۔ وہ بے چارہ یونس...... کس قدر پریشان رہتا تھا اپنی بہن کے لیے، اس نے کتنا چاہا کہ خود اپنے خرچے پر بہن کا علاج کروا لے، مگر ان دونوں باپ بیٹوں نے اس کی ایک نہ سنی اور زینت کو قبر میں اتار کر ہی دم لیا...... اور......"

"ہمیں ان سارے قصوں سے کوئی مطلب نہیں۔" اماں نے ابا کی بات کاٹتے ہوئے تڑخ کر کہا۔ "ان لوگوں نے زینت کے لیے جو مناسب سمجھا ہو گا، وہی کیا ہو گا...... اور وہ یونس...... وہ کوئی ایسا فرشتہ نہیں ہے۔ وہ بہن کی جائیداد کو دبائے ہوئے بیٹھا ہے۔ اس کی تو اپنی نیت یہ تھی کہ بہن کی جائیداد پر پکا قبضہ کر لے۔"

"یہ سب بکواس ہے۔" ابا نے غصے سے کہا۔ "صفدر علی اپنی بیوی کی زمینوں پر قبضہ حاصل کر چکا ہے۔ یونس نے اس کو قبضہ دینے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگائی۔"

"دیکھو...... یہ ایک اچھا رشتہ ہے۔" اچانک اماں نے نرم اور مصالحانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "اچھے خاصے کھاتے پیتے خوشحال لوگ ہیں۔ ہم سے زیادہ حیثیت ہے ان کی، اور اب زینت کی جائیداد بھی مکمل طور پر ان کے ہی قبضے میں ہے۔ یہ گھر آئی ہوئی نعمت ہے، اس کو مت ٹھکراؤ...... منور اگر پڑھا لکھا نہیں ہے تو نہ ہو...... کیا فرق پڑتا ہے؟ صفدر علی ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ اسے کون سی نوکری کرنی ہے۔"

"نوکری کرنی ہو یا نہ کرنی ہو۔" ابا نے کہا۔ "مجھے ایک ان پڑھ داماد بالکل قبول نہیں ہے۔ میری بیٹی تو دسویں جماعت میں پڑھ رہی ہے اور وہ تو پانچویں جماعت......"

"تمہاری بیٹی دس نہیں بیس جماعتوں تک پڑھ جائے۔" اماں نے ابا کی بات کاٹتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے تیزی سے کہا۔ ''اسے کرنا تو وہی پڑے گا جو ساری دنیا کی عورتیں کرتی ہیں۔ وہی ہانڈی چولہا..... وہی بچے پالنا..... اور کیا کرے گی تمہاری بیٹی؟ کیا ملک کی وزیراعظم بنے گی؟''

''ہر پڑھی لکھی لڑکی ملک کی وزیراعظیم نہیں بن جاتی۔'' ابا نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ ''انسان کو ایک اچھا انسان بننے کے لیے بھی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی ابا اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے گویا اپنی طرف اس سلسلہ گفتگو کو ختم کر دیا تھا۔ انہوں نے فرید کو ساتھ لیا اور گھر سے باہر نکل گئے۔

اس روز کے بعد سے گھر کی فضا میں جیسے بارود بھر گئی اور آئے دن اس بارود میں چنگاریاں ڈالی جاتی تھیں اور سارا گھر جلنے اور جھلسنے لگتا تھا۔

اماں برابر ابا سے الجھتی رہتی تھیں اور ان پر زور دیتی رہتی تھیں کہ وہ آپا کے لیے منور علی کا رشتہ قبول کر لیں، لیکن ابا اس کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔ انہوں نے دوٹوک انداز میں انکار کر دیا تھا۔

اماں نے ابا پر یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ ان کی بیٹی خود اس رشتے پر راضی ہے اور وہ اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہی ہے کہ منور علی پڑھا لکھا ہے یا کم پڑھا لکھا۔ اس انکشاف نے بھی ابا کے رویے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی، بلکہ اس کے برخلاف انہوں نے اور بھی زیادہ سختی اختیار کی۔

''میں کسی قیمت پر منور علی کو اپنے داماد کے طور پر قبول نہیں کروں گا۔'' ابا نے اپنا آخری فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ کان کھول کر سن لو اور اس بات کو گرہ میں باندھ لو۔''

آپا اس روز اسکول نہیں گئی تھیں۔ فرید اکیلا ہی اسکول گیا تھا۔ دوپہر کو جب فرید اسکول سے واپس گھر آ رہا تھا تو اس نے گلی سے صفدر علی کو گزرتے ہوئے دیکھا۔ صفدر علی نے بھی فرید کو دیکھ لیا تھا، لیکن اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس نے فرید کو دیکھا ہی نہیں ہے اور کنی کاٹ کر نکل گیا۔

فرید کو معلوم تھا کہ اس گلی میں اس کے گھر کے علاوہ اور کوئی گھر ایسا نہیں ہے جہاں صفدر علی اور منور علی کا آنا جانا ہو۔ وہ سمجھ گیا کہ صفدر علی اس کے گھر سے ہو کر آ رہا ہے۔

اس کے چند روز کے بعد ہی ایک شام کو جبکہ ابا گھر آ چکے تھے۔ صفدر علی خالہ شکوراں کو ساتھ لے کر ایک بار پھر وہاں آن پہنچا۔ ابا ان لوگوں کو دیکھ کر ذرا بھی خوش نہیں ہوئے، بلکہ

انہوں نے خاصی سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔

تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد صفدر علی نے ابا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہم لوگ تم سے جواب لینے آئے ہیں بھائی حمید الحسن۔ تم نے ہماری درخواست پر کیا فیصلہ کیا؟''

''فیصلہ؟'' ابا نے چونک کر اس کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اب کون سا فیصلہ کرنا ہے؟ فیصلہ تو میں نے اسی وقت کر دیا تھا اور تم کو بتا بھی دیا تھا۔ یہ بات تو اسی وقت ختم ہو گئی تھی۔''

''تم غلط فیصلہ کر رہے ہو بھائی حمید الحسن۔'' صفدر علی نے خاصی ناگواری کے ساتھ کہا۔ ''منور اور دردانہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہیں گے۔''

صفدر علی کی بات سن کر ابا کے چہرے کا رنگ ایک دم سرخ ہو گیا۔

''اپنی بیٹی کو خوش رکھنا میرا کام ہے، تمہارا نہیں۔'' ابا نے جواب دیا۔ ''اور مہربانی کر کے آئندہ میرے سامنے اس بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔''

''ضد چھوڑو حمید الحسن۔'' صفدر علی نے نرمی سے کہا۔ ''شاید قدرت کو اسی میں سب کی بھلائی منظور ہو۔''

''جب میں ایک بار اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں تو پھر بار بار تم لوگ اس بات کو کیوں چھیڑ رہے ہو؟'' ابا نے ناگواری کے ساتھ جواب دیا۔

وہ لوگ ذرا دیر کے بعد ہی چلے گئے۔ آپا نے ان کی خاطر تواضع کا کچھ بندوبست کیا تھا، لیکن صفدر علی نے کچھ نہیں کھایا پیا۔ خالہ شکوراں نے بھی کچھ نہیں کھایا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد گھر میں ایک بار پھر گھمسان کا رن پڑا۔ اماں کہہ رہی تھیں کہ وہ آپا کی شادی منور علی کے ساتھ ضرور کروائیں گی اور ان کو ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

''میں کسی قیمت پر یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔'' ابا نے غیظ و غضب کے عالم میں کہا۔

''کون ہوتے ہو تم روکنے والے؟'' اماں نے چنگھاڑ کر کہا۔ ''وہ میری بھی بیٹی ہے۔ میرا بھی اس پر برابر کا حق ہے۔''

''اس کی شادی منور کے ساتھ کرانے کے لیے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔'' ابا نے گرج کر کہا۔

''اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔'' اماں زور سے دھاڑیں۔ ''مگر تم اس شادی کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں روک سکو گے۔ یہ شادی ضرور ہوگی۔''

''نہیں اماں.....'' فرید نے اس روز پہلی بار اس معاملے میں اپنی زبان کھولی اور اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ اسے اماں کی یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی تھی کہ وہ ابا کی لاش پر آپا کی شادی کروا رہی تھیں۔ ''منور مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ آپا کی شادی اس کے ساتھ مت کرواؤ۔''

''افوہ.....اب تُو بھی بولے گا بدنصیب؟'' اماں نے دانت پیس کر کہا۔ ''کیوں نہیں بولے گا، جیسا باپ ویسا بیٹا.....دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔''

فرید نے آپا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے ایسا لگا کہ ان کی آنکھوں سے غصے اور نفرت کے عالم میں چنگاریاں نکل رہی ہیں۔

اس کے بعد کئی دن تک گھر میں خاموشی رہی۔ اماں اور آپا نے ابا سے تو جیسے بات کرنا ہی چھوڑ دی تھی اور اب وہ دونوں فرید سے بھی بات نہیں کرتی تھیں۔ فرید اپنے گھر کی اس کشیدہ اور خراب ہوتی ہوئی فضا سے سخت پریشان اور وحشت زدہ تھا۔ اسے اماں اور آپا سے نفرت تو کبھی نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ اپنے باپ سے بے انتہا محبت کرتا تھا اور وہ ہر ایسے معاملے میں جہاں اماں اور ابا کے درمیان کوئی محاذ آرائی ہو، ابا کے ہی ساتھ تھا۔ صفدر علی اور اس کے بیٹے منور علی کو تو اس نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی پسند نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے اس خیال کا مکمل طور سے حامی تھا کہ منور علی جیسا لڑکا اس کی آپا کا شوہر بننے کے لائق نہیں ہے۔

کئی روز کے بعد، خاصی رات ہو چکی تھی اور سب لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ تب آپا نے فرید کو اپنے پاس بلا کر چپکے سے ایک لڈو اس کو دیا۔ ''لو یہ کھالو..... میں اسکول سے لائی تھی، تمہیں دینا بھول گئی۔ ایک لڑکی کے بھائی کی منگنی ہوئی تھی۔ وہ اپنی خاص خاص سہیلیوں کے لیے لڈو لے کر آئی تھی۔''

فرید نے خوش ہو کر لڈو لے لیا۔ آپا نے اسے اتنی محبت کے ساتھ لڈو دیا تھا تو اس نے بھی جواباً محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ لڈو کھالیا۔

اس لڈو کو کھاتے ہی فرید کو کچھ عجیب قسم کا احساس ہوا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہے اور اس کی آنکھوں میں بڑے زور کی نیند بھر رہی ہے۔ اس کا بے ساختہ جی چاہا کہ وہ جا کر لپٹ جائے اور فوراً سو جائے۔ وہ جا کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

لیکن گہری نیند کی اس کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہی۔ سوتے میں اس کو ایسا

لگا جیسے اس کے قریب کچھ لوگ زور زور سے باتیں کر رہے ہوں۔ نیم غنودگی کے عالم میں اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ آنکھیں کھولتے ہی اس کو سب سے پہلا احساس اس بات کا ہوا کہ اس کا سر بہت بھاری ہو رہا ہے اور اسے چکر آ رہے ہیں۔

لیکن جو منظر اس نے دیکھا۔ اس منظر نے اس کے دماغ کو فوراً بیدار اور متحرک کر دیا۔ وہ اب واضح طور پر دیکھ اور سن رہا تھا۔

کمرے میں صفدر علی اور ابا ایک دوسرے کے آمنے سامنے موجود تھے۔ اماں اور آپا ان سے کچھ فاصلے رکھڑی ہوئی تھیں۔

''تم ایک منٹ کے لیے برابر والے کمرے میں چل کر میری بات سن لو۔'' صفدر علی ابا سے کہہ رہا تھا۔

''تمہیں جو کچھ کہنا تھا، تم کہہ چکے ہو۔'' ابا نے جواب دیا۔ ''مجھے جو کچھ سننا تھا۔ وہ میں سن چکا ہوں۔ اب کہنے سننے کے لیے کچھ باقی نہیں ہے۔ تم مہربانی کر کے یہاں سے چلے جاؤ۔''

''بس ایک منٹ کے لیے میری بات سن لو۔'' صفدر علی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے، میری بات سننے کے بعد تم اپنا فیصلہ بدلنے کے بارے میں سوچو۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' ابا نے کہا۔

''پھر بھی، ایک منٹ کی بات سن لینے میں کیا ہرج ہے؟'' اماں نے خاصے نرم لہجے میں کہا۔ ''شاید وہ واقعی کوئی ضروری بات ہو۔''

''ٹھیک ہے، آؤ۔'' ابا نے کہا اور برابر والے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ یہ ابا کا کمرہ تھا۔

فرید کا دماغ الجھ رہا تھا۔ معلوم نہیں کیا ہو رہا تھا۔ صفدر علی ابا سے کیا کہنا چاہتا تھا۔

اچانک فرید نے برابر والے کمرے سے آنے والی ایک چیخ سنی اور سوتے جاگتے کی کیفیت میں اسے ایسا لگا جیسے یہ چیخ ابا کی تھی۔

ایک لمحے کے اندر اندر وہ اچھل کر بستر سے نیچے آ گیا اور دوسرے کمرے کی طرف بھاگا۔ اگرچہ اسے بڑے زور کا چکر آ رہا تھا اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ گر پڑے گا، لیکن کوئی اندرونی طاقت اسے سہارا دے رہی تھی۔ وہ تیزی سے دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔

چند لمحوں کے اندر اندر اس کی دھندلائی ہوئی آنکھیں ایک ناقابل یقین اور بھیانک منظر دیکھ رہی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صفدر علی کے ہاتھ میں ایک لمبی سی چھری تھی۔ جس سے وہ ابا پر وار کر رہا تھا۔ ایک یا دو وار وہ کر چکا تھا اور ابا کے پیٹ سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔

فرید کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ اس نے تیزی سے کمرے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔

فرید کو اپنے بستر سے اٹھ کر کمرے کی طرف بھاگتے دیکھ کر اماں اور آپا بھی تیزی سے اس کمرے کی طرف دوڑ پڑی تھیں۔ فرید کے دھندلاتے ہوئے ذہن میں یہ دھندلا دھندلا سا خیال ابھر رہا تھا کہ اماں اور آپا ابا کو صفدر علی کے ہاتھوں سے بچانے کے لیے ان کی طرف دوڑ رہی ہیں، لیکن اس وقت اس کا دماغ جیسے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا جب ان دونوں نے ابا کی طرف جانے کے بجائے فرید کو پکڑ لیا۔ آپا نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ سختی کے ساتھ بند کر لیا تاکہ وہ کوئی آواز نہ نکال سکے اور اماں نے اس کو خوب کس کے کمر سے پکڑ لیا۔ فرید نے جدوجہد کر کے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی، لیکن اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور اس کا جسم اس کے قابو میں نہیں تھا۔ وہ چیخنا چاہتا تھا لیکن آپا نے اس کا منہ دبا رکھا تھا۔ وہ بھاگ کر ابا کی مدد کے لیے جانا چاہتا تھا، لیکن اماں نے اس کو کمر سے پکڑ رکھا تھا اور آپا نے اس کی گردن دبا رکھی تھی۔

فرید کی نظروں کے سامنے صفدر علی نے ابا کے پیٹ پر چھری کا آخری وار کیا اور وہ دل کے قریب پسلیوں کے نیچے سے شروع ہو کر نیچے ہی نیچے شگاف بناتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ابا فرش پر گر پڑے۔ صفدر علی ابا کو چھوڑ کر تیزی سے فرید کی طرف لپکا اور اس نے فرید کے منہ سے آپا کا ہاتھ ہٹا کر اسے کوئی چیز سنگھا دی۔ بھیگے ہوئے رومال سے نکلنے والی تیز اور ناگوار بو جو فرید کے دماغ میں اترتی چلی گئی اور پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو گھر کی بالائی منزل والے اکلوتے کمرے میں بستر پر پڑے ہوئے پایا۔ یہ کمرہ زیادہ تر خالی پڑا رہتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی یہاں دوپہر کو یا شام کو آ جایا کرتا تھا۔

فرید کے کانوں میں رونے کی ہلکی ہلکی آوازیں آئیں۔ فوری طور پر اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو چکا ہے یا کیا ہو رہا ہے، لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کی یادداشت بحال ہونے لگی اور پھر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ بڑی بھیانک باتیں تھیں جو اسے یاد آ گئیں۔

اس کی آنکھوں کے سامنے صفدر علی نے ابا کو چھریاں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

وہ تیزی سے اٹھا اور گرتا پڑتا نیچے بھاگا۔ گھر میں بہت ساری عورتیں موجود تھیں۔

اماں اور آپا رو رہی تھیں۔ فرید کو دیکھتے ہی اماں لپک کر اس سے لپٹ گئیں اور بین کرنے لگیں۔ ''ارے صفدر علی نے تمہارے باپ کو مار ڈالا۔ ارے دونوں میں جھگڑا ہو گیا تھا پیسوں پر۔۔۔۔''

فرید کا دماغ اس قدر پریشان اور الجھا ہوا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا سمجھے، کیا کہے اور کیا کرے..... اماں ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں۔ صفدر علی نے اس کے باپ کا خون کر دیا تھا، لیکن..... لیکن..... پیسوں پر جھگڑا؟ نہیں تو جھگڑا تو کوئی نہیں ہوا تھا۔ صفدر علی تو ابا کو دوسرے کمرے میں بلا رہا تھا اور ابا چلے گئے تھے۔ پھر ان کی چیخ بلند ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر بھاگا تھا، مگر اماں اور آپا نے اسے روک لیا تھا۔ کسی نے ابا کی مدد نہیں کی تھی اور وہ اوپر کیسے پہنچ گیا تھا؟ وہ تو یہاں نیچے موجود تھا، برابر والے کمرے میں.....؟ ہاں..... صفدر علی نے اسے کچھ سنگھایا تھا۔

فرید کے سوئے سوئے، بوجھل اور نیم بیدار دماغ کو اس ساری صورت حال کے سمجھنے میں تھوڑا سا وقت لگا، لیکن جلدی ہی وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ ساری بات مکمل طور پر اس کی سمجھ میں آ گئی۔

ان سب لوگوں نے مل کر ابا کو مار دیا تھا۔ اماں نے، آپا نے اور صفدر علی نے۔

کتنے دنوں سے تو آپا نے اس سے سیدھے منہ بات کرنا ہی چھوڑ دیا تھا، کیونکہ اس نے صفدر علی اور اس کے بیٹے منور علی کے متعلق اپنی ناپسندیدگی کو کبھی نہیں چھپایا تھا اور اس معاملے میں وہ ابا کے ساتھ تھا۔ اس نے کئی بار علیحدگی میں آپا سے کھل کر کہا تھا کہ اسے منور علی بالکل اچھا نہیں لگتا اور آپا نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا اور اس دن کے بعد سے جبکہ اماں اور ابا کے جھگڑے میں اس نے کھل کر ابا کی حمایت کی تھی۔ آپا اور اماں دونوں ہی اس سے بگڑی ہوئی رہتی تھیں۔ مگر آج..... آج تو آپا نے بڑے پیار کے ساتھ اسے لڈو کھانے کو دیا تھا۔ جسے کھانے کے بعد اسے فوراً ہی نیند آنے لگی تھی۔

فرید کو اب یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی کہ اس لڈو میں نیند کی دوا ملی ہوئی تھی۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ کسی کو سلانے یا بے ہوش کرنے کے لیے کھانے پینے کی چیزوں میں کچھ ملا کر دے دیتے ہیں..... لیکن دوا اس پر پورے طور سے اثر نہیں کر سکی تھی۔ وہ وقت سے پہلے ہی بیدار ہو گیا تھا اور پھر..... باقی کام صفدر علی نے پورا کر دیا۔ وہ پوری تیاری سے آیا تھا۔ اس کے پاس بے ہوش کرنے والی دوا پہلے سے موجود تھی۔ ان لوگوں کو اگر کوئی خطرہ تھا تو اسی سے تھا۔ اس لیے انہوں نے اسے بے ہوش کر کے اوپر پہنچا دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرید غیظ وغضب اور صدمے سے بے حال ہوگیا۔ اف..... اماں اور آپا دونوں نے مل کر کس طرح اسے بے بس کر دیا تھا۔ اسے ابا تک پہنچنے ہی نہیں دیا تھا۔ وہ ابا کی کوئی مدد نہیں کر سکا تھا۔

وہ زار و قطار رو رہا تھا اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ صفدر علی نے جان بوجھ کر ابا کو قتل کیا تھا۔ ان دونوں کا کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا، لیکن اس کی بات پر کوئی بھی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ کیونکہ اس کی ماں اور بہن کے کہنے کے مطابق جب صفدر علی اور حمید الحسن میں لڑائی ہوئی تھی اس وقت فرید وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ وہ تو اوپر والے کمرے میں سو رہا تھا۔ جب پولیس گھر میں آئی تو اس وقت بھی فرید اوپر والے کمرے میں سو رہا تھا۔

اماں اور آپا نے پولیس کو یہ بیان دیا کہ صفدر علی اپنا قرضہ مانگنے حمید الحسن کے پاس آیا تھا اور اس بات پر دونوں میں تکرار ہوگئی۔ حمید الحسن نے صفدر علی کو گالیاں دیں اور باورچی خانے میں استعمال ہونے والی ایک لمبی چھری سے، جو قریب ہی رکھی ہوئی تھی صفدر علی پر حملہ کر دیا۔ صفدر علی نے خود کو بچاتے ہوئے چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی اور حمید الحسن پر حملہ کر دیا۔ خود قاتل صفدر علی کا بھی یہی بیان تھا۔ ان تینوں کے بیانات میں مکمل یکسانیت تھی۔

فرید کا دل کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ابا نے کبھی صفدر علی سے کوئی رقم ادھار نہیں لی تھی۔ وہ تو صفدر علی سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ بھلا اس سے قرض کیوں لیتے؟

فرید کے دل کے لیے یہ صدمہ اس قدر ناقابل برداشت تھا کہ اس نے اس کے سارے وجود کو جیسے ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ وہ کچھ ہوگیا تھا جس کا اس نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ دنیا میں اس سے سب سے زیادہ محبت کرنے والی ہستی کو اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا گیا تھا اور اس قتل میں اس کی ماں اور بہن بھی شریک تھیں۔

غم و غصے کے ساتھ ساتھ اس کے سینے میں نفرت کا ایک بہت گہرا طوفان بھی امڈ رہا تھا۔ نفرت کے اس پُرشور طوفان کی زد میں سب سے پہلے تو صفدر علی تھا..... پھر اماں اور آپا تھیں۔

اس نے پولیس والوں کو بھی یہ بتانے کی کوشش کی کہ ابا کا صفدر علی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا اور صفدر علی نے جان بوجھ کر ابا کو قتل کیا تھا، لیکن اس کی باتوں کو ایک خوفزدہ نوعمر لڑکے کی غم آلود اور منتشر ذہنی کیفیت قرار دے کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اپنے باپ کے قتل کے وقت تو وہ موقع پر موجود ہی نہیں تھا۔ وہ تو اوپر کمرے میں سو رہا تھا۔

فرید اپنی بات پر زیادہ اصرار بھی نہیں کر سکا اور اسے خاموشی اختیار کرنی پڑی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کے سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ اس کے بجائے اس آگ کی تپش میں بے انتہا اضافہ ہوگیا تھا اور ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا رواں رواں اس آگ میں جل رہا تھا۔

وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتا تھا۔ گھر اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا اور گھر میں موجود دونوں افراد اسے خوفناک بھوتوں کی طرح لگتے تھے۔

''اماں..... تم یہ نہ سمجھنا کہ میں اس کتے صفدر علی کو چھوڑ دوں گا۔'' چند روز کے بعد ایک دن اس نے اپنے وجود میں موجود ساری نفرت کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر اماں کو گھورتے ہوئے کہا۔ آپا بھی اماں کے پاس ہی موجود تھیں۔ ''میں ابھی چھوٹا ہوں، لیکن جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو صفدر علی کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔ اس نے میری آنکھوں کے سامنے ابا کو بلاوجہ قتل کیا ہے۔ اگر وہ عدالت سے بچ گیا تو میں خود اس کو جان سے مار دوں گا۔''

''چپ رہ سور کی اولاد۔'' اماں نے دانت پیس کر کہا۔ ''تیری تو میں جان نکال لوں گی۔ دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے، دفعان ہو جا، نکل جا گھر سے، ہم لوگ تیری منحوس صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ بڑا آیا اپنے ابا کا چہیتا۔''

''ہاں ہاں میں چلا جاؤں گا۔'' فرید نے خونی نظروں سے اماں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''چلا جاؤں گا، میں نہیں رہنا چاہتا تم لوگوں کے ساتھ مگر تم بتا دینا صفدر علی کو..... میں اسے کتے کی موت ماروں گا۔''

اس کے ساتھ ہی وہ گھر سے نکل گیا۔ کسی نے اس کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ گھر سے نکل کر وہ سیدھا قبرستان پہنچا اور ابا کی قبر کے پاس بیٹھ کر زار و قطار رونے لگا۔ اس کے چاروں طرف قبریں ہی قبریں تھیں اور قبرستان دوپہر کے سناٹے سے بھرا ہوا تھا۔ زمین پر خشک پتوں کا فرش بچھا ہوا تھا جو تیز ہوا کے جھونکوں سے گہرے سناٹے میں ایک پُراسرار سرسراہٹ پیدا کرتے ہوئے ادھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ آس پاس کے درختوں کی شاخوں میں سے ہوا بڑے غم ناک انداز میں آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ دو کوے ابا کی قبر کے قریب والے درخت پر کائیں کائیں کر رہے تھے۔ گویا وہ ابا کی موت پر نوحہ کناں ہوں..... فرید قبرستان میں بالکل اکیلا تھا۔ قبروں کے نیچے نہ جانے کتنے مُردے سوئے ہوئے تھے اور انہی مُردوں میں سے ایک ابا بھی تھے۔ جو چند روز پہلے تک مکمل طور پر زندہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سلامت تھے اور کوئی ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ یوں قبر میں جا اتریں گے اور مُردوں میں شامل ہو جائیں گے۔

فرید کے دماغ کے پردے پر بار بار ایک تصویر ابھر رہی تھی۔ یہ ابا کی تصویر تھی۔ جس پر شدید حیرت اور خوف کے آثار تھے۔ ان کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر قاتل کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے جو ان پر چھری سے وار کر رہا تھا۔

''ابا..... ابا.....'' اس نے قبر کے سرہانے پر اپنا سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''ہائے..... تمہیں کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی ابا..... ہائے ابا..... اس نے تمہارے پیٹ کو کاٹ ڈالا..... اس نے تمہیں مار ڈالا ابا.....'' روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ہوا کے غمناک جھونکے، کوؤں کی کائیں کائیں۔ مردہ پتوں کی سرسراہٹ اور قبرستان کی پُراسرار خاموشی..... یہ ساری چیزیں جیسے اس کے دکھ کا ایک حصہ بن گئی تھیں۔

ذرا دیر کے بعد وہ اٹھا اور بوجھل قدموں سے ایک طرف چل پڑا

☆======☆======☆

صفدر علی کو موقع واردات سے ہی گرفتار کر لیا گیا تھا اور اس نے کوئی مزاحمت بھی نہیں کی تھی۔ اس نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا کہ یہ قتل اس کے ہاتھوں ہوا ہے، لیکن یہ کہ یہ ایک اتفاقی قتل تھا جو اس سے اپنے بچاؤ کے لیے سرزد ہوا۔ اگر وہ جوابی کارروائی نہ کرتا تو حمید الحسن اسے قتل کر دیتا۔ کیونکہ اس نے ہی چھری سے اس پر حملہ کیا تھا۔ مقتول اس کا مقروض تھا اور قرضے کی واپسی کے بجائے لڑائی پر آمادہ ہو گیا تھا۔

مقتول کی بیوی اور بیٹی نے بھی قاتل کے بیان کی تصدیق کی تھی۔

صفدر علی کو تھانے پہنچا دیا گیا۔ اس کے خاندان والوں کو اس واقعے کی خبر مل گئی تھی۔ اس کا بیٹا منور علی اور بہنوئی بشیر الدین صبح کو تھانے پہنچ گئے اور انہوں نے صفدر علی سے ملاقات کی۔

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے بشیر بھائی۔'' صفدر علی نے اپنے بہنوئی سے کہا۔ ''اگر میں اس کو نہ روکتا تو وہ مجھے مار دیتا۔ تم کوئی اچھا سا ہوشیار وکیل تلاش کر لو۔''

''تم فکر مت کرو۔'' بشیر الدین نے کہا۔ ''سب بندوبست ہو جائے گا۔''

''اور خالہ شکوراں سے کہنا کہ وہ اب کہیں اور نہ جائے۔'' صفدر علی نے کہا۔ ''میری طرف سے اس سے کہنا کہ وہ اسی گھر میں رہے۔ آج نہیں، اس کی ضرورت پہلے سے بہت

زیادہ ہے۔''

چند روز کے بعد خالہ شکوراں خود بھی صفدر علی سے ملنے کے لیے تھانے آئی۔ اس نے صفدر علی کو یقین دلایا کہ وہ کسی دوسری جگہ نہیں جائے گی اور اسی کے گھر میں رہے گی۔

صفدر علی خاصا مطمئن تھا۔ اس نے اپنے بیٹے اور بہنوئی کو ساری ضروری ہدایات دے دی تھیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کس کس سے ملنا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد صفدر علی کے خلاف قتل کے مقدمے کی سماعت شروع ہو گئی۔ ملزم کی طرف سے یہ مؤقف اختیار کیا گیا تھا کہ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ اپنے دفاع میں کیا اور اس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔

صفدر علی کی طرف سے ساری تیاریاں مکمل تھیں۔ لائق وکیل کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ پولیس والوں کے ساتھ معاملات طے کر لے گئے تھے۔ وقوعہ کے صرف دو عینی گواہ تھے۔ دونوں کے بیانات صفدر علی کے مؤقف کی مکمل طور پر تائید کرتے تھے۔ مقتول کا بیٹا فرید تو ایسا غائب ہوا تھا کہ اس کا کہیں کوئی پتہ ہی نہیں چلا۔ پولیس نے فرید کے حوالے سے عدالت میں جو اطلاع فراہم کی وہ صرف یہی تھی کہ وقوعہ کے وقت فرید اوپر والے کمرے میں سو رہا تھا اور اس نے اپنی آنکھوں سے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ فرید سے منسوب کی جانے والی شہادت کی تصدیق یا تردید کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ کیونکہ فرید تو غائب ہو چکا تھا۔

عدالت میں صفدر علی پر مقدمہ چل رہا تھا اور ادھر خالہ شکوراں اس کے گھر کو پوری طرح سے سنبھالے ہوئے تھی۔ گھر کا سارا انتظام اب اس کے ہاتھوں میں تھا اور منور علی بھی اس پر پورا بھروسہ کرتا تھا۔ باپ تو جیل میں تھا۔ گھر کے مالی امور کی دیکھ بھال کی ذمہ داری منور علی پر ہی تھی۔

شوہر کے قتل ہو جانے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد صابرہ نے چکوال میں اپنا مکان اور زمینیں وغیرہ بیچ دیں۔

''میں اب اس شہر میں نہیں رہنا چاہتی جہاں میرے شوہر کو قتل کر دیا گیا ہو۔'' اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنی ایک پڑوسن سے کہا۔ ''اس شہر میں میرا سب کچھ لٹ گیا۔ میرا شوہر مجھ سے چھن گیا۔ میرا بیٹا غائب ہو گیا۔ مجھے اب اس شہر سے وحشت ہونے لگی ہے۔ میں یہاں سے چلی جانا چاہتی ہوں۔''

''لیکن فرض کرو دو چار مہینے میں ایک دو سال میں فرید واپس آ گیا تو پھر وہ تم لوگوں کو کہاں تلاش کرے گا؟'' پڑوسن نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اگر اس کے دل میں ہم لوگوں کو تلاش کرنے کی لگن ہوگی تو وہ ہمیں ضرور تلاش کر لے گا۔'' صابرہ نے کہا۔ ''ہم اس شہر سے جا رہے ہیں۔ دنیا سے تو نہیں جا رہے ہیں۔''

فی الحقیقت صابرہ کا ارادہ اپنا گھر اور زمینیں وغیرہ بیچنے کا بالکل نہیں تھا۔ وہ اتنی جلدی اپنی بیٹی کے ساتھ چکوال چھوڑ کر اپنے آپ کو مشتبہ نہیں بنانا چاہتی تھی۔

اس روز سہ پہر کو صفدر علی کی بہن حُسنہ اور اس کا شوہر بشیر الدین صابرہ کے گھر آئے۔

''اب کیا ارادے ہیں صابرہ؟'' بشیر الدین نے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد جن میں صفدر علی کے مقدمے کا بھی ذکر تھا۔ صابرہ سے پوچھا۔ ''تم نے آئندہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''سوچنا کیا ہے بھائی۔'' صابرہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔ ''جو قسمت میں لکھا ہے۔ وہی خود بخود سامنے آ جائے گا۔''

''تم تو گھر میں بیٹھنے والی عورت ہو اور تمہیں باہر کی دنیا کا زیادہ پتہ نہیں۔'' بشیر الدین نے کہا۔ ''کافی بدنامی ہوگئی ہے تم دونوں ماں بیٹیوں کی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ میں اپنی زبان سے کیا کہوں۔ تم خود سمجھدار عورت ہو۔ میرے خیال میں تو بہتر یہی ہے کہ تم دونوں چکوال سے چلی جاؤ۔''

''چکوال سے چلے جائیں؟'' صابرہ نے سخت حیرت کے ساتھ پوچھا۔ ''لیکن کہاں چلے جائیں؟ ہمارے پاس کوئی دوسری جگہ تو ہے نہیں..... اور چکوال میں تو ہمارا گھر ہے۔ زمینیں ہیں۔ سب کچھ ہے۔''

''سب کچھ بیچ دو صابرہ۔'' حُسنہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''عزت سے بڑی تو کوئی چیز نہیں ہے۔ چکوال میں رہ کر صرف بے عزت ہوتی رہو گی۔ سب کچھ بیچ کر یہاں سے چلی جاؤ..... خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ کہیں بھی دوسری جگہ ٹھکانہ کر لو..... اپنا اور اپنی بیٹی کا ساری دنیا کے سامنے تماشا مت بنواؤ۔ لوگ اندھے، بہرے اور گونگے نہیں ہوتے۔ تمہارے منہ پر کوئی کچھ نہ کہے، لیکن پیٹھ پیچھے سنو تو تمہیں معلوم ہو کہ کیا کیا کہا جا رہا ہے۔''

''لیکن..... اگر میں سب کچھ بیچنا بھی چاہوں تو یہ کیسے ممکن ہو سکے گا۔'' صابرہ نے لرزتے ہوئے کہا۔ ''میں گاہک کہاں سے لاؤں؟ اور پھر لکھا پڑھی..... قانونی کارروائی.....''

''اس سب کی فکر تم مت کرو۔'' بشیر الدین نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''پہلے تو تم یہ طے کرو کہ تم خود اس کام کے لیے تیار ہو یا نہیں۔ باقی میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ آخر

میں تمہارے بھائی کی طرح ہوں۔''

''منور علی میرے سگے بھائی کا بیٹا ہے۔'' حُسنہ بولی۔ ''اور میرے بھائی نے تمہارے گھر اس کا رشتہ دے رکھا ہے۔ تو ہم تو تمہارے اپنے ہی ہوئے۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں.....'' صابرہ نے جلدی سے کہا۔ ''خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں..... اس کے بارے میں سوچوں گی۔''

اگلی چند ملاقاتوں میں بشیر الدین اور اس کی بیوی حُسنہ نے صابرہ کو اس بات پر پوری طرح تیار کر لیا کہ وہ چکوال میں اپنی ساری جائیداد فروخت کر کے یہاں سے کہیں اور چلی جائے۔

''گاہک کی تلاش تو واقعی مشکل کام ہے۔'' بشیر الدین نے کہا۔ ''اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جائیداد کی وراثت میں تمہارا بیٹا بھی شامل ہے۔ جس کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ ویسے یہ کوئی اتنی خاص بات نہیں ہے کیونکہ وہ ابھی نابالغ ہے۔ مگر خریدار تو سو طرح کے نخرے کرتے ہیں۔ تو میں نے یہی سوچا ہے صابرہ بہن کہ تمہاری ساری جائیداد میں خود ہی خرید لوں۔ اب اس میں جو بھی قانونی پیچیدگیاں آئندہ چل کر نمودار ہوں گی۔ میں تمہاری خاطر انہیں خود ہی بھگت لوں گا اور قیمت میں تمہیں وہی دوں گا جو اصل قیمت ہوگی۔''

''مگر..... پھر ہم لوگ جائیں گے کہاں؟'' صابرہ نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

''نصیر پور میں میری کچھ زمینیں ہیں۔'' بشیر الدین نے کہا۔ ''ایک مکان بھی ہے۔ اچھی خاصی جائیداد ہے وہ میں سستے داموں تمہارے حوالے کر دوں گا۔ تم دونوں ماں بیٹی اطمینان اور آرام کے ساتھ وہاں رہو۔ پھر جب کل کو دردانہ کی شادی ہوگی تو انشاء اللہ تم لوگ ایک نئی زندگی شروع کرو گی۔ ہو سکتا ہے تمہارے بیٹے کا بھی کچھ پتہ چل جائے۔''

بشیر الدین نے صابرہ سے اس کی ساری جائیداد مع اس مکان کے جس میں وہ رہتی تھی۔ اصل قیمت سے بہت کم میں خرید لی اور اس کو یہ باور کرایا کہ وہ اس کی متنازع جائیداد کو خرید کر اس پر احسان کر رہا ہے۔

چکوال سے کچھ فاصلے پر واقع گاؤں نصیر پور میں بشیر الدین کا ایک پرانا مکان اور کچھ زمینیں موجود تھیں۔ جن کی دیکھ بھال کے لیے اسے بار بار نصیر پور آنا جانا پڑتا تھا۔ بہت عرصے سے اس کا خیال تھا کہ کوئی اچھا گاہک ملے تو اس جائیداد کو بیچ دے، لیکن اسے اس کی مرضی کے مطابق پیسے نہیں مل رہے تھے۔

بھلا صابرہ سے اچھا گاہک اور کون مل سکتا تھا؟ بشیر الدین نے اپنی نصیر پور کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائیداد خاصے مہنگے داموں صابرہ کے ہاتھوں فروخت کر دی۔ اس پورے سودے میں اس نے خاصا منافع کمایا اور مزید منافع اس نے اس وقت کمایا جب کچھ ہی عرصے کے بعد صابرہ کے مکان کو جو بسوں کے اڈے کے قریب واقع تھا۔ ایک ایسے شخص کے ہاتھوں کافی مہنگے داموں فروخت کر دیا جو اس جگہ پر ایک موٹر گیراج تعمیر کروانا چاہتا تھا۔ بشیر الدین نے اس جگہ کی تجارتی قیمت وصول کی۔

خالہ شکوراں کا حُسنہ اور بشیر الدین سے برابر رابطہ رہتا تھا۔ یہ لوگ پابندی سے صفدر علی کے گھر جاتے رہتے تھے اور وہاں کے سارے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ خود شکوراں بھی صفدر علی کی بہن اور بہنوئی کے گھر جاتی رہتی تھی۔ وہ اکثر صابرہ اور اس کی بیٹی سے بھی ملنے چلی جاتی تھی اور سارے حالات و واقعات پر گہری نظر رکھتی تھی۔ وہ اپنی زبان سے تو کچھ نہیں کہتی تھی، لیکن اصلی حالات سے بخوبی واقف رہتی تھی۔

صابرہ اپنی بیٹی کے ساتھ نصیر پور چلی گئی۔ یہاں اس گاؤں میں کوئی بھی اسے نہیں جانتا تھا، اور لوگ اس کے اور اس کی بیٹی کے پس منظر سے بالکل ناواقف تھے۔ اس نے یہاں کے لوگوں کو اپنے بارے میں یہی بتایا کہ وہ بیوہ ہے۔ اس کے شوہر کا کسی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ جس میں وہ مارا گیا اور اس کا اکلوتا بیٹا آوارہ ہو گیا اور گھر سے بھاگ گیا۔ مختصر سی داستان تھی۔ جس کی تفصیلات میں جانے سے وہ اور اس کی بیٹی دردانہ ہمیشہ گریز کرتی تھیں۔ بشیر الدین اور اس کی بیوی حُسنہ تو صابرہ کے ساتھ زمین جائیداد کے معاملات طے کر لینے کے بعد نصیر پور کا راستہ ہی بھول گئے۔ انہوں نے ان دونوں ماں بیٹیوں کو اب ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ البتہ منور علی ہر دوسرے تیسرے مہینے خالہ شکوراں کو ساتھ لے کر صابرہ کے گھر نصیر آباد آتا رہا۔ چونکہ شکوراں ساتھ ہوتی تھی اس لیے کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ صابرہ آنے والوں کو اپنا رشتے دار بتاتی تھی۔ وہاں نصیر پور میں کسی کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ صابرہ کے گھر آنے والا نوجوان اس شخص کا بیٹا ہے جس نے صابرہ کے شوہر کو قتل کیا ہے اور جس پر اس وقت مقدمہ چل رہا ہے۔ شکوراں بھی اس معاملے میں اپنی زبان سختی کے ساتھ بند رکھتی تھی۔

صفدر علی کے مقدمے کی سماعت تقریباً ایک سال تک جاری رہی۔ اس وکیل نے اپنا اور خود صفدر علی کا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے تیزی سے پیشاں لگوائیں اور اس مقدمے کا فیصلہ ہو گیا۔

عدالت نے وکیل صفائی کے اس مؤقف کو تسلیم کر لیا کہ صفدر علی نے یہ قتل جان بوجھ

کر نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس نے محض اپنے بچاؤ کی غرض سے حمید الحسن پر وار کیا تھا اور اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وار اتنا شدید ہو جائے گا کہ اس کے نتیجے میں حمید الحسن کی موت واقع ہو جائے گی۔ عدالت نے ملزم کو چار سال قید سخت کی سزا سنائی۔

صفدر علی کے دل کی مراد بر آئی۔ وہ یہی چاہتا تھا۔ کم و بیش اتنی ہی مدت کی سزا کو اس نے اپنے ذہن میں رکھا تھا۔ اس نے عدالت کے فیصلے کو قبول کر لیا اور اس کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی۔ استغاثہ کی طرف سے بھی اس فیصلے کے خلاف کوئی اپیل دائر نہیں کی گئی۔

معاملہ اب ختم ہو چکا تھا۔ ڈرنے، محتاط رہنے اور گھبرانے کی اب کوئی ضرورت نہیں تھی۔ عدالت صفدر علی کو سزا سنا چکی تھی اور اب اس پر دوسری بار مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ وہ اب پوری طرح محفوظ تھا۔ بس کچھ عرصہ جیل میں گزارنا تھا۔

جب تک مقدمہ زیر سماعت رہا تب تک صابرہ یا دردانہ کبھی صفدر علی سے ملنے کے لیے جیل نہیں گئیں۔ وہ تو مقتول کی بیوی اور بیٹی تھیں..... بھلا قاتل سے ملاقات کے لیے کس طرح جا سکتی تھیں۔ البتہ خالہ شکوراں اکثر منور علی کے ساتھ صفدر علی سے ملاقات کے لیے جیل جایا کرتی تھی۔

لیکن اب یہ سارا واقعہ ختم ہو گیا تھا۔ اب دونوں ماں بیٹیاں صفدر علی سے ملاقات کے لیے جیل جا سکتی تھیں..... اور انہوں نے یہ سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

☆======☆======☆

سزا تو صفدر علی کو چار سال کی ہوئی تھی، لیکن اس کا ارادہ جیل میں چار سال کی مدت گزارنے کا قطعی نہیں تھا۔ معافیاں ملا کر چار سال میں کمی تو ویسے بھی ہو جاتی تھی، لیکن صفدر علی نے ان طریقوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لی تھی جن پر عمل کر کے معافیوں کی تعداد کو حیرت انگیز اور ناقابل یقین حد تک بڑھایا جا سکتا تھا۔ وہ ایسے تمام طریقوں کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھا۔

سزا کی مدت شروع ہو گئی اور بڑی تیزی کے ساتھ کم ہونے لگی۔

جیل میں اس سے ملنے کے لیے آنے والوں کی تعداد میں اب مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا بیٹا منور علی اور خالہ شکوراں تو بڑی پابندی سے اس سے ملنے آتے تھے اور بہن بہنوئی بھی کبھی کبھار چکر لگا لیتے تھے۔ اب صابرہ اور دردانہ نے بھی آنا شروع کر دیا تھا۔ دونوں اکیلی بھی آتی تھیں اور جب بھی آتیں صفدر علی کے لیے کھانے پینے کی خاصی چیزیں اپنے ساتھ لے کر آتی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت ایسا ہوا کے جھونکے کی طرح سرسراتا ہوا گزر گیا کہ کسی کو احساس بھی نہیں ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو سال گزر گئے اور صفدر علی کی رہائی کا وقت آ گیا۔ اس نے جیل میں رہتے ہوئے اتنی بہت سی معافیاں خرید لی تھیں کہ اس کی چار سال کی سزا کا عرصہ سمٹ کر صرف دو سالہ رہ گیا تھا۔ یہ عرصہ بڑی آسانی سے گزر گیا اور صفدر علی رہا ہو گیا۔

اس تمام عرصے کے دوران فرید کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ صفدر علی اکثر صابرہ اور دردانہ سے فرید کے بارے میں پوچھا کرتا تھا۔ فرید ایک کانٹا تھا جو اس کے دل میں کھٹکتا رہتا تھا، لیکن ان دونوں کو فرید کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

صفدر علی رہا ہو کر گھر واپس آ گیا۔

اس کے ساتھ ہی تمام تحفظات، خدشات اور احتیاطوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ اب وہ سب مکمل طور پر آزاد اور بے خوف تھے۔ وہ اپنی ساری اندھی جذباتی ضرورتوں کی بلا روک ٹوک تکمیل کر سکتے تھے۔

صفدر علی نے بھی اپنی رہائش تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ لوگ اب جو کچھ کرنے جا رہے تھے۔ وہ چکوال میں کرنا مناسب نہیں تھا۔ آخر زبان خلق کو بھی تو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

صفدر علی نے چکوال میں اپنی زمینوں اور جائیداد کو جوں کا توں رہنے دیا اور نصیر پور میں ایک مکان خرید کر اپنے بیٹے اور خالہ شکوراں کے ساتھ وہاں منتقل ہو گیا۔ نصیر پور میں بیٹھ کر اگرچہ چکوال میں اپنی زمینوں اور جائیداد کے کام کو پوری طرح سنبھالنا ایک دشوار امر تھا، لیکن صفدر علی کو ایک یہ سہولت حاصل تھی کہ اس کا بہنوئی بشیر الدین چکوال میں موجود تھا اور وہ اس کی مدد کر سکتا تھا۔ صفدر علی اور اس کے بیٹے کو ہر وقت چکوال میں موجود رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

خالہ شکوراں اب اس خاندان کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ زینت کی زندگی میں ہی جس دن سے اس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ پھر اور کہیں نہیں گئی تھی۔ اگرچہ کئی گھروں سے اسے گاہے گاہے پیشکشیں ہوئی تھیں کہ وہ آ کر ان کے ساتھ رہے، لیکن وہ اب بار بار در بدر نہیں ہونا چاہتی تھی۔ یہ ایک ایسا گھرانہ تھا جہاں اسے مکمل تحفظ کے ساتھ اختیار بھی حاصل تھا اور اس بات کے دور دور تک کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے کہ کوئی اس کو یہاں سے نکال دے گا۔ وہ تو اس خاندان کے لیے ناگزیر بن گئی تھی۔

صفدر علی کے خاندان کی نصیر پور منتقلی کے فوراً ہی بعد منور علی اور دردانہ کی باقاعدہ منگنی

کا اعلان کر دیا گیا اور اس کے صرف ایک ماہ کے بعد ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

صفدر علی کے گھر میں شادی کے سارے انتظامات خالہ شکوراں نے کیے تھے۔ وہ اس گھر میں واحد عورت تھی جس پر شادی کے کاموں کی ساری ذمہ داری آن پڑی تھی۔ صفدر علی کی بہن حُسنہ ایک تو یہاں سے کافی دور رہتی تھی۔ دوسرے اس نے اس شادی وغیرہ میں کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا اور اس کی ایک خاص وجہ بھی تھی۔

بہت عرصہ پہلے حُسنہ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ حمید الحسن اور صابرہ کی بیٹی دردانہ کو اپنے بیٹے خیر الدین کے لئے مانگ لے۔

دردانہ خوبصورت تھی۔ اسکول جاتی تھی۔ پڑھ رہی تھی۔ ایک خوشحال اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ خاندان بھی بہت لمبا چوڑا نہیں تھا۔ بس لے دے کے ایک بھائی تھا۔ اس کا مطلب تھا والدین کی جائیداد میں زیادہ حصہ..... جتنے زیادہ بھائی بہن ہوں گے۔ اتنا ہی حصہ کم ہوتا چلا جائے گا۔

لیکن قبل اس کے کہ وہ دردانہ کے ساتھ اپنے بیٹے خیر الدین کے رشتے کی بات چلاتی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے بھائی صفدر علی نے اپنے بیٹے منور علی کا رشتہ وہاں دے دیا ہے اور یہ کہ منور اور دردانہ ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔

حُسنہ نے اپنے بڑھتے ہوئے قدموں کو فوراً وہیں روک لیا۔ وہ ایک سمجھدار اور ہوشیار عورت تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے کوئی مسئلہ پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ لڑکی کی شادی اگر اس کی مرضی کے خلاف زبردستی کسی دوسرے شخص کے ساتھ کر دی جائے تو دونوں ہی کی زندگیاں ان کے لیے عذاب بن جاتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ کبھی بھی خوش نہیں رہتے۔ چنانچہ وہ خاموشی کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔ بعد میں اسے یہ جان کر خاصا اطمینان ہوا کہ حمید الحسن نے اپنی بیٹی کے لیے منور علی کے پیغام کو سختی اور حقارت کے ساتھ مسترد کر دیا تھا۔

اب سے کچھ ہی عرصہ پہلے حُسنہ کے بیٹے خیر الدین نے چکوال میں ایک چھوٹا سا موٹر گیراج کھول لیا تھا۔ خیر الدین نے میٹرک پاس کیا تھا اور اس نے موٹر گاڑیوں کا کام بھی سیکھا تھا۔ اپنے اس ہنر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے چکوال میں ہی چھوٹا سا کام شروع کر دیا تھا جو پیسہ کمانے سے زیادہ اس کے شوق کی تکمیل کا سامان کرتا تھا۔ حُسنہ نے اس کے لیے کئی لڑکیاں دیکھیں۔ وہ اب اس کی شادی کر دینا چاہتی تھی لیکن خیر الدین ابھی شادی وغیرہ کے جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ وہ آزاد رہنا چاہتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منور علی اور دردانہ کی شادی ہوگئی اور اس کے کچھ دنوں کے بعد منور علی گوجرانوالہ چلا گیا۔ ایک زمانے سے اس کے دل میں یہ خواہش موجزن رہی تھی کہ وہ اپنا ایک موٹر گیراج قائم کرے، لیکن باپ کے سزایاب ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنے اس خواب کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا..... اب جبکہ باپ رہا ہو کر گھر آ گیا اور منور علی کی شادی بھی اس کی پسند کی لڑکی سے ہوگئی تو وہ سنجیدگی کے ساتھ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس نے اپنے کام کے لئے گوجرانوالہ کا انتخاب کیا تھا۔ جو ایک خاصا بڑا صنعتی مرکز تھا۔ یہاں اس کا کاروبار اچھا چل سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے شادی کے فوراً ہی بعد گوجرانوالہ میں ایک موٹر گیراج قائم کر لیا۔ اس نے اچھے اور ہوشیار کاریگروں کو ملازم رکھا اور اس کا کام خوب چل نکلا۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے گوجرانوالہ میں ایک مکان خرید لیا اور دردانہ کو بھی وہیں بلا لیا۔

اس طرح صفدر علی کا خاندان تقسیم ہو گیا۔ بیٹا اور بہو گوجرانوالہ میں جا بسے اور صفدر علی خالہ شکوراں کے ساتھ نصیر پور میں اکیلا رہ گیا۔

لیکن صفدر علی اکیلا نہیں تھا۔ خالہ شکوراں ایک مہربان اور نگراں خاتون کی حیثیت سے اس گھر میں موجود تھی۔ اس گھر کے افراد میں اب ایک اہم اضافہ بھی ہونے والا تھا۔ اس نے اور صابرہ نے نکاح کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ان کا یہ فیصلہ شاید برسوں پرانا تھا مگر اس کو عملی صورت دینے کا وقت نہیں آیا تھا اور اب یہ وقت آ گیا تھا۔ صفدر علی اور صابرہ کے نکاح کی تقریب بڑی سادگی کے ساتھ انجام پائی۔ بس گنے چنے لوگوں نے اس میں شرکت کی جن میں صفدر علی کے بہن بہنوئی، بیٹا، بہو اور خالہ شکوراں وغیرہ شامل تھے۔ دونوں کی ڈھلتی عمر تھی۔ دونوں کی جوان جوان اولادیں تھیں۔ اس لیے اس نکاح کی تقریب اگرچہ خفیہ تو نہیں تھی تاہم بالکل سادہ تھی اور اس میں گاؤں کے بس دو ایک گنے چنے لوگوں کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔

صابرہ اور صفدر علی نے اپنی نئی ازدواجی زندگی کا آغاز کر دیا۔ ان دونوں میں سے کسی کے دل میں بھی اس شخص کے لیے درد کی کوئی ہلکی سی لہر بھی نہیں اٹھی جو یہاں سے بہت دور چکوال کے ایک قبرستان میں منوں مٹی کے نیچے سو رہا تھا اور نہ اس بچے کی یاد آئی جو اپنے ننھے سے زخم خوردہ دل کے ساتھ اس دکھ بھری دنیا کے پیچ و خم میں نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ وہ دونوں خوش تھے کہ انہوں نے وہ سب کچھ پا لیا تھا۔ جس کی شدید خواہش نے انہیں برسوں سے بے چین کر رکھا تھا۔

خالہ شکوراں اس خاندان کی ایک لازمی رکن اور ان دونوں میاں بیوی کی زندگی کا ایک ناگزیر حصہ بن چکی تھی۔ نہ تو وہ لوگ اس کو اپنے سے الگ کرنے کا سوچ سکتے تھے اور نہ ہی شکوراں کہیں اور جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ صابرہ اور صفدر علی دونوں نے ہی اس سے کہہ دیا تھا کہ اب وہ مرتے دم تک ان لوگوں کے ہی ساتھ رہے گی۔

اولاد کی خواہش نہ تو صابرہ کو تھی اور نہ ہی صفدر علی کو اور انہیں شاید اس کی توقع بھی نہیں تھی، لیکن اس وقت صابرہ کو سخت حیرت اور ساتھ ہی خوشی بھی ہوئی جب اس پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اتنے عرصے کے بعد.....؟ فرید کی پیدائش کے بعد سے پھر تو اس کے کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی تھی اور اس کو یقین تھا کہ وہ اب ماں بننے کی حدود پھلانگ چکی ہے لیکن اس انکشاف نے اسے ایک نئی مسرت سے سرشار کر دیا۔

وہ ایک بار پھر ماں بننے جا رہی تھی۔ ایک ایسے شخص کے بچے ماں جس نے اس کے شوہر کو قتل کیا تھا، لیکن اس بات کو یاد رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟

''خدا کرے بیٹا ہو۔'' صفدر علی نے خوشی سے بوجھل آواز میں صابرہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میرا اور تمہارا بیٹا..... کس قدر خوشی کی بات ہوگی۔ میں تو سارے گاؤں میں مٹھائی بانٹوں گا۔''

''اور میرے لیے بھی اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہوگی کہ مجھے بیٹا مل جائے، تمہارا بیٹا۔'' صابرہ نے نشیلی آنکھوں سے صفدر علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

قدرت نے ان دونوں کی یہ خواہش پوری کر دی اور صابرہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔

دونوں میاں بیوی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ بیٹا پیدا ہونے کی جو خوشی تھی وہ تو اپنی جگہ پر تھی ہی اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی انتہائی خوشی تھی کہ دونوں نے ساری دنیا کو یہ دکھا دیا تھا کہ انہوں نے اس ڈھلتی عمر میں شادی کر کے کسی حماقت کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ اب بھی اتنی توانائی کے حامل تھے کہ والدین بن سکتے تھے۔ گاؤں کے سارے لوگ ان کی اس خوشی میں شریک تھے اور سب سے مبارکبادیں وصول کرنے والوں میں خالہ شکوراں بھی پیش پیش تھی۔ شکوراں کو اب نیا مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔ ایک نوزائیدہ بچے کی پرورش کرنے سے زیادہ پُرمسرت کام اس کے لیے بھلا اور کیا ہو سکتا تھا؟ وہ تو اس ننھی سی جان کے صدقے قربان ہوتی رہتی تھی۔

لیکن ایک ہستی ایسی بھی تھی جس نے صابرہ کے ماں بننے کو ذرا بھی پسند نہیں کیا اور وہ تھی صابرہ کی اپنی بیٹی دردانہ، جس کے ابھی تک کوئی اولاد نہیں تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اماں اور چاچا کو بڑھاپے میں یہ تماشا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس نے بڑی ناگواری کے ساتھ اپنے شوہر سے کہا۔ ''نکاح کرلیا، بہت اچھا کیا، دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی، لیکن بچے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ارے؟'' منور علی نے شوخی کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔ ''اگر بچہ ہوگیا تو وہ کیا کرتے؟ کیا اسے آنے سے روک لیتے؟''

''روک بھی سکتے تھے۔'' دردانہ نے کہا۔ ''آج کل تو بہت آسان ہے۔ انہیں عقل سے کام لینا چاہئے تھا۔''

''لیکن اگر بچہ ہوگیا تو اس میں ہرج کیا ہے میری جان؟'' منور نے دردانہ کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں بھی تو اس مرحلے سے گزرنا ہوگا۔''

''ہرج ہے۔'' دردانہ نے درشتی سے کہا۔ ''ہرج ہے، بہت ہرج ہے۔ یہ دیکھو کہ میں اپنی ماں کی ساری جائیداد کی واحد وارث ہوں۔ فرید کا کیا معلوم زندہ ہے یا مرگیا۔ کیا پتہ کہیں مرکھپ گیا ہو..... اور تم چاچا کی ساری جائیداد کے اکلوتے وارث ہو، لیکن اب اگر ان دونوں کے اولاد پیدا ہوگی اور وہ بھی بیٹا تو ہمارا حصہ تو کم ہوتا جائے گا..... حصے دار جتنے بڑھیں گے حصوں کی مالیت اتنی ہی کم ہوتی جائے گی۔''

''چھوڑو دردانہ۔'' اچانک منور بہت سنجیدہ ہوگیا اور ساتھ ہی قدرے افسردہ بھی۔ ''جو جس کی قسمت کا ہوتا ہے۔ وہ اسے مل جاتا ہے۔ آدمی دنیا میں اپنی قسمت کا رزق ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔''

''اسی لیے تو..... اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ ان دونوں کے آنگن میں اب مزید لوگ نہیں آنے چاہئیں۔ ان کی وجہ سے ہمارا رزق گھٹ جائے گا۔ میں تو دعا کرتی ہوں کہ ان لوگوں کے اب کوئی اور اولاد نہ ہو۔''

لیکن خدا نے دردانہ کی دعا کو قبولیت کا شرف نہیں بخشا۔ صفدر علی اور صابرہ کا بیٹا اکبر علی ابھی صرف چھ ماہ کا ہی تھا کہ صابرہ ایک بار پھر امید سے ہوگئی۔

دردانہ کو یہ خبر ملی تو وہ سخت غصے اور جھلاہٹ کا شکار ہوگئی۔ کیا یہ لوگ پاگل ہوگئے ہیں؟ آخر انہیں کیا خدا کی مار تھی بچے پر بچہ پیدا کرنے کی؟ اس عمر میں تو ان کی گود میں پوتے ہونے چاہئے تھے۔

لیکن دردانہ کے لیے خوشی اور تسکین کا ایک اور پہلو بھی موجود تھا۔ اس بار وہ خود بھی امید سے تھی۔ شادی کے بعد اس کے گھر پہلا بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ وہ اور منور علی دونوں

بہت خوش تھے۔

سبقت اس بار بھی ماں کو ہی حاصل ہوئی۔ صابرہ کے ہاں ولادت پہلے ہوئی اور اس بار بھی اس نے ایک بیٹے کو ہی جنم دیا۔ دونوں میاں بیوی جیسے آسمانوں میں پرواز کررہے تھے۔ دو دو بیٹے اور وہ بھی اس عمر میں..... شاید قدرت کچھ زیادہ ہی معجزے دکھا رہی تھی۔ نومولود کا نام حیدر علی رکھا گیا۔

خوش تو خالہ شکوراں بھی بہت تھی، لیکن وہ اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی سوچ رہی تھی۔ ہر چند کہ صابرہ اور صفدر علی ابھی ایسے بوڑھے نہیں ہوگئے تھے لیکن بہرحال وہ جوان بھی نہیں تھے۔ یہ ان کی ڈھلتی ہوئی عمر تھی اور اس عمر میں اولاد دوں کا پیدا ہونا، خود ان اولادوں کے حق میں بہتر نہیں تھا۔ زندگی کا کیا بھروسہ..... جب تک یہ اولادیں بڑی ہوں گی تب تک خدا جانے کیا کچھ ہو چکا ہوگا۔ پھر کون ان کی پرورش کرے گا؟ ان کی تعلیم و تربیت کا کیا ہوگا؟ کیا دردانہ جوان دونوں بیٹوں کی سوتیلی بہن ہے ان کو اپنائے گی؟ کیا دردانہ کا شوہر منور علی جوان دونوں بیٹوں کا سوتیلا بھائی ہے۔ ان کے سر پر دستِ شفقت رکھے گا؟

دوسرے لوگ خواہ ان باتوں کے بارے میں سوچتے ہوں یا نہ سوچتے ہوں۔ مگر شکوراں ضرور سوچتی تھی۔ اس نے بہت سارے گھرانوں میں رہ کر وہاں پیش آنے والے طرح طرح کے واقعات سے پوری گہرائی کے ساتھ واقف ہو کر زندگی کے بارے میں بہت سارے تجربات و مشاہدات کا ایک قیمتی ذخیرہ اکٹھا کرلیا تھا۔

صابرہ کے ہاں بیٹے کی پیدائش کے کوئی مہینہ بھر کے بعد دردانہ نے بھی ایک بیٹے کو جنم دیا اور وہ دن منور علی اور دردانہ کی زندگی کا ایک بڑا یادگار دن تھا جب قدرت نے ان کو ایک جیتا جاگتا کھلونا عطا کردیا۔

منور علی اور دردانہ گوجرانوالہ میں ہی رہ رہے تھے اور منور علی کا گیراج بہت اچھا چل رہا تھا۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے بھی کام کرتا تھا اور کافی اچھا کاریگر بن گیا تھا۔ ویسے زیادہ تر کام ہوشیار کاریگر ہی کرتے تھے، جنہیں اس نے ملازم رکھا ہوا تھا۔

منور علی اور دردانہ نے اپنے بیٹے فرخ کا عقیقہ بڑی دھوم دھام سے کیا۔ یہ ان کی پہلی اولاد تھی اور وہ بھی بیٹا..... انہیں خوشی منانے کا حق تھا اور وہ اس حق کو پوری طرح سے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

عقیقے کا اہتمام گوجرانوالہ میں ہی کیا گیا تھا۔ جہاں دونوں میاں بیوی رہتے تھے۔ یہ ان کے گھر کی پہلی تقریب تھی اور اس میں دونوں کے قریبی رشتے داروں نے شرکت کی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو دوسری جگہوں سے آئے تھے۔ صفدر علی اور صابرہ، اور ان دونوں کے ساتھ شکوراں گاؤں نصیر پور سے گوجرانوالہ آئے تھے۔ صفدر علی کی بہن حُسنہ، بہنوئی بشیر الدین اور ان کا بیٹا خیر الدین چکوال سے آئے تھے۔ منور علی اور دردانہ کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ پہلی بار ان کے گھر میں اتنی رونق ہوئی تھی۔ گھر کے آنگن میں خوشیاں ہی خوشیاں بکھری ہوئی تھیں اور ہر شخص ان میں سے اپنا حصہ تلاش کر رہا تھا۔

منور علی کے پھوپھی زاد بھائی خیر الدین نے چکوال میں اپنا ایک چھوٹا سا موٹر گیراج قائم کر رکھا تھا لیکن وہ اس سے کوئی خاص مطمئن نہیں تھا۔ اس سے کچھ زیادہ آمدنی بھی حاصل نہیں ہوتی تھی اور کام بھی کم ملتا تھا۔ گوجرانوالہ آ کر اس نے اپنے ماموں زاد بڑے بھائی منور کا عمدہ گیراج دیکھا تو وہ اس سے بہت متاثر ہوا۔ گیراج میں مشینیں اور سامان وغیرہ بھی کافی تھا۔ جگہ بھی بڑی تھی اور یہ سب چیزیں اس وجہ سے تھیں کیونکہ کام بہت تھا۔ گوجرانوالہ ایک اچھا خاصا صنعتی مرکز تھا اور یہاں مطلوبہ کام کی کمی نہیں تھی۔ پھر منور علی کے پاس کاریگر بھی بہت اچھے اچھے تھے۔ منور کے گیراج سے خوب آمدنی ہو رہی تھی۔ خیر الدین نے ایک پورا دن منور علی کے گیراج میں گزارا اور اسے وہاں کام کی فراوانی نظر آئی۔

اسی روز رات کے کھانے پر جب سب لوگ اکٹھے تھے خیر الدین نے کہا۔ ''مجھے تو منور بھائی کا گیراج بہت اچھا لگا۔ میں کوشش کروں گا کہ چکوال میں اپنے گیراج کو بھی اسی معیار پر لے آؤں۔''

''چھوٹی جگہوں پر بڑے کام کرنا مشکل ہوتا ہے۔'' منور علی نے کہا۔ ''اگر تم کسی بڑے شہر میں کاروبار کرو گے تو زیادہ فائدہ ہوگا۔''

''تو کیا میں گوجرانوالہ آ جاؤں منور بھائی؟'' خیر الدین نے پُر اشتیاق انداز میں پوچھا۔ ''اس شہر میں کچھ گنجائش ہوگی میرے لئے؟''

''ضرور آ جاؤ۔'' منور علی نے خوشدلی کے ساتھ جواب دیا۔ ''مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکے گا۔ میں تمہارے لیے کروں گا۔''

''میں ایک بات اور سوچ رہی ہوں۔'' حُسنہ نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بجائے اس کے کہ تم گوجرانوالہ میں اپنا کوئی گیراج قائم کرو۔ اپنے بھائی کے ساتھ ہی کیوں نہیں شریک ہو جاتے؟ دونوں بھائی مل کر گیراج چلاؤ۔ دونوں مل کر کام کرو گے تو زیادہ بڑے پیمانے پر کاروبار کر سکو گے۔''

''اور بڑے پیمانے کے کاروبار میں تو آمدنی اور منافع کی شرح بھی زیادہ ہوگی۔''

بشیر الدین نے فوراً ہی اپنی بیوی کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

منور علی نے اپنی پھوپھی اور پھوپھا کی اس تجویز کا فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک بہت اہم کاروباری معاملہ تھا اور اس کے بارے میں یوں اتنی آسانی سے فیصلے نہیں کئے جا سکتے تھے۔

''اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔'' منور علی نے ذرا گول مول سا جواب دیا۔

''ہاں ہاں سوچو۔'' حُسنہ نے فوراً کہا۔ ''اچھی طرح سے سوچو۔ خیر الدین تمہارا بھائی ہے۔ دونوں بھائی مل کر کام کرو گے تو اللہ تعالیٰ کاروبار میں بہت برکت دے گا۔''

منور علی نے اپنے باپ صفدر علی سے اس بارے میں بات کی۔ حُسنہ صفدر علی کی سگی بہن تھی اور صفدر علی کو اپنی بہن اور بہنوئی پر بہت بھروسہ تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو رائے دی کہ اگر وہ اپنے پھوپھی زاد بھائی کو بھی اپنے کاروبار میں شریک کر لے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔

''بیٹھ کر سارے معاملات طے کئے جا سکتے ہیں۔'' صفدر علی نے کہا۔ ''وہ جتنا روپیہ کاروبار میں لگائے گا۔ اس کے حساب سے آمدنی میں سے اس کا حصہ مقرر ہو جائے گا۔ سیدھی سی بات ہے اور جب کاروبار ہوتا ہے تو اس میں نفع کے ساتھ ساتھ نقصان کا بھی امکان ہوتا ہے۔ اس بات کو بھی پہلے سے ہی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔''

لیکن صابرہ کو یہ خیال پسند نہیں آیا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس کو اس امر کا احساس ہو گیا تھا کہ حُسنہ اور بشیر الدین نے جائیداد کی خرید و فروخت کے معاملے میں اس کے ساتھ صاف ستھرا لین دین نہیں کیا ہے۔ اگرچہ بہت بعد میں ہی سہی لیکن اس کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ بشیر الدین نے اس کی جائیداد اس سے بہت کم قیمت پر خریدی ہے اور یہ کہ اسے یقیناً اپنے مکان اور زمینوں کے زیادہ پیسے مل سکتے تھے۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ چکوال میں اس کے مکان کو بشیر الدین نے اس سے کم داموں میں خریدنے کے بعد کتنے مہنگے داموں بیچا اور خوب منافع کمایا۔ جس میں سے اس نے صابرہ کو کچھ بھی نہیں دیا۔ اس نے اپنے شوہر سے ایک آدھ بار دبی زبان سے اس کا ذکر کیا بھی تھا، لیکن صفدر علی نے اس کی بات کو چنداں اہمیت نہیں دی تھی۔

''شاید ایسا ہو، لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حُسنہ آپا اور بشیر بھائی کے ہمارے اوپر احسانات ہیں۔'' صفدر علی نے کہا۔ ''میں جتنے دن بھی جیل میں رہا۔ ان لوگوں نے مسلسل میری خبر گیری کی اور خاص طور سے بشیر بھائی میرے لیے کتنی بھاگ دوڑ کرتے رہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صابرہ نے اپنے شوہر سے بحث نہیں کی۔ وہ صفدر علی کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھی۔ صابرہ کے اپنے دو چار دور و قریب کے عزیز تھے، ان سب نے ہی اس سے قطع تعلق کر لیا تھا اور وہ اس سے نہیں ملتے تھے۔ اس کے شوہر کے عزیزوں میں بھی لے دے کے ایک یہی بہن تھی اور اس کا میاں بشیر الدین جوان لوگوں کے ساتھ گہرے تعلقات رکھے ہوئے تھا۔ چکوال میں ان لوگوں کی زمین جائیداد وغیرہ کی دیکھ بھال بھی کرتا رہتا تھا۔

پھر بھی صابرہ نے اس کاروباری اشتراک کی مخالفت کی، لیکن اسے یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ اس کی بیٹی دردانہ کی رائے اس سے بالکل مختلف تھی۔ دردانہ اس کاروباری اشتراک کی زبردست حامی تھی اور اس نے اس تجویز کی مکمل حمایت کی۔ پھر صابرہ نے بھی زیادہ مخالفت نہیں کی اور سب لوگوں کے باہمی مشورے سے یہ طے ہو گیا کہ خیر الدین اپنے ماموں کے بیٹے منور علی کے گیراج میں رقم لگائے گا۔ جس کے ذریعے اس گیراج کی توسیع کی جائے گی اور آمدنی میں سے خیر الدین کا حصہ اس کی لگائی ہوئی رقم کے تناسب سے ہو گا۔

گوجرانوالہ میں منور علی نے جو گیراج قائم کیا تھا تو اس میں ساری رقم صفدر علی کی ہی لگی ہوئی تھی۔ کیونکہ منور علی تو اس وقت تک کچھ کرتا ہی نہیں تھا۔ اس کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ مکان بھی صفدر علی نے ہی اس کے نام سے خریدا تھا۔ چنانچہ اس نئی تجویز پر مکمل رآمد شروع ہو گیا، جلد ہی ایک زیادہ بڑی جگہ لے لی گئی اور گیراج کی توسیع کر دی گئی۔ کچھ نئی مشینیں وغیرہ بھی خریدی گئیں اور کام کے دائرے کو وسیع کر دیا گیا۔ خیر الدین نے گیراج کی توسیع کے لیے اپنے حصے کی رقم فراہم کر دی تھی اور وہ چکوال سے گوجرانوالہ منتقل ہو گیا تھا۔

''میں جلد ہی اپنے رہنے کا بھی کوئی الگ بندوبست کر لوں گا۔'' خیر الدین نے منور علی اور دردانہ سے کہا جن کے گھر آ کر وہ فی الحال ٹھہرا ہوا تھا۔

''الگ بندوبست کیوں؟'' دردانہ نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے، بھائی خیر الدین، کیا یہ گھر تمہارے بھائی کا نہیں ہے؟ تم ہم لوگوں کے ساتھ ہی رہو۔''

''بالکل۔'' منور علی نے اپنی بیوی کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے گھر میں ہے ہی کون، میں، دردانہ اور ہمارا ننھا فرخ.....''

چنانچہ خیر الدین گوجرانوالہ میں ان دونوں کے ساتھ ہی رہنے لگا اور ان دونوں کے ہزار منع کرنے کے باوجود خیر الدین اس بات پر آمادہ نہیں ہوا کہ وہ ان کے گھر میں مفت میں کھائے پیے۔

''میں یہاں تم لوگوں کا مہمان نہیں ہوں جو تم پر میری خاطر داری فرض ہو۔'' اس

نے کہا۔ ''میں یہاں رہ کر کاروبار کر رہا ہوں، پیسہ کما رہا ہوں اور اب تو مجھے رہنا ہی یہاں ہو گا۔ تو جہاں کہیں بھی رہوں گا کھانے پینے پر پیسہ تو خرچ کروں گا نا.....''

چھوٹے منور علی نے پہلے دن سے ہی خیر الدین کو پسند نہیں کیا۔

چھوٹا منور علی، منور علی کے گیراج کا ایک بہت لائق اور ہوشیار کاریگر تھا اور اسے ایک طرح سے منور علی کے ''نائب'' کی حیثیت حاصل تھی، بلکہ بعض معاملات میں تو منور علی کے بجائے اس کی بات کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ چونکہ وہ گیراج کے مالک منور علی کا ہم نام تھا۔ اس لیے اسے ممتاز کرنے کی غرض سے ''چھوٹا منور علی'' کہا جاتا تھا اور مالک منور علی کو اکثر ''بڑا منور علی۔''

روپے پیسے کا زیادہ تر حساب بھی چھوٹے منور علی کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ خیر الدین کے آنے کے بعد سے صورت حال میں خاصی تبدیلی واقع ہو گئی۔ خیر الدین ویسے ہی نہیں آ گیا تھا، اپنے حصے کی رقم کے ساتھ آیا تھا اور اب وہ اس گیراج کے مالکوں میں سے ایک تھا۔ چھوٹے منور علی کے تقریباً سارے اختیارات ختم ہو گئے اور اب روپے پیسے کے معاملات سے بھی اس کو بے دخل کر دیا گیا۔

خیر الدین اب منور علی اور دردانہ کے گھرانے کا ایک فرد بن چکا تھا اور وہ اس بندوبست سے بہت خوش اور مطمئن تھا۔ گیراج خوب چل رہا تھا اور توسیع کے نتیجے میں اس کی آمدنی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ دونوں مالکوں کے درمیان سارے معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ چل رہے تھے اور کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

تقریباً ایک سال کے بعد بشیر الدین اور حُسنہ نے گوجرانوالہ کا چکر لگایا۔ صفدر علی اور صابرہ بھی اپنے دونوں ننھے بچوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ شکوراں بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ لوگ اس سے پہلے بھی گوجرانوالہ آ چکے تھے۔ شکوراں ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی تھی اور اسے یہاں پیش آنے والے سارے واقعات کا علم رہتا تھا۔ اس بار جب نصیر پور سے صفدر علی، صابرہ اور شکوراں آئے تو اسی وقت چکوال سے بشیر الدین اور حُسنہ بھی آ گئے۔ سب لوگ بہت عرصے کے بعد ایک بار پھر اکٹھا ہوئے تھے۔

''میں چاہتی ہوں کہ اب جلد سے جلد تمہاری شادی کر دوں۔'' حُسنہ نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''میں نے تمہارے لیے کئی لڑکیاں دیکھ رکھی ہیں۔''

''ابھی نہیں اماں۔'' خیر الدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کچھ پیسے اور کما لینے دو۔ کاروبار تو سمجھو کہ بس ابھی شروع ہوا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تمہارے پاس پیسوں کی کیا کمی ہے؟'' بشیرالدین نے کہا۔ ''میرے پاس جو کچھ ہے۔ وہ تمہارا ہی ہے اور آئندہ بھی جو کچھ ہوگا وہ تمہارا ہی ہوگا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے ابا۔'' خیرالدین نے کہا۔ ''لیکن میں ابھی کاروبار پر کچھ زیادہ توجہ دینا چاہتا ہوں۔''

سب لوگ چند دن وہاں رہنے کے بعد پھر اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ سب اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے۔

لیکن پھر اطمینان کے اس تالاب میں پہلا پتھر گرتے ہی ایک ہولناک تلاطم کے آثار نمودار ہو گئے۔

چکوال میں صفدرعلی کی زمینوں کی دیکھ بھال بشیرالدین ہی کر رہا تھا جو چکوال میں ہی رہتا تھا۔ اخراجات وغیرہ نکال کر وہ خالص آمدنی کی رقم صفدرعلی کے حوالے کر دیتا تھا۔

اس سال بشیرالدین نے صفدرعلی کو جو رقم دی وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ اس سے پہلے بھی خاصی کم رقم ملی تھی، لیکن اتنی کم نہیں۔ صفدرعلی خاصا حیران ہوا۔

''کھڑی فصلوں میں کیڑا لگ گیا۔'' بشیرالدین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''کیڑے مار دواؤں کے مکمل استعمال کے باوجود فصل ضائع ہو گئی۔ اصل میں دواؤں میں بہت ملاوٹ ہونے لگی ہے۔ آئے دن اخبارات میں اس کے بارے میں خبریں آتی رہتی ہیں۔ بہت سے لوگوں کو یہی شکایت ہے۔''

''لیکن..... یہ رقم تو بہت ہی کم ہے۔'' صفدرعلی نے خاصی پریشانی کے ساتھ کہا۔ ''کم تو پچھلی مرتبہ بھی تھی لیکن اتنی کم تو نہیں تھی۔''

''اس بار یہی غنیمت سمجھو۔'' بشیرالدین نے کسی پریشانی کے بغیر جواب دیا۔ ''شکر کرو کہ خرچہ نکال کر بھی کچھ بچ رہا..... ورنہ پلے سے دینا پڑتا۔''

شکوراں نے بھی یہ ساری گفتگو سنی اور بشیرالدین کے جانے کے بعد وہ صفدرعلی سے کہنے لگی۔ ''کچھ دنوں پہلے ستارنبائی کا داماد اشرف چکوال سے یہاں آیا ہوا تھا۔ میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ صفدرعلی کی زمینوں نے تو اس فصل میں جیسے سونا اگل دیا ہے۔ کٹائی کے بعد فصل کے ڈھیر لگ گئے تھے اور یہ کہہ رہے ہیں فصل میں کیڑا لگ گیا تھا۔ نہیں صفدرعلی..... تم اس بات کی جانچ کرو۔''

صفدرعلی کے دل پر پہلی بار ایک بہت گہری چوٹ لگی۔ اس نے بشیرالدین کو ہمیشہ اپنا بڑا بھائی سمجھا تھا اور اس پر پورا اعتماد کیا تھا۔ اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا تھا اور اب

.....اب یہاں طرح طرح کی کہانیاں سننے میں آ رہی تھیں۔

''خالہ شکوراں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' صابرہ نے فوراً کہا۔ ''تم ذرا معاملات کی چھان بین تو کرو۔ مجھے پہلے بھی بشیرالدین پر بھروسہ نہیں ہے۔ اس شخص نے میرے ساتھ بھی بے ایمانی کی تھی۔''

''مشکل یہ ہے کہ میں خود چکوال جانا نہیں چاہتا۔'' صفدرعلی نے کہا۔ ''ورنہ میں اپنے معاملات بشیرالدین کے سپرد کیوں کرتا؟''

''میں تم کو ایک اور طریقہ بتاتی ہوں۔'' شکوراں نے صفدرعلی سے کہا۔ ''یوں کرو کہ چکوال میں تمہاری جو بھی زمین جائیداد ہے۔ اس سب کو بیچ دو اور کسی ایسی دوسری جگہ جائیداد خرید لو جہاں تم خود اس کی دیکھ بھال کر سکو اور تمہیں کسی دوسرے کی محتاجی نہ ہو۔ یہاں نصیرپور میں بھی خرید سکتے ہو..... یا آس پاس کسی بھی دوسری جگہ.....''

''ہاں خالہ شکوراں۔'' صفدرعلی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی صورت بہتر رہے گی۔ بشیرالدین سے جھگڑا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میری سگی بہن کا معاملہ ہے۔ بس بہتر یہی ہوگا کہ خاموشی سے ساری زمین جائیداد کو اس کے قبضے سے نکال لیا جائے۔''

''لیکن ایک بات کا خیال رکھنا صفدرعلی۔'' صابرہ نے اپنے میاں سے کہا۔ ''خرید و فروخت کے اس معاملے سے بشیرالدین کو بالکل الگ رکھنا۔ تمہیں خود ہی چکوال کے دو چار چکر لگانے پڑیں تو لگا لینا۔ بس ایک بار معاملات ختم ہو جائیں تو پھر دوبارہ تو نہیں جانا ہوگا۔''

''معاملات کو ختم کرنے کے لیے اگر دو چار بار چکوال جانا پڑے گا تو جا جاؤں گا۔'' صفدرحسین نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں کسی کا کچھ لے کے تو نہیں بھاگا ہوں۔ مجھے اپنا منہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''اس معاملے میں بہت سمجھداری سے کام لینا ہوگا صفدرعلی۔'' شکوراں نے کہا۔ ''یہ صرف تمہاری سگی بہن کا ہی معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ تمہارے بیٹے اور تمہاری بہن کے بیٹے کا بھی معاملہ ہے۔ وہ دونوں مل کر کاروبار کر رہے ہیں۔ اس میں بھی خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔''

''میں سوچتا ہوں کہ ابھی ہم منور علی اور دردانہ کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔'' صفدرعلی نے کہا۔ ''میں پہلے گاہک تلاش کر کے اپنی چکوال کی جائیداد کا سودا کر لوں۔ اس کے بعد منور علی اور دردانہ کو اس کا اصل سبب بتا دیں گے۔ پھر دیکھیں گے کہ منور علی اور خیرالدین کا مشترکہ کاروبار آگے چل سکتا ہے یا نہیں۔ مجھے اصل فکر تو اب اپنی جائیداد کی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اسے جلد از جلد بشیر الدین کے قبضے سے نکال لینا چاہتا ہوں۔ وہ جائیداد کی آمدنی روز بروز کم دکھا رہا ہے۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' صابرہ نے کہا۔ ''پہلے جائیداد کا معاملہ نمٹا لو اور گیراج کے مشترکہ کاروبار کو مت چھیڑو۔ ایک معاملہ نمٹ جائے تو پھر دوسرے میں ہاتھ ڈالو۔ ظاہر ہے کہ بشیر الدین کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئے گی کہ تم نے اپنی جائیداد بیچ دی اور وہ بھی اس سے پوچھے بغیر..... پھر دیکھو اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔''

''بشیر الدین کے باپ کا مال ہے کیا؟'' صفدر علی نے غصے سے کہا۔ ''میری چیز ہے۔ میں مالک ہوں، جی چاہے رکھوں، جی چاہئے بیچوں۔''

''بہت سنبھل کے صفدر علی۔'' شکوراں نے اس کو مشورہ دیا۔ ''بھول کر بھی غصے سے کام نہ لینا۔ ہوشیاری سے اپنا کام کرو۔''

اگلے چند روز میں صفدر علی نے خاموشی سے کچھ دوسرے ذرائع سے چکوال میں اپنی زمینوں کی فصلوں کے بارے میں معلوم کروایا اور اسے بتایا گیا کہ اس کی زمینوں سے تو بہت عمدہ فصلیں حاصل ہوئی ہیں اور خوب آمدنی ہوئی ہے۔

صفدر علی سخت پریشان ہو گیا۔ اس امر میں تو کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ اس کا سگا بہنوئی اس کے ساتھ دھوکے بازی کر رہا ہے اور مشترکہ کاروبار اور رشتوں کے نازک پیچ و خم میں اس کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنی موجودہ جائیداد کو فروخت کر کے دوسری جگہ زمینیں خرید لے۔ اس کے بہنوئی نے اس کو سخت مایوس کیا تھا۔

اس نے خاموشی سے اپنی جائیداد کے لیے کسی معقول گاہک کی تلاش شروع کر دی۔

لیکن ابھی اس کی تلاش کا آغاز ہی ہوا تھا کہ اس پر غم کا ایک ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جس نے اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ صفدر علی یہاں سے جو ٹوٹنا شروع ہوا تو پھر وہ ٹوٹتا ہی چلا گیا۔

منور علی اور خیر الدین دونوں ایک گاڑی کا بونٹ کھولے ہوئے اس کا معائنہ کر رہے تھے۔ خیر الدین ذرا دیر پہلے بھی اس کا معائنہ کر چکا تھا، لیکن خرابی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اب وہ دونوں مل کر اس کو دیکھ رہے تھے۔

''میرے خیال میں تم اس کے نیچے لیٹ کر دیکھو۔'' خیر الدین نے منور علی سے کہا۔ ''گاڑی کو اوپر اٹھانا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم جیک لگاؤ۔'' منور علی نے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں۔''

خیر الدین جیک لے آیا اور اس نے گاڑی کے نیچے جیک لگا کر گاڑی کو اوپر اٹھا دیا۔ منور علی گاڑی کے نیچے لیٹ کر خرابی کو تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک فضا میں ایک دل خراش چیخ بلند ہوئی اور اس کے جواب میں سب سے پہلے اچھل کر گاڑی کے پاس پہنچنے والا چھوٹا منور علی تھا۔ گاڑی کے نیچے لگا ہوا جیک ایک دم سے سلپ ہو گیا تھا اور بھاری گاڑی منور علی کے اوپر گر گئی تھی۔ اس کے جسم کا کمر سے اوپر کا حصہ گاڑی کے نیچے دب گیا تھا۔ ٹانگیں گاڑی سے باہر تھیں اور وہ بری طرح پھڑک رہی تھیں۔

چھوٹے منور علی کے علاوہ خیر الدین اور دوسرے کئی لوگ بڑی تیزی کے ساتھ گاڑی کی طرف بھاگے اور انہوں نے مل کر گاڑی کو اس طرف سے اوپر اٹھایا لیکن منور علی گاڑی کے نیچے سے نہیں نکلا۔ دو دوسرے آدمیوں نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر جلدی سے اسے گاڑی کے نیچے سے گھسیٹا۔ منور علی کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اس کا سینہ بھی لہولہان تھا۔

منور علی کو فوراً ہی ایک قریبی پرائیویٹ ہسپتال میں لے جایا گیا۔ جہاں اسے فوراً داخل کر لیا گیا۔ اس پر بے ہوشی طاری تھی۔ ڈاکٹروں نے فوری طور پر اس کا معائنہ کر کے بتایا کہ اس کی پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ فوری طور پر آپریشن کرنا ہوگا۔

دردانہ کو اطلاع بھجوا دی گئی اور وہ بدحواسی کے عالم میں ہسپتال آئی۔ وہ تو صدمے سے جیسے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

منور علی کا فوری طور پر آپریشن تو ہو گیا، لیکن ڈاکٹروں نے اس کی حالت کی طرف سے اطمینان کا اظہار نہیں کیا۔ پسلیاں ٹوٹ کر اندر گھس گئی تھیں اور انہوں نے کئی اندرونی اعضا کو متاثر کر دیا تھا۔ اگلے ہی دن صفدر علی، صابرہ اور شکوراں نصیر پور سے گوجرانوالہ آ گئے اور چکوال سے بشیر الدین اور حسنہ بھی پہنچ گئے۔

ہسپتال میں منور علی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا اور صفدر علی کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس کا جوان بیٹا، اس کی امیدوں کا سہارا، اپنے ٹوٹے پھوٹے جسم کے ساتھ موت کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا۔

لیکن منور علی کی جدوجہد کامیاب نہیں ہوئی۔ ہسپتال میں داخل ہونے کے دو دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کے دل کو کافی نقصان پہنچ گیا تھا۔

یہ ایک حادثاتی موت تھی۔ جس کی ذمے داری کسی پر نہیں تھی۔ جیک پھسل گیا اور گاڑی منور علی کے اوپر گر پڑی۔

منور علی کی موت نے صفدر علی کو نیم مردہ کر دیا۔ ساری دنیا اس کی نظروں میں اندھیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگئی۔ آن کی آن میں وہ سب کچھ ہوگیا۔ جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ اس کی دنیا اجڑ گئی تھی۔

لیکن مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ مرنے والا چلا جاتا ہے اور اس کے پسماندگان خود کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے ہیں اور زندگی نئی شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔

''یہ گیراج اسی طرح چلتا رہے گا ماموں۔'' منور علی کی موت کے کئی دن کے بعد خیرالدین نے بھرائی ہوئی آواز میں صفدر علی سے کہا۔ ''منور بھائی کے حصے کی رقم پہلے کی طرح برابر دردانہ کو ملتی رہے گی۔ سب کچھ اسی طرح رہے گا ماموں کچھ بھی نہیں بدلے گا۔ گیراج میں جو حصہ منور بھائی کا ہے وہ اپنی جگہ پر رہے گا۔''

صفدر علی کا ذہن ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ وہ اس معاملے کے بارے میں کوئی تصفیہ کر سکے۔ اس نے گیراج کی صورت حال کو فی الحال جوں کا توں ہی چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ ابھی کوئی بڑا فیصلہ کرنے کے لائق نہیں تھا۔ منور علی کی غیر متوقع موت کے صدمے نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ تقریباً ایک ہفتے تک گوجرانوالہ میں اپنے مرحوم بیٹے کے گھر میں رہنے کے بعد وہ صابرہ اور شکوراں کے ساتھ واپس نصیر پور آ گیا۔ یہاں بھی اہم معاملات سلجھانے تھے۔

نصیر پور واپس آنے کے کچھ دنوں کے بعد جب اس کا دل و دماغ کچھ قابو میں آئے تو پھر اس نے اپنے الجھے ہوئے معاملات پر نئے سرے سے غور کرنا شروع کیا۔

اس کے سامنے صرف اپنی اور اپنی بیوی کی ہی زندگی نہیں تھی۔ اصل مسئلہ تو ان دو ننھے بچوں کا تھا جو اس کی اور صابرہ کی اولاد تھے اور جن کو زندگی میں سب کچھ درکار تھا۔ ان کے لئے ایک محفوظ، خوشحال اور مسرت بخش مستقبل کا بندوبست کرنا صفدر علی کی ذمہ داری تھی۔ یہ بڑی کٹھن ذمہ داری تھی۔ وقت تو پر لگا کر اڑ رہا تھا اور دونوں بچے ابھی بہت چھوٹے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وقت کتنی مہلت دے گا۔ بڑا بیٹا تو چلا گیا تھا اب دونوں چھوٹے بیٹوں کے لیے ہی سب کچھ کرنا تھا۔

صفدر علی نے خالہ شکوراں اور صابرہ کے مشورے سے یہی طے کیا کہ سب سے پہلے جائیداد کی فروخت کا انتظام کر دیا جائے۔ گیراج کے معاملے پر بعد میں غور کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی جائیداد کے لیے کسی گاہک کی تلاش کے کام کو، جسے بیچ میں روک دینا پڑا تھا دوبارہ شروع کر دیا۔

اس روز اچانک ایک شخص بالکل غیر متوقع طور پر اس سے ملنے کے لیے نصیر پور آن پہنچا۔ وہ اس شخص کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

وہ اس شخص کو گوجرانوالہ میں دیکھ چکا تھا۔ مگر اس کا براہ راست اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس شخص کا نام منور علی تھا۔ وہ گوجرانوالہ میں منور علی کے گیراج میں کام کرتا تھا اور مالک کے نام سے الگ کرنے کی غرض سے اسے ''چھوٹا منور علی'' کہا جاتا تھا اور اب یہ چھوٹا منور علی صفدر علی سے ملاقات کرنے کی غرض سے نصیر پور آیا تھا۔

''میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنے کے لیے گوجرانوالہ سے خاص طور سے یہاں آیا ہوں۔'' چھوٹے منور علی نے کہا۔ ''اور میں چاہتا ہوں کہ میری آمد کے بارے میں کسی کو بھی علم نہ ہو۔ خاص طور سے خیرالدین کو تو بالکل ہی علم نہ ہو۔''

''نہیں ہوگا۔'' صفدر علی نے اس کو یقین دلاتے ہوئے حیرانی کے عالم میں کہا۔ ''لیکن بات کیا ہے؟''

''میں گیراج کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔'' چھوٹے منور علی نے کہا۔ ''وہاں بڑا اندھیر مچا ہوا ہے۔''

''اندھیر مچا ہوا ہے؟'' صفدر علی نے حیرت سے کہا۔ ''کیسا اندھیر؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''خیرالدین گیراج کی قیمتی مشینیں اور دوسرا قیمتی ساز و سامان بیچے ڈال رہا ہے۔'' چھوٹے منور علی نے کہا۔ ''اب تک وہ لاکھوں روپے کی مشینیں بیچ چکا ہے۔''

''ارے؟'' صفدر علی نے حیران ہو کر کہا۔ ''اور دردانہ؟ وہ کیا کر رہی ہے؟ تم نے دردانہ کو اس بارے میں بتایا؟''

''جی، بتایا تھا۔'' چھوٹے منور علی نے کہا۔ ''میں ان کے پاس گیا تھا۔ پہلے تو دردانہ بی بی نے یہ کہہ کر مجھ سے ملنے سے ہی انکار کر دیا کہ وہ عدت میں ہیں اور کسی مرد سے نہیں مل سکتیں، لیکن جب میں نے یہ کہلوایا کہ مجھے ان سے کچھ بہت ضروری بات کرنا ہے جو ان کے اپنے فائدے کے لیے ہے تو وہ ملنے کے لیے آمادہ ہوئیں اور انہوں نے چند منٹ کے لیے مجھ کو اندر بلا لیا۔''

''پھر؟'' صفدر علی نے بے چینی کے ساتھ کہا۔ ''تم نے اس کو بتایا؟''

''جی.....'' چھوٹے منور علی نے کہا۔ ''بتایا تھا۔ اس پر وہ کہنے لگیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ان کی اجازت اور مرضی سے ہو رہا ہے اور مجھے اس معاملے میں خواہ مخواہ ٹانگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ان کو یہ بھی بتایا کہ میرے علم کے مطابق خیرالدین سامان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم گیراج کے مشترکہ اکاؤنٹ میں نہیں بلکہ اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع کروا رہا ہے۔ اس پر دردانہ بی بی مجھ پر بہت ناراض ہوئیں۔ انہوں نے الزام لگایا کہ میں جاسوسی کرتا ہوں۔ میں نے ان کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں تو صرف ان کی بھلائی کے لیے انہیں یہ باتیں بتا رہا ہوں۔ کیونکہ منور علی کی موت کے بعد وہ اس کے حصے کی مالک ہیں اور خیرالدین دھوکے بازی کر رہا ہے، لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور مجھے کمرے سے نکال دیا۔''

صفدر علی کے دماغ میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔

''اگلے ہی دن خیرالدین نے مجھے نوکری سے نکال دیا۔'' چھوٹے منور علی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور ساتھ ہی مجھے دھمکی بھی دی کہ اگر میں نے زیادہ بکواس کی تو وہ میرا برا حشر کرے گا۔ میں نے اگلے ہی دن سے ایک دوسرے گیراج میں کام شروع کر دیا۔ میرے لیے تو کام کی کوئی کمی نہیں ہے، لیکن میں نے یہ ضروری سمجھا کہ میں آپ سے مل کر آپ کو یہ حالات بتا دوں۔ خیرالدین کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ خدا جانے کیا کرنا چاہتا ہے اور دردانہ بی بی عورت ذات ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آ رہی ہیں۔ اس نے خدا معلوم ان کو کیا سکھا پڑھا دیا ہے۔ وہ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

اس وقت منور علی کی موت کو دو ماہ سے کچھ زیادہ کی مدت گزر چکی تھی۔

''تم نے بہت اچھا کیا منور علی کہ تم میرے پاس آ گئے۔'' صفدر علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو دردانہ بے چاری عورت ذات ہے۔ خیرالدین اس کے مرحوم شوہر کا بھائی ہے وہ خیرالدین کی باتوں کا یقین کرتی ہے۔''

صفدر علی، دردانہ کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ اس کے دل کی آواز نہیں تھی۔ اس کے دل میں جو اتھل پتھل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس کا اظہار وہ ایک غیر شخص کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''مجھے سب معلوم ہے کہ یہ گیراج کیسے قائم ہوا تھا۔ میں تو اس دن سے ہی منور صاحب کے ساتھ تھا جب انہوں نے اس کو بنایا تھا۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر اس کو بنایا تھا، وہ مجھ پر پورا بھروسہ کرتے تھے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں تو بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اس قیمتی چیز کو برباد ہوتے ہوئے دیکھتا اور خاموش رہتا۔ اس لیے جب دردانہ بی بی

نے میری بات نہیں سمجھی تو پھر میں سیدھا آپ کے پاس چلا آیا۔''

صفدر علی نے چھوٹے منور علی کو اپنے گھر میں مہمان کے طور پر ٹھہرایا اور اس کے کھانے وغیرہ کا بندوبست کیا۔ چھوٹے منور علی نے ایک رات وہاں قیام کیا۔

''ایک بات بتاؤ منور علی.....!'' رات کے کھانے کے بعد صفدر علی نے اس سے پوچھا۔ ''جیک کیسے پھسل گیا؟ کیا اس میں پہلے سے کوئی خرابی تھی؟ گاڑی میں جیک تو خیرالدین نے اپنے ہاتھ سے ہی لگایا تھا نا.....؟''

چھوٹا منور علی کچھ دیر تک خاموش رہا..... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صفدر علی کا اصل مطلب سمجھ چکا ہے اور کچھ بولنے سے پہلے سوچ رہا ہے۔

''میں اس جیک کے بارے میں نہیں جانتا۔'' اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''اسے کچھ دن پہلے ایک کباڑیے سے سستے داموں خریدا گیا تھا اور میں نے اس کو استعمال نہیں کیا تھا۔ ویسے کسی جیک کا سلپ ہو جانا کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ اگرچہ ایسا بہت کم ہوتا ہے، لیکن ہو سکتا ہے جیک کی اپنی خرابی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کو گاڑی کے نیچے غلط جگہ پر لگانا بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ جیک کے نیچے کی زمین کا ناہموار ہونا بھی کبھی کبھار اس کا سبب ہو سکتا ہے۔ خدا گواہ ہے میں کسی پر کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں۔ صرف اتنی ہی بات کہوں گا جتنی کہ جانتا ہوں۔ مجھے ایک دن مر کر خدا کو منہ دکھانا ہے۔''

''نہیں، نہیں منور علی.....! تم میری بات کو غلط سمجھ رہے ہو۔'' صفدر علی نے جلدی سے کہا۔ ''میں ہرگز کسی پر کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں، میرے دماغ میں ایک بات آئی تھی سو میں نے پوچھ لی۔''

''اس بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا..... نہ کچھ کہا جا سکتا ہے۔'' چھوٹے منور علی نے آہستہ سے کہا۔ ''اگر کسی کمبخت نے کوئی شرارت کی ہے تو قیامت کے دن خدا کے ہاں پورا پورا انصاف ہو جائے گا..... انسان ساری دنیا کو دھوکا دے سکتا ہے، لیکن وہ خدا کو تو دھوکا نہیں دے سکتا۔''

صفدر علی کا چہرہ ایک دم سیاہ پڑ گیا۔

چھوٹے منور علی نے رات بھر صفدر علی کے گھر قیام کیا اور اس کو گیراج کے بارے میں بہت ساری باتیں بتائیں۔ صفدر علی اس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ اگلی صبح کو جب چھوٹا منور علی جانے لگا تو صفدر علی نے اس کو کچھ رقم دینی چاہی۔

''نہیں صاحب.....!'' چھوٹے منور علی نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاس پیسے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ خدا کا شکر ہے عزت کی روٹی کھاتا ہوں۔ مجھے تو دوسرے ہی دن دوسری جگہ کام مل گیا کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا تھا کہ آپ کو صحیح حالات بتا سکوں۔ منور علی صاحب مجھے بہت عزیز تھے۔''

''مگر تم نے کرائے کی رقم خرچ کی ہے۔'' صفدر علی نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ''کم از کم کرائے کی رقم تو لے لو.....!''

صفدر علی کے اصرار کے باوجود چھوٹے منور علی نے اس سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا اور چلا گیا۔

☆======☆======☆

گوجرانوالہ میں گیراج میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کی خبروں نے ان سب لوگوں کو سخت حواس باختہ کر دیا تھا۔ صابرہ بہت وحشت زدہ ہو گئی تھی اور شکوراں ان لوگوں کی پریشانی میں برابر کی شریک تھی۔

''خیر الدین کی بے ایمانی تو سمجھ میں آتی ہے۔'' صفدر علی نے نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ تو ہے ہی بے ایمان باپ کی بے ایمان اولاد..... لیکن دردانہ کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ کیوں اس بدمعاش کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے؟''

''خدا جانے اس نے کیا سبق پڑھا دیا ہو گا اس کو.....'' صابرہ نے کمزور آواز میں کہا۔ ''اب یہ تو اس سے بات کرنے کے بعد ہی پتہ چلے گا..... ہمیں فوراً ہی اس کے پاس گوجرانوالہ چلنا چاہئے۔''

''وہاں جانے سے پہلے اور ان لوگوں سے بات کرنے سے پہلے اپنے طور پر یہ اچھی طرح سوچ لو کہ تمہیں کرنا کیا ہے۔'' خالہ شکوراں نے مشورہ دیا۔ ''سب کچھ اچھی طرح سے سوچ کر اور فیصلہ کر کے جاؤ۔''

''سوچنا کیا ہے خالہ شکوراں.....!'' صفدر علی نے فوراً کہا۔ ''خیر الدین نے گیراج کا جو بھی سامان بیچا ہے، اس کا حساب کرنے کے بعد اپنی لگائی ہوئی رقم واپس لے لے اور گیراج ہمارے حوالے کر دے۔ پھر ہم جانیں اور ہمارا کام..... چاہیں تو گیراج کو چلائیں اور چاہیں تو بیچ دیں..... دردانہ کو بھی سمجھانا ہے کہ وہ خیر الدین جیسے بے ایمانوں کے جھانسے میں نہ آئے۔''

''ہم لوگ اسے سمجھا لیں گے۔'' صابرہ نے کہا۔ ''انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

صفدر علی سخت پریشانی میں گھر گیا تھا۔ وہ ابھی اپنی جائیداد کے الجھے ہوئے معاملات کو بھی نہیں سلجھا سکا تھا کہ جوان بیٹے کی ناگہانی موت نے اس کی کمر توڑ دی اور اب یہ ایک نئی افتاد آن پڑی۔ یہ اس کی اور صابرہ کی مشترکہ پریشانی تھی اور خالہ شکوراں اس میں برابر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی شریک تھی۔

اگلے ہی دن تین افراد اور دو چھوٹے بچوں پر مشتمل یہ مختصر سا قافلہ گوجرانوالہ کے لیے روانہ ہوگیا۔

دردانہ نے ان لوگوں کو دیکھ کر کسی خاص حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے پہلے سے اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ لوگ آنے والے ہیں۔ اس کے خیر مقدمی انداز میں کوئی خاص گرم جوشی نہیں تھی۔

گفتگو کا آغاز صابرہ نے کیا اور اس نے اصل بات پر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

''سنا ہے خیرالدین گیراج کا سامان بیچے ڈال رہا ہے؟'' صابرہ نے کہا۔ ''اور تم نے اسے روکا بھی نہیں؟ ہم لوگ کو خبر کی ہوتی..... تمہارے چاچا.....!''

''اچھا تو وہ چھوٹا منور علی تم لوگوں تک بھی جا پہنچا.....'' دردانہ نے اپنی ماں کی بات کاٹتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔ ''مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ وہاں ضرور پہنچے گا۔ اس کے پیٹ میں بہت درد ہوتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھے کہ تُو کون؟ دو ٹکے کا نوکر.....! ارے ہماری چیز ہے۔ ہم رکھیں یا بیچیں..... اسے کیا مطلب.....؟''

''یہ بات نہیں ہے بیٹا.....!'' صفدر علی بولا۔ ''وہ ہمارے خاندان کا ہمدرد ہے۔ اس نے ایک غلط کام ہوتے دیکھا تو ہمیں بتایا۔ آخر خیرالدین کو گیراج کا سامان بیچنے کا کیا حق ہے؟ اس طرح تو وہ سارے گیراج کو بیچ کر کھا جائے گا۔''

''نہیں چاچا.....!'' دردانہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''خیرالدین جو کچھ بھی کر رہا ہے۔ میری اجازت سے کر رہا ہے۔ گیراج کو چلانا ہے اور اسے ترقی دینا ہے۔ وہاں زیادہ نئی مشینیں لگانی ہیں۔ اس لیے ہم پرانی مشینوں کو بیچ رہے ہیں۔ ہم نئی مشینیں لگائیں گے۔''

''اگر ایسی کوئی بات تھی تو تمہیں مجھ کو بتانا چاہئے تھا۔'' صفدر علی نے ناگواری کے ساتھ کہا۔ ''مجھ سے مشورہ کرنا چاہئے تھا۔ خیرالدین کا تو اس گیراج میں تھوڑا سا ہی حصہ ہے۔ اصل مالک تو ہم لوگ ہیں۔ تم نے اس کو کیسے اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ اپنی مرضی سے سارے فیصلے کرنا شروع کر دے؟ اور وہ بھی منور کی موت کے صرف دو مہینے کے بعد ہی..... ابھی تو ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہم خیرالدین کو اس کاروبار میں مزید شریک رکھیں گے بھی یا نہیں.....! کاروبار کے اصل مالک تو ہم ہیں۔''

''ہم نہیں چاچا، میں۔'' دردانہ نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''اس گیراج کی، اس کاروبار کی مالک میں ہوں، صرف میں.....! اور خیرالدین اس میں ایک چھوٹا سا حصے دار

ہے..... خیرالدین میری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔''

''یہ تم کیا بکواس کر رہی ہو.....؟'' صابرہ ایک دم پھٹ پڑی۔ غم و غصے کے عالم میں اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ ''صرف تم کیسے مالک بن بیٹھیں؟ اور ہم لوگ کہاں گئے؟ جہنم میں.....؟''

''مجھے نہیں معلوم اماں کو تم لوگ کہاں گئے۔'' دردانہ نے کہا۔ ''لیکن ذرا بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ گیراج میرے مرحوم شوہر کی ملکیت تھا اور اس کی موت کے بعد میں اس کی بیوہ کی حیثیت سے اس کی مالک ہوں میں اور میرا بیٹا..... مجھ سے میرا یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔ اس گیراج پر صرف میرا حق ہے اور میں اسے اپنی مرضی سے چلاؤں گی۔''

''ایسا نہیں ہے بیٹی.....!'' صفدر علی نے اپنے شدید غصے کو ضبط کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس گیراج میں ساری رقم ہماری لگائی ہوئی ہے۔ منور علی کی کمائی کا تو اس میں ایک پیسہ بھی نہیں لگا ہے، کیونکہ منور علی کوئی کمائی نہیں کرتا تھا۔''

''اور تم.....؟'' دردانہ نے تڑاخ سے جواب دیا۔ ''تم کیا کمائی کرتے تھے چاچا.....؟ سارا پیسہ تو زمین اور جائیداد سے ہی آتا تھا نا؟ تو اس پر تمہارا بھی حق تھا اور تمہارے بیٹے کا بھی۔''

''تو پھر ٹھیک ہے..... خیرالدین کا حصہ نکال کر اس گیراج کے تین حصے ہوں گے۔ ایک حصہ میرے مرحوم بڑے بیٹے کا اور دو حصے میرے دونوں چھوٹے بیٹوں گے..... تم اپنے مرحوم شوہر کا حصہ لے سکتی ہو۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا چاچا.....!'' دردانہ نے اس کی بات کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اَن پڑھ نہیں ہوں اور تھوڑا بہت قانون خود بھی جانتی ہوں۔ یہ گیراج میرے شوہر کی ملکیت تھا اور اس کی موت کے بعد میں اور میرا بیٹا فرخ اس کے جائز وارث ہیں۔ منور علی بے اولاد نہیں تھا۔ اس کا وارث موجود ہے۔''

''تمہیں کیا ہو گیا ہے دردانہ.....؟'' صابرہ شدتِ غم سے رونے لگی۔ ''تم اپنے معصوم چھوٹے بھائیوں سے ان کا حق چھین لینا چاہتی ہو؟''

''میں کسی سے اس کا حق نہیں چھین رہی ہوں اماں.....!'' دردانہ نے جواب دیا۔ ''میں صرف اپنا حق لے رہی ہوں..... اکبر علی اور حیدر علی تمہاری اور چاچا کی ذمہ داری ہیں۔ میری ذمہ داری نہیں ہیں۔ میرے شوہر کے پاس جو کچھ تھا وہ صرف میرا اور میرے بیٹے کا ہے۔ کوئی دوسرا اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دردانہ کا رویہ ان سب کے لیے صرف غیر متوقع اور حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ حد درجہ المناک اور دل شکن بھی تھا..... صابرہ زار و قطار رو رہی تھی اور صفدر علی کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا لیکن دردانہ نے اس کی کچھ پروا نہیں کی اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

''وہ میرے دونوں چھوٹے بچوں کا حق مار لینا چاہتی ہے۔'' صابرہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے ایسا نہیں کرنے دوں گی۔''

''میں اس سے علیحدگی میں بات کروں گی۔'' خالہ شکوراں نے کہا۔ ''شاید میں اسے کچھ سمجھا سکوں۔''

''دردانہ کو ابھی تک یہ نہیں معلوم ہے کہ خیرالدین کا باپ ہماری زمینوں کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔'' صابرہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''اس بارے میں تو ہم نے اسے ابھی تک کچھ نہیں بتایا ہے۔ ہم اسے بتانے والے تھے کہ اس کے سر پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس حالت میں ہم اسے اور زیادہ صدمہ نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔''

''لیکن بشیرالدین کے بارے میں اس سے ابھی کچھ نہ کہنا۔ صفدر علی نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''تم خود دیکھ رہی ہو کہ وہ خیرالدین کے کتنے زیادہ اثر میں ہے۔ ہم بشیرالدین کے بارے میں اس سے جو کچھ کہیں گے۔ وہ فوراً ہی خیرالدین کو بتا دے گی اور یہ ساری بات بشیرالدین تک پہنچ جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو۔ پہلے میں جائیداد کی فروخت کا بندوبست کرلوں۔ اس کے بعد بشیرالدین سے کھل کر بات ہوگی۔''

''تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔'' خالہ شکوراں نے صفدر علی سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک ہی وقت میں کئی لوگوں کو دشمن بنالینا ٹھیک نہیں ہے۔''

شکوراں نے دردانہ سے علیحدگی میں بات کی اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے چھوٹے چھوٹے بھائیوں کا حوالہ دیا۔

''چاچا کے پاس اچھی خاصی جائیداد ہے۔'' دردانہ نے برہمی کے ساتھ کہا۔ ''میرے مرحوم میاں کا حصہ نکال کر وہ اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں کی بآسانی پرورش کر سکتے ہیں۔ انہیں اس گیراج کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

خالہ شکوراں لرز کر رہ گئی۔ دردانہ کا انداز ایسا سفاکانہ تھا کہ شکوراں کی ہمت ہی ٹوٹ گئی۔ دردانہ تو کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔

صفدر علی نے جب اپنے بھانجے خیرالدین سے اس بارے میں گفتگو کی تو خیرالدین کا رویہ بے حد مؤدبانہ اور شائستہ تھا۔ اس نے اپنے ماموں، ممانی کے ساتھ ذرا بھی بدتمیزی

نہیں کی، لیکن وہ اپنے مؤقف سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا۔

''گیراج پر حق دردانہ بھابی کا ہے۔'' اس نے ان لوگوں سے کہا۔ ''وہ منور بھائی کی بیوہ اور ان کے حصے کی وارث ہیں۔ میں انہی کو مالک سمجھتا ہوں اور ان کے حکم کا پابند ہوں۔ میں نے کسی قسم کی کوئی بے قاعدگی نہیں کی ہے۔ جو کچھ بھی کیا ہے۔ وہ دردانہ بھابی کی اجازت اور مشورے سے کیا ہے اور آئندہ بھی جو کچھ کروں گا وہ انہی کی اجازت اور مشورے سے کروں گا۔''

وہ تینوں اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

گوجرانوالہ آتے وقت ان لوگوں کو اندازہ نہیں تھا کہ دردانہ اس قدر عجیب اور سخت رویہ اختیار کرے گی اور وہ خیرالدین کے اتنے زیادہ زیر اثر آچکی ہوگی۔ ان سب کو اس کے رویئے سے شدید مایوسی ہوئی۔ ان سب کے ہی دلوں میں ایک دھندلا سا سہا سہا خیال موجود تھا، لیکن تینوں ہی اپنی اپنی جگہ پر خوف زدہ تھے اور کوئی بھی اس خیال کو زبان پر لانے کی جرأت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''گیراج کی تو صرف زمین ہی کس قدر قیمتی ہے۔'' صفدر علی نے دکھ بھری آواز میں کہا۔ ''کئی برس پہلے خریدی تھی۔ اب تو اس کی قیمت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے اور عمارت مشینیں اور سامان وغیرہ سب اس سے الگ ہیں۔ یہ لوگ اس پر قبضہ کر لینا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے، میں ابھی کچھ دن خاموش رہتا ہوں۔ ذرا جائیداد کا قصہ نمٹ جائے اس کے بعد دیکھوں گا۔''

''ہرگز قبضہ نہ کرنے دینا ان لوگوں کو.....!'' صابرہ نے غصے اور نفرت کے ساتھ کہا۔ ''یہ اولاد ہے ہماری.....؟ لعنت ہو ایسی اولاد پر..... دوسرے کو کیا کہیں، اپنی اولاد ہی دغا بازی پر آمادہ ہے۔''

اگلے ہی دن وہ لوگ گوجرانوالہ سے واپس نصیر پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ فی الحال موجودہ مرحلے میں وہ بشیرالدین اور حسنہ سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے اور اس سے کوئی فائدہ بھی تو نہیں تھا۔ جب صابرہ کی اپنی بیٹی ہی خیرالدین کے ساتھ ملی ہوئی تھی تو پھر خیرالدین کیوں نہ شیر ہو جاتا..... صفدر علی کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ وہ چکوال میں اپنی زمین و جائیداد کو فروخت کر دے۔

وہ لوگ واپس نصیر پور آگئے اور دونوں میاں بیوی بہت افسردہ خاطر اور پژمردہ تھے۔ خاص طور سے صابرہ کو اپنی بیٹی سے ایسی امید نہیں تھی..... وہ اپنے شوہر سے شرمندہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی تھی اور اس نے صفدر علی کے سامنے اس کا کھل کر اظہار بھی کیا۔

''نہیں صابرہ..... اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔'' صفدر علی نے کہا۔ ''وہ اپنے فیصلے خود کر رہی ہے۔ دیکھو نا مجھے اپنے لیے اور تمہارے لیے کیا چاہئے؟ کچھ بھی نہیں، زندگی کا بڑا حصہ تو ہم لوگ گزار ہی چکے ہیں، لیکن اکبر علی اور حیدر علی نے تو ابھی زندگی شروع بھی نہیں کی ہے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ دردانہ نے اپنے چھوٹے بھائیوں کا بھی خیال نہیں کیا۔ آخر وہ دونوں بھی تو اس کی ہی ماں کی اولادیں ہیں۔''

شکست وریخت کا شکار اور دکھوں کا مارا ہوا صفدر علی اب اپنی چکوال کی زمین وجائیداد بیچنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اور اس نے گاہک کی تلاش کا کام کافی تیز کر دیا تھا۔

تقریباً ایک ماہ کے بعد بسنت پورہ نامی ایک دوسرے گاؤں میں سے ایک ایسے زمیندار کے بارے میں معلوم ہوا جو چکوال کے نواح میں کچھ زمینیں اور جائیداد خریدنے کا خواہشمند تھا۔ صفدر علی نے ایک جاننے والے کے ذریعے اس سے ملاقات کی۔ اس متوقع خریدار کا نام لطیف حسن تھا۔

لطیف حسن نے صفدر علی سے اس کی جائیداد کی تفصیلات وغیرہ مانگیں اور صفدر علی نے اسے ساری معلومات فراہم کر دیں۔ لطیف حسن خان نے اس کی جائیداد کے زیادہ تر حصے کو خریدنے پر آمادگی ظاہر کی۔ ان کے درمیان قیمت وغیرہ کے معاملات بھی خاصی حد تک طے ہو گئے تھے۔

''میں اب چکوال جاؤں گا اور وہاں جا کر زمینوں کا معائنہ بھی کروں گا اور ان کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں بھی تصدیق کروں گا۔'' لطیف حسن خان نے کہا۔

''ضرور کر لیجئے۔'' صفدر علی نے کہا۔ ''میرے بہنوئی بشیر الدین میری جائیداد کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ فی الحال ان کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ہمارا سودا پکا ہو جائے گا تو میں خود ہی ان کو بتا دوں گا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' لطیف حسن خان نے کہا۔ ''کسی کام کے بارے میں پہلے سے شور کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ جب سودا پکا ہو جائے گا پھر تو سب کو معلوم ہی ہو جائے گا۔''

صفدر علی کافی مطمئن ہو گیا۔ لطیف حسن خان اس کی جائیداد کا بڑا حصہ خاصی اچھی قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ اس نے صابرہ اور شکوراں کو خوشخبری سنائی۔

''باقی جائیداد کے لیے بھی گاہک مل ہی جائے گا۔'' اس نے ان دونوں سے کہا۔ ''یہ زمینیں بک جائیں گی تو پھر میں بشیر الدین سے اچھی طرح نمٹوں گا..... اس نے اور اس کے

بیٹے نے ہماری زندگیوں میں زہر گھول دیا ہے۔''

اس بات کو کوئی دو ہفتے گزر گئے۔ صفدر علی کو ابھی تک لطیف حسن خان کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ وہ بے چینی کے ساتھ اس بات کا منتظر تھا کہ لطیف کی طرف سے اس کو کوئی پیغام ملے اور پھر معاملہ کچھ آگے بڑھے، لیکن لطیف کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ ایک آدھ دن مزید انتظار کرنے کے بعد خود ہی بسنت پورہ کا ایک چکر لگا لوں۔'' صفدر علی نے صابرہ سے کہا۔ ''کچھ خیر خبر تو ملے۔''

''ٹھیک ہے۔'' صابرہ نے کہا۔ ''ہم زیادہ دنوں تک انتظار نہیں کر سکتے، اگر لطیف کو خریداری سے دلچسپی نہیں ہے تو پھر کوئی اور گاہک تلاش کیا جائے۔''

لیکن اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ اگلے ہی دن لطیف خود ہی اس کے پاس نصیر پور آ گیا۔ صفدر علی اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

''میں تو ایک آدھ روز میں خود ہی آپ کے پاس آنے کی سوچ رہا تھا۔'' صفدر علی نے کہا۔ ''آپ نہیں آئے تو میں نے سوچا کہ میں خود ہی چل کر معلوم کروں۔''

''ہاں! مجھے آنے میں دیر تو ضرور ہوئی، لیکن میں کام میں ہی مصروف تھا۔'' لطیف حسن خان نے کہا۔

اس کے بعد اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور بولا۔ ''آپ نے اپنی جائیداد کی یہی تفصیل بتائی تھی نا.....؟'' اور وہ جائیداد کی تفصیلات پڑھنے لگا جو اس کے پاس اس کاغذ پر درج تھیں۔ صفدر علی ہر تفصیل پر سر ہلا کر اس کی توثیق کرتا جاتا تھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔'' آخر میں صفدر علی نے کہا۔ ''یہی سب کچھ ہے۔''

''لیکن اس میں سے زیادہ تر جائیداد تو سرے سے آپ کے نام ہے ہی نہیں۔'' لطیف حسن خان نے کہا۔ ''وہ دوسرے لوگوں کے نام پر ہے۔''

''کیا مطلب.....؟'' صفدر علی نے چونک کر کہا۔ ''دوسرے لوگوں کے نام پر ہے؟ نہیں..... آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ ساری زمین اور جائیداد میری ہی ہے۔''

''نہیں صفدر علی صاحب! ایسا نہیں ہے۔'' لطیف حسن خان نے کہا۔ ''میں سارا ریکارڈ دیکھ کر آیا ہوں اور پٹواری سے بھی مل کر آیا ہوں..... آپ یہ ساری زمین و جائیداد جو اب آپ کے نام پر نہیں ہے۔ پہلے ہی فروخت کر چکے ہیں اور انتقال اراضی پر عملدرآمد بھی ہو چکا ہے۔''

''ناممکن.....!'' صفدر علی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے تو اس میں سے ایک انچ زمین بھی نہیں بیچی۔''

''آپ کے بہنوئی بشیرالدین سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی۔'' لطیف نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا۔ ''انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ وہ ساری زمینیں بیچ چکے ہیں اور بشیر الدین وہاں دوسرے مالکان کے کارندے کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا گیا ہے۔'' صفدرعلی کو خود اپنی آواز ہی اجنبی لگ رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبا جارہا تھا اور وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر بول رہا تھا۔ ''میں یہاں بیٹھا ہوں، میں نے کچھ بھی نہیں بیچا اور میری زمینیں اور جائیداد بک گئیں۔''

''اگر کسی نے آپ کے ساتھ دھوکا کیا ہے تو پھر آپ فوراً ہی عدالت سے رجوع کیجئے۔'' لطیف نے اسے مشورہ دیا۔ ''اس معاملے میں تاخیر بالکل مت کیجئے..... حیرت ہے یہ سب ہوا کیسے؟ آپ کو خبر بھی نہیں اور آپ کی جائیداد بک بھی گئی..... یہ تو سراسر اندھیر ہے..... بالکل اندھیر ہے۔''

لطیف حسن خان کچھ دیر رکنے کے بعد وہاں سے واپس چلا گیا۔

صفدرعلی سے اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا جارہا تھا۔ اس کے ہاتھ، پیروں سے تو جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ کافی دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔ شکوراں باہر کے کمرے میں آئی تو اس نے صفدر علی کو عجیب حالت میں پایا۔ اس کے چہرے پر مردنی طاری تھی اور وہ اس طرح گم صم بیٹھا ہوا تھا جیسے مراقبے کی حالت میں ہو اور دنیا سے اس کا رابطہ ٹوٹ گیا ہو۔

''کیا مہمان چلے گئے؟'' خالہ شکوراں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں.....!'' صفدرعلی نے جواب دیا۔ ''وہ چلا گیا اور وہ مجھے یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ چکوال میں میری تقریباً ساری جائیداد بشیرالدین نے بیچ ڈالی ہے۔'' شکوراں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا، وہ حیرانی کے عالم میں صفدرعلی کی شکل دیکھتی رہی۔

صفدرعلی کے گھر میں اس تازہ افتاد سے ایک قیامت برپا ہوگئی، صابرہ دھاروں دھار رو رہی تھی اور صفدرعلی کے تو جیسے اوسان ہی خطا ہوگئے تھے، وہ اب کیا کرے؟ صاف ظاہر تھا کہ اس کے سگے بہنوئی بشیرالدین نے دھوکے اور جعلسازی کے ذریعے اس کی جائیداد کو فروخت کردیا تھا اور ساری رقم ہضم کرلی تھی۔ صفدرعلی نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ بشیرالدین اس حد تک اس کو نقصان پہنچائے گا۔

''اپنی بہن کی گردن پکڑ.....'' صابرہ نے شدید غم و غصے کے عالم میں اس سے کہا۔

''اس سے پوچھو کہ اس کے بے غیرت میاں نے یہ کیا کیا ہے..... ارے یہ لوگ تو ہمیں لوٹ کر کھا گئے..... ان کا بیٹا گیراج پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا اور باپ نے ساری جائیداد ہتھیالی۔ ہائے اب ہم کیا کریں۔ ارے خدا غارت کرے ان لوگوں کو..... ہیضہ بٹورے انہیں.....'' وہ بے تحاشا ان لوگوں کو گالیاں اور کوسنے دے رہی تھی۔

''میں بشیرالدین کے خلاف قانونی کارروائی کروں گا۔'' صفدرعلی نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم فکر مت کرو، میں بشیرالدین سے ایک ایک پائی وصول کروں گا۔ اس نے جعلسازی سے کام لیا ہے۔ میں تو اسے جیل بھجواؤں گا۔''

''ہاں..... ہاں ضرور بھجواؤ۔'' صابرہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''ایسے آدمی کو تو ساری زندگی جیل میں سڑتے رہنا چاہئے اور.....!'' وہ ایک دم رک گئی۔ شاید دماغ کے کسی دور دراز گوشے میں کوئی دور دراز کا ایسا خیال ابھر آیا تھا۔ جس نے اسے مزید کچھ بولنے سے روک دیا تھا۔ اس نے صفدرعلی کی طرف دیکھا صفدرعلی کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ دونوں ذرا دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔

''کوئی بھی کارروائی کرنے سے پہلے بشیرالدین سے بات کرلو۔'' شکوراں نے مشورہ دیا۔ ''اس سے بھی اور اپنی بہن سے بھی..... اگر بات چیت سے کوئی راستہ نکل آتا ہے تو بہت اچھا ہے ورنہ پھر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ..... بشیرالدین تو بڑا ہی خطرناک آدمی نکلا۔''

''میں ان دونوں کو یہاں بلواتا ہوں۔'' صفدرعلی نے شکوراں کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر معاملہ سلجھ جاتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر میں تھانہ، کچہری کروں گا۔ میں بھی کوئی ایسا کمزور آدمی نہیں ہوں۔''

صفدرعلی نے اسی دن اپنی بہن اور بہنوئی کو چکوال میں پیغام بھجوادیا کہ وہ آکر اس سے فوری طور پر ملاقات کریں۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ لوگ آنے میں لیت ولعل سے کام لیں گے، لیکن اس کی توقع کے برخلاف وہ دونوں اگلے ہی دن نصیر پور آگئے..... یہاں ٹیڑھی ٹیڑھی نظروں اور بگڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ ان کا استقبال کیا گیا۔

''یہ کیا قصہ ہے بھائی بشیرالدین.....؟'' صفدرعلی نے حتی المقدور اپنے آپ کو آپے سے باہر ہونے سے روکتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم نے میری زمینیں بیچ دیں.....؟''

''بھئی میں خود ہی دو چار روز میں تمہارے پاس آکر تم کو بتانے والا تھا۔'' بشیرالدین کے لہجے میں کسی قسم کی ندامت یا گھبراہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ''بات یہ تھی کہ مجھ کو پیسے کی ضرورت تھی، تم کو تو معلوم ہی ہے مجھے اپنی بیوہ بہن کی تین تین بیٹیوں کی شادی کرنی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ بچیاں اب شادی کے لائق ہوگئی ہیں اور ان کے رشتے آنے شروع ہو گئے ہیں۔ مجھے اب انتظامات شروع کرنے ہیں۔ کچھ فوری رقم کی ضرورت تھی۔ میں نے سوچا کہ میں تمہاری زمینیں بیچ دوں بعد میں تمہاری یہ رقم ادا کر دوں گا۔ پھر کچھ اور دباؤ بھی تھا۔ اس کی وجہ سے بھی مجبور ہو گیا۔''

''لیکن تمہیں ایسا کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا بشیر بھائی.....!'' صفدر علی نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ ''تم نے امانت میں خیانت کی ہے۔ میں نے تو تم پر بھروسہ کر کے اپنی زمینوں کا انتظام تمہارے حوالے کیا تھا اور تم انہیں بیچ کر کھا گئے۔ میں..... میں تمہارے خلاف قانونی کارروائی کروں گا۔ میں تمہیں جیل بھی بھجوا سکتا ہوں۔''

دونوں فریقوں میں زبردست معرکہ آرائی ہو رہی تھی، لیکن بشیر الدین کی ڈھٹائی حیرت انگیز تھی اسے اپنے اس فعل پر ذرا بھی ندامت نہیں تھی اور وہ صفدر علی پر برابر آنکھیں نکالے جا رہا تھا۔ صابرہ اور حُسنہ ابھی تک خاموش تھیں اور پھر حُسنہ اچانک جیسے پھٹ پڑی۔

''بہت زیادہ طیش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' حُسنہ نے اپنے بھائی کو کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے چلا کر کہا۔ ''تم بھی کوئی اللہ کے نیک بندے نہیں ہو، کبھی اپنے گریبان میں بھی منہ ڈال کر دیکھو، تم ہو کیا چیز.....؟''

صفدر علی ایک دم ٹھٹک کر اپنی بہن کو دیکھنے لگا۔ بہن کی طرف سے کیا جانے والا یہ حملہ بالکل غیر متوقع تھا۔

''اگر تمہیں مقدمے بازی کا شوق ہے تو تم وہ بھی پورا کر لو۔'' بشیر الدین نے درشت لہجے میں کہا۔ ''ساری زندگی ناک رگڑتے رہو گے اور ایک پائی بھی نہیں ملے گی اور تم مقدمے کی کیا بات کرتے ہو میاں صفدر علی.....! مقدمے تو میرے پاس بھی تیار رکھے ہیں۔ تمہارے اور تمہاری اس عورت کے خلاف.....'' اس نے انگلی سے صابرہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے؟ دنیا اندھی نہیں ہے صفدر علی.....! لوگ سب جانتے ہیں اور تم بھی جانتے ہو کہ لوگ سب جانتے ہیں۔ تبھی تم چوروں کی طرح چکوال چھوڑ کر یہاں نصیر پور میں چھپے بیٹھے ہو۔ تم نے بھی تو کسی کے مال و جائیداد پر قبضہ کیا ہے اور وہ بھی کسی کی جان لے کر..... زیادہ بڑی بڑی باتیں مت کرو۔''

''بشیر الدین.....! یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟'' کسی اور کے کچھ بولنے سے پہلے خالہ شکوراں بول اٹھی۔ ''وہ سارے قصے تو ختم ہو چکے ہیں۔ اب ان گڑے مُردوں کو کیوں اکھاڑ رہے ہو؟''

''ان لوگوں کو سمجھاؤ خالہ شکوراں.....!'' بشیر الدین نے کہا۔ ''اپنے آپے میں رہیں۔ ان کے پیسے کچھ دنوں میں مل جائیں گے اور اگر مقدمے بازی کا شوق ہے تو بسم اللہ.....! ہم نے بھی کچھ مقدمے تیار کر رکھے ہیں اور یہ لوگ یہ بھی یاد رکھیں کہ یہ اپنے بڑے بیٹے سے تو ہاتھ دھو ہی چکے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ چھوٹے بیٹوں سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں۔''

''بشیر بھائی.....!'' صابرہ گلا پھاڑ کر پوری قوت سے چیخی۔ ''یہ تم کیا بک رہے ہو؟ تمہیں شرم نہیں آتی؟ ہمارے بچوں کو بددعا دے رہے ہو؟''

''میں تمہارے بچوں کو بددعا نہیں دے رہا ہوں صابرہ.....!'' بشیر الدین نے کہا۔ ''جانتی ہو جن لوگوں نے تمہاری زمینیں خریدی ہیں وہ کون ہیں؟ وہ علاقے کے مشہور ڈاکو فجے کے آدمی ہیں۔ وہ تو ویسے بھی زمینوں پر قبضہ کر لیتے، کیونکہ انہیں یہ سارا قصہ معلوم تھا۔ بدمعاشوں کو اپنے علاقے کی ہر بات کی خبر رہتی ہے۔ میں نے کوشش کر کے ان سے کچھ رقم وصول کر لی..... شکر کرو کہ تم اور تمہارے بچے بچ گئے..... اب زیادہ تاؤ کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چند مہینے میں تمہارے پیسے مل جائیں گے اور اگر عدالت میں جانے کا شوق ہے تو میری طرف سے پوری اجازت ہے۔''

''نہیں..... نہیں.....!'' خالہ شکوراں نے معاملے کو سنبھالا۔ ''کوئی تھانہ کچہری نہیں کر رہا ہے میرے بھائی..... تم ان لوگوں کو رقم لوٹا دو اور فوراً ہی لوٹا دو تو بہت اچھا ہے۔''

''ارے لوٹا دیں گے خالہ شکوراں.....!'' حُسنہ تنک کر بولی۔ ''کون سا سارا ان کا اپنا مال ہے..... ہنھ.....!''

صابرہ نے اپنی نند کو کھا جانے والی نفرت بھری نظروں سے دیکھا، لیکن کچھ بولی نہیں۔ حُسنہ تو سراسر غلط بیانی سے کام لے رہی تھی۔ چکوال میں جو بھی زمینیں تھیں۔ وہ صفدر علی کی اپنی زمینیں تھیں۔ مرحوم حمید الحسن کی جو بھی جائیداد چکوال میں تھی۔ اسے صابرہ نے بیچ کر نصیر پور میں جائیداد خرید لی تھی اور یہ ساری خرید و فروخت خود بشیر الدین کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

صفدر علی اور صابرہ کو ایک انجانے خوف دہشت، بے یقینی اور کرب میں مبتلا کر کے بشیر الدین اور حُسنہ واپس چلے گئے۔ بشیر الدین چلتے چلتے کہہ گیا کہ وہ جلدی رقم واپس کر دے گا۔ اس نے یا حُسنہ نے اس امر پر ذرا بھی شرمندگی کا اظہار نہیں کیا کہ انہوں نے امانت میں خیانت کی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بشیر الدین نے ڈاکوؤں کے حوالے سے، جو کچھ کہا تھا، اس میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ ..... یہ کسی کو نہیں معلوم تھا لیکن اس نے ان دونوں کے بچوں کے سلسلے میں جو دھمکیاں دی تھیں۔ ان سے وہ دونوں لرز کر رہ گئے تھے اور پھر ماضی کے واقعات کے حوالے سے دی جانے والی دھمکیاں.....! یہ سب کچھ اس قدر خوفناک تھا کہ صفدر علی اور صابرہ کے ہوش اڑ گئے۔

ان دونوں کو اس بات کا تو یقین تھا کہ اگر حالات مزید خراب ہوئے تو بشیر الدین انہیں اس سے بھی زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ وہ اور اس کا بیٹا خیر الدین انہیں پہلے ہی اس قدر زیادہ نقصان پہنچا چکے تھے۔

''خدا تمہارے بچوں کی خیر رکھے۔'' شکوراں نے ان سے کہا۔ ''جو کچھ بھی کرنا بہت سنبھل کر اور ہوشیاری کے ساتھ کرنا۔ یہ تو بڑا خطرناک آدمی ہے۔ خدا جانے کیا کر بیٹھے..... دولت کے لالچ میں آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔''

''خدا جانتا ہے میں کسی پر الزام نہیں لگا رہا ہوں۔'' صفدر علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مگر میں نہیں جانتا کہ میرا منور علی کیسے مرا۔'' اس کے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکا اور اس کا گلا رندھ گیا۔

صابرہ نے زخمی نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر تاریکی کے سائے پھیل گئے تھے۔

گھر کی فضا میں گہرا رنج و ملال گھل گیا تھا۔ صفدر علی اپنے آپ کو ایک تباہ شدہ انسان پا رہا تھا۔ جوان بیٹے کی موت نے اسے ادھ مرا کر دیا تھا۔ گیراج پر خیر الدین پوری طرح قبضہ کئے بیٹھا تھا اور دردانہ نہ دل و جان سے اس کے ساتھ تھی اور اب خیر الدین کے باپ نے ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ صفدر علی کے سارے وجود کو لہولہان کر دیا تھا۔ وہ اور صابرہ، دونوں اپنی زندگی کے سب سے زیادہ خوف زدہ اور المناک دور سے گزر رہے تھے۔ بشیر الدین اور حُسنہ کے حملوں نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ ان کی قوتِ مزاحمت جواب دے گئی تھی۔ وہ بشیر الدین کے خلاف کوئی ٹھوس قدم اٹھانے میں اپنے آپ کو بری طرح بے بس محسوس کرتے تھے۔

ان لوگوں نے گیراج کے بارے میں بشیر الدین سے یہ سوچ کر کوئی بات نہیں کی تھی کہ پہلے وہ اپنی جائیداد کو اس کے قبضے سے نکال لیں۔ اس کے بعد گیراج کے معاملے پر بات کریں گے، لیکن بشیر الدین تو اپنے بیٹے سے کہیں بڑا دغاباز نکلا۔ اس نے تو ساری جائیداد ہی

جعلسازی کے ذریعے بیچ ڈالی، اب اس سے گیراج کے مسئلے پر بھلا کیا بات ہو سکتی تھی؟ البتہ دردانہ کو یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ خیر الدین کے باپ نے اس کے سوتیلے باپ کی ساری جائیداد بیچ کھائی ہے۔ صفدر علی خود گوجرانوالہ نہیں گیا۔ صابرہ خالہ شکوراں کو ساتھ لے کر اپنی بیٹی کے پاس گئی اور اس نے رو رو کر دردانہ کو ان سارے حالات سے آگاہ کیا۔ دردانہ اپنے گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ خیر الدین ایک الگ گھر میں رہ رہا تھا، لیکن چونکہ دونوں مشترکہ کاروبار کے مالک تھے۔ اس لیے خیر الدین، دردانہ کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔

دردانہ نے اس سارے قصے میں کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اس کی ماں نے اس کو سمجھانا چاہا کہ وہ خیر الدین کو گیراج سے الگ کر دے اور اس کے ساتھ کاروبار کو ختم کر دے۔

''خیر الدین اور اس کا باپ ہم کو تباہ کئے ڈال رہے ہیں بیٹی.....!'' صابرہ نے کہا۔

''خدا کے لئے تم سمجھنے کی کوشش کرو۔''

لیکن دردانہ نے کچھ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

''خیر الدین نے میرے ساتھ کوئی بے ایمانی نہیں کی ہے اماں.....!'' اس نے رکھائی سے کہا۔ ''اور جہاں تک خیر الدین کے باپ کا تعلق ہے تو اس کے اعمال کے لیے خیر الدین ذمہ دار نہیں ہے۔ چاچا چاہیں تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کر سکتے ہیں۔''

''وہ بڑی خوفناک دھمکیاں دے کر گیا ہے بیٹی.....!'' صابرہ کی آواز اب ہلکی سرگوشی میں تبدیل ہو گئی۔

''تو پھر چاچا کو انتظار کرنا چاہئے۔'' دردانہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''جب وہ کہہ رہا ہے کہ رقم ادا کر دے گا تو اس کا انتظار کرنا چاہئے۔''

دردانہ کے سارے اندازِ گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس معاملے کو قطعی کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس نے گیراج کے معاملے میں بھی اپنی ماں اور سوتیلے باپ کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ منور علی کی موت کے بعد دردانہ بالکل ہی بدل گئی تھی۔ وہ اب صرف اپنے ذاتی مفادات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

صابرہ اور شکوراں واپس نصیر پور آ گئیں۔ ان کی بات سن کر صفدر علی کو کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔

''مجھے اسی کی امید تھی۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

☆======☆======☆

اس کے بعد کوئی دو ماہ کا عرصہ گزر گیا، لیکن اس دوران بشیر الدین نے نہ تو کوئی رابطہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا، نہ رقم بھیجی۔صفدر علی بڑی بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار کر رہا تھا۔اس کے پاس اب انتظار کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔اسے ساری دنیا اندھیروں میں ڈوبی ہوئی لگتی تھی۔جوان بیٹے کی اچانک اور غیر متوقع موت نے اسے پہلے ہی تباہ کر دیا تھا۔اب اس کے بعد پیش آنے والے دل خراش واقعات نے اس کے سینے میں اور بھی ناسور ڈال دیئے تھے اور یہ سارے غم ایسے تھے جن کا کوئی مداوا نظر نہیں آتا تھا۔وہ اپنے آپ کو ایک بند گلی میں کھڑا ہوا پا رہا تھا۔

دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد اس نے خالہ شکوراں کو بشیر الدین کے پاس چکوال بھیجا۔اب تو حالت یہ ہوگئی تھی کہ صفدر علی کا ساری دنیا پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔وہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔قریبی لوگوں میں لے دے کے شکوراں ہی ایک ایسی فرد تھی جس پر وہ اعتبار کر سکتا تھا اور جو اس کے اور صابرہ کے تمام دکھ درد میں برابر کی شریک رہی تھی۔

شکوراں کی شخصیت غیر متنازع تھی اور وہ بشیر الدین اور اس کی بیوی حُسنہ سے بات کر سکتی تھی۔

بشیر الدین اور حُسنہ نے شکوراں کی معقول طریقے سے پذیرائی کی۔بشیر الدین، شکوراں کے کچھ کہے بغیر ہی اس کی آمد کا مقصد سمجھ چکا تھا۔

''وہ تو خواہ مخواہ غصے میں آ گیا خالہ شکوراں.....!'' بشیر الدین نے کہا۔''میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کو رقم دے دوں گا۔تو میں ضرور دے دوں گا اور تم اس کو اچھی طرح سمجھا دینا۔اگر اس نے زیادہ بہادری دکھانے کی کوشش کی تو میں اس کو اور صابرہ کو دونوں کو جیل بھجوا دوں گا۔پھر دونوں ساری زندگی جیل میں سڑتے رہیں گے.....وہ یہ نہ سمجھے کہ معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔''

''پرانی باتوں کو بھلا دینا چاہئے بشیر الدین.....!'' خالہ شکوراں نے بغیر کسی تبصرے کے آہستہ سے کہا۔

''اس سے کہہ دینا کہ میں جلد ہی اس کی رقم دے دوں گا۔'' بشیر الدین نے کہا۔''اور اس کو کسی کو میرے پاس بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

شکوراں نے موقع غنیمت دیکھ کر بشیر الدین اور حُسنہ سے گیراج کے سلسلے میں خیر الدین کے رویئے کا بھی ذکر کیا۔

''میں پچھلے مہینے خود گوجرانوالہ گیا تھا۔'' بشیر الدین نے کہا۔''دردانہ اور خیر الدین کا مشترکہ کاروبار بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ان دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی

شکایت نہیں ہے تو پھر صفدر علی کے پیٹ میں کیوں درد اٹھا؟''

''گیراج پر صرف دردانہ کا ہی نہیں صفدر علی کے دونوں چھوٹے بیٹوں کا بھی حق ہے۔'' شکوراں نے کہا۔''صفدر علی اپنے بچوں کا حق چاہتا ہے۔''

''یہ سب بکواس ہے۔'' بشیر الدین نے کہا۔''گیراج میں مرحوم منور علی کا جو حصہ تھا وہ اب اس کی بیوہ اور اس کے بیٹے کا حصہ ہے کسی اور کا اس پر بھلا کیا اختیار ہے۔''

''لیکن اس گیراج میں ساری رقم صفدر علی نے لگائی تھی۔'' شکوراں نے بشیر الدین کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''اور صفدر علی یہ چاہتا ہے کہ اس رقم میں سے اس کے دونوں چھوٹے بیٹوں کو بھی ان کا حصہ ملے۔''

''گیراج کی زمین، عمارت، ہر چیز منور علی کے نام پر ہے۔'' بشیر الدین نے کہا۔''اور منور علی کے بعد یہ سب چیزیں اس کی بیوی اور بیٹے کی ملکیت ہیں، کسی دوسرے کا ان پر کوئی حق نہیں ہے۔تم صفدر علی کو سمجھا دینا کہ گیراج کا خیال چھوڑ دے۔صابرہ کی بیٹی نے جو فیصلہ کیا ہے۔وہ بالکل صحیح ہے۔جب صابرہ کی بیٹی ہی اپنی سگی ماں اور سوتیلے باپ کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے تو پھر وہ لوگ دوسروں کو کیوں مجبور کرنا چاہتے ہیں؟''

شکوراں واپس نصیر پور آ گئی اور اس نے صفدر علی اور صابرہ کو ساری بات بتا دی۔

''سب ملی بھگت ہے۔'' صفدر علی نے آہستہ سے کہا۔''بشیر الدین گوجرانوالہ جاتا رہا ہے اور وہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اور جب سے ہو رہا ہے۔اس کا اسے رتی رتی علم ہے۔خیر الدین اور دردانہ کو بشیر الدین اور حُسنہ کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے۔''

آنے والے دن اس خاندان کے لیے اور بھی زیادہ جاں گسل تھے۔صفدر علی کی تقریباً ساری جائیداد اس سے چھن گئی تھی اور بشیر الدین نے ابھی تک ایک پائی بھی اس کو ادا نہیں کی تھی۔صفدر علی اور صابرہ دونوں ہی سخت دباؤ میں تھے۔ان کا ماضی انہیں رات دن خوف زدہ کرتا رہتا تھا اور صفدر علی بشیر الدین کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔معاملہ صرف اس کی ذات کا نہیں تھا۔صابرہ بھی غیر محفوظ تھی۔پھر دونوں چھوٹے بچوں کا کیا ہوگا؟ اگر وہ دونوں اس کے پیروں میں زنجیر نہ بنے ہوئے ہوتے تو شاید وہ بشیر الدین کے خلاف قانونی کارروائی کا خطرہ مول لے لیتا باوجود اس کے کہ بشیر الدین نے اسے ڈاکوؤں کی کارروائی کی بھی دھمکی دی تھی، لیکن موجودہ صورت میں وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا اور صابرہ بھی اس کی ہم خیال تھی۔شکوراں ان دونوں کی ذہنی کیفیت سے پوری طرح واقف تھی۔وہ دونوں ایک ایسے گردابِ بلا میں پھنس گئے تھے جہاں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا، نہ رقم بھیجی۔ صفدر علی بڑی بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے پاس اب انتظار کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ اسے ساری دنیا اندھیروں میں ڈوبی ہوئی لگتی تھی۔ جوان بیٹے کی اچانک اور غیر متوقع موت نے اسے پہلے ہی تباہ کر دیا تھا۔ اب اس کے بعد پیش آنے والے دل خراش واقعات نے اس کے سینے میں اور بھی ناسور ڈال دیئے تھے اور یہ سارے غم ایسے تھے جن کا کوئی مداوا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک بند گلی میں کھڑا ہوا پا رہا تھا۔

دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد اس نے خالہ شکوراں کو بشیر الدین کے پاس چکوال بھیجا۔ اب تو حالت یہ ہو گئی تھی کہ صفدر علی کا ساری دنیا پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ وہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ قریبی لوگوں میں لے دے کے شکوراں ہی ایک ایسی فرد تھی جس پر وہ اعتبار کر سکتا تھا اور جو اس کے اور صابرہ کے تمام دکھ درد میں برابر کی شریک رہی تھی۔

شکوراں کی شخصیت غیر متنازع تھی اور وہ بشیر الدین اور اس کی بیوی حُسنہ سے بات کر سکتی تھی۔

بشیر الدین اور حُسنہ نے شکوراں کی معقول طریقے سے پذیرائی کی۔ بشیر الدین، شکوراں کے کچھ کہے بغیر ہی اس کی آمد کا مقصد سمجھ چکا تھا۔

''وہ تو خواہ مخواہ غصے میں آ گیا خالہ شکوراں.....!'' بشیر الدین نے کہا۔ ''میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کو رقم دے دوں گا۔ تو میں ضرور دے دوں گا اور تم اس کو اچھی طرح سمجھا دینا۔ اگر اس نے زیادہ بہادری دکھانے کی کوشش کی تو میں اس کو اور صابرہ کو دونوں کو جیل بھجوا دوں گا۔ پھر دونوں ساری زندگی جیل میں سڑتے رہیں گے..... وہ یہ نہ سمجھے کہ معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔''

''پرانی باتوں کو بھلا دینا چاہئے بشیر الدین.....!'' خالہ شکوراں نے بغیر کسی تبصرے کے آہستہ سے کہا۔

''اس سے کہہ دینا کہ میں جلد ہی اس کی رقم دے دوں گا۔'' بشیر الدین نے کہا۔ ''اور اس کو کسی کو میرے پاس بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

شکوراں نے موقع غنیمت دیکھ کر بشیر الدین اور حُسنہ سے گیراج کے سلسلے میں خیر الدین کے رویئے کا بھی ذکر کیا۔

''میں پچھلے مہینے خود گوجرانوالہ گیا تھا۔'' بشیر الدین نے کہا۔ ''دردانہ اور خیر الدین کا مشترکہ کاروبار بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی

شکایت نہیں ہے تو پھر صفدر علی کے پیٹ میں کیوں درد اٹھا؟''

''گیراج پر صرف دردانہ کا ہی نہیں صفدر علی کے دونوں چھوٹے بیٹوں کا بھی حق ہے۔'' شکوراں نے کہا۔ ''صفدر علی اپنے بچوں کا حق چاہتا ہے۔''

''یہ سب بکواس ہے۔'' بشیر الدین نے کہا۔ ''گیراج میں مرحوم منور علی کا جو حصہ تھا وہ اب اس کی بیوہ اور اس کے بیٹے کا حصہ ہے کسی اور کا اس پر بھلا کیا اختیار ہے۔''

''لیکن اس گیراج میں ساری رقم صفدر علی نے لگائی تھی۔'' شکوراں نے بشیر الدین کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اور صفدر علی یہ چاہتا ہے کہ اس رقم میں سے اس کے دونوں چھوٹے بیٹوں کو بھی ان کا حصہ ملے۔''

''گیراج کی زمین، عمارت، ہر چیز منور علی کے نام پر ہے۔'' بشیر الدین نے کہا۔ ''اور منور علی کے بعد یہ سب چیزیں اس کی بیوی اور بیٹے کی ملکیت ہیں، کسی دوسرے کا ان پر کوئی حق نہیں ہے۔ تم صفدر علی کو سمجھا دینا کہ گیراج کا خیال چھوڑ دے۔ صابرہ کی بیٹی نے جو فیصلہ کیا ہے۔ وہ بالکل صحیح ہے۔ جب صابرہ کی بیٹی ہی اپنی سگی ماں اور سوتیلے باپ کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے تو پھر وہ لوگ دوسروں کو کیوں مجبور کرنا چاہتے ہیں؟''

شکوراں واپس نصیر پور آ گئی اور اس نے صفدر علی اور صابرہ کو ساری بات بتا دی۔

''سب ملی بھگت ہے۔'' صفدر علی نے آہستہ سے کہا۔ ''بشیر الدین گوجرانوالہ جاتا رہا ہے اور وہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اور جب سے ہو رہا ہے۔ اس کا اسے رتی رتی علم ہے۔ خیر الدین اور دردانہ کو بشیر الدین اور حُسنہ کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے۔''

آنے والے دن اس خاندان کے لیے اور بھی زیادہ جاں گسل تھے۔ صفدر علی کی تقریباً ساری جائیداد اس سے چھن گئی تھی اور بشیر الدین نے ابھی تک ایک پائی بھی اس کو ادا نہیں کی تھی۔ صفدر علی اور صابرہ دونوں ہی سخت دباؤ میں تھے۔ ان کا ماضی انہیں رات دن خوف زدہ کرتا رہتا تھا اور صفدر علی بشیر الدین کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ معاملہ صرف اس کی ذات کا نہیں تھا۔ صابرہ بھی غیر محفوظ تھی۔ پھر دونوں چھوٹے بچوں کا کیا ہوگا؟ اگر وہ دونوں اس کے پیروں میں زنجیر نہ بنے ہوئے ہوتے تو شاید وہ بشیر الدین کے خلاف قانونی کارروائی کا خطرہ مول لے لیتا باوجود اس کے کہ بشیر الدین نے اسے ڈاکوؤں کی کارروائی کی بھی دھمکی دی تھی، لیکن موجودہ صورت میں وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا اور صابرہ بھی اس کی ہم خیال تھی۔ شکوراں ان دونوں کی ذہنی کیفیت سے پوری طرح واقف تھی۔ وہ دونوں ایک ایسے گرداب بلا میں پھنس گئے تھے جہاں سے باہر نکلنے کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہیں کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔

ان کے پاس اب صرف وہ جائیداد باقی رہ گئی تھی جو صابرہ نے چکوال میں اپنے مرحوم شوہر کی جائیداد فروخت کر کے نصیر پور میں خریدی تھی۔ اس خرید و فروخت کے معاملے میں بھی بشیر الدین نے ڈنڈی ماری تھی۔ جس کے نتیجے میں صابرہ کی جائیداد بھی خاصی کم ہو گئی تھی اور پھر اس جائیداد میں اس وقت اور بھی کمی ہو گئی تھی جب دردانہ کی شادی ہوئی تھی۔

اس وقت تک تو سب کچھ بالکل ٹھیک تھا۔ دردانہ اپنی تھی۔ منور علی اپنا تھا اور ان دونوں کے علاوہ اور کوئی اولاد نہیں تھی۔ جس کے بارے میں سوچا جائے۔ فرید تو ایک بھولی بسری داستان تھا اور نہ ہی دلوں میں یہ خیال موجود تھا کہ کوئی مزید اولاد ہو گی۔ چنانچہ صابرہ نے اپنی خاصی جائیداد اپنی بیٹی کے نام کر دی تھی اور صفدر علی کو اس پر قطعی اعتراض نہیں ہوا تھا کیونکہ صابرہ کی بیٹی اس کے اپنے بیٹے کی بیوی تھی جو کچھ دردانہ کا تھا۔ وہ منور علی کا تھا۔

اور اب صابرہ کے نام پر جو تھوڑی بہت جائیداد نصیر پور میں بچی تھی وہی ان دونوں میاں بیوی کا اور ان کے دونوں چھوٹے بچوں کا واحد اثاثہ تھی۔

صابرہ اب بار بار رو رو کر پچھتاوے کا اظہار کرتی تھی۔ اس نے کیوں اپنی زیادہ تر جائیداد دردانہ کے نام کر دی تھی۔

''جو ہو گیا ہے۔ اس پر افسوس کرنے سے کیا فائدہ.....؟'' شکوراں اس کو سمجھاتی۔ ''اس وقت کسے معلوم تھا کہ آگے چل کر کیا حالات ہونے والے ہیں۔ تم نے تو جو کچھ بھی کیا وہ بالکل نیک نیتی کے ساتھ کیا تھا۔''

صفدر علی اب زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ اس کا کچھ وقت تو صابرہ کی تھوڑی بہت زمینوں کی دیکھ بھال میں گزر جاتا تھا۔ باقی وقت وہ گھر پر ہی گزارتا تھا اور کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ تاہم دونوں چھوٹے بچوں کی طرف سے وہ کبھی بھی غافل نہیں رہتا تھا۔ یہی دونوں بیٹے تو اب اس کی زندگی کا واحد سہارا تھے اور اسے انہیں ہر قیمت پر دنیا کے ہر عذاب سے محفوظ رکھنا تھا ان کی زندگی اس کے لیے اب دینا کی سب سے زیادہ قیمتی شے تھی۔ جس کو بچانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

گوجرانوالہ سے ان لوگوں کا رابطہ بالکل منقطع ہو چکا تھا۔ دردانہ نے ان کی کوئی خیر خبر نہیں لی اور نہ ہی ان میں سے کوئی دردانہ سے ملنے کے لیے گوجرانوالہ گیا۔

مزید دو مہینے گزر گئے اور بشیر الدین کی طرف سے کوئی پیغام نہیں ملا۔ صفدر علی بعض اوقات گہری ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہونے لگتا اور اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے بشیر الدین

سے اب وہ ایک پائی بھی وصول نہیں کر سکے گا۔

پھر ایک دن اچانک بشیر الدین اور حُسنہ نصیر پور پہنچ گئے۔ صفدر علی اور صابرہ انہیں دیکھ کر متعجب بھی ہوئے اور خوش بھی..... وہ دونوں اچانک اور بغیر کسی پیشگی اطلاع کے یہاں آ گئے تھے۔

نہ آمد میں کوئی گرم جوشی تھی اور نہ خیر مقدم میں کوئی والہانہ پن..... سب کچھ بڑے مشینی طریقے پر ہو رہا تھا۔ مہمانوں کو گھر میں بلا کر بٹھایا گیا۔

''میں نے رقم کا بندوبست کر لیا ہے۔'' بشیر الدین نے سنجیدگی سے کہا۔

صفدر علی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے دل میں امید کی بجھی ہوئی شمع ایک دم سے دوبارہ روشن ہو گئی، صابرہ اور شکوراں کے چہروں پر بھی رونق آ گئی۔

''کتنی.....؟'' صفدر علی نے بے چینی سے پوچھا۔ ''کتنی رقم لائے ہو بشیر بھائی؟''

بشیر الدین نے جو رقم بتائی، اسے سن کر صفدر علی ہکا بکا رہ گیا۔

''بس.....؟'' اس نے مایوسی آمیز حیرت کے ساتھ کہا۔ ''بس کل اتنی.....؟ ارے یہ تو میری اس ساری جائیداد کی ایک چوتھائی قیمت بھی نہیں ہے۔''

''جو کچھ ہے، یہی ہے اور یہ بھی بہت ہے۔'' بشیر الدین نے کہا۔ ''اس سے زیادہ کی امید مت رکھو۔'' اس کے لہجے میں تلخی در آئی تھی۔

صفدر علی اور صابرہ نے سخت احتجاج کیا، لیکن بشیر الدین نے صاف صاف کہہ دیا کہ انہیں اس سے زیادہ رقم نہیں مل سکتی۔ حُسنہ بھی برابر اپنے میاں کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

''یہ سمجھ لو کہ جان بچی اور لاکھوں پائے.....'' بشیر الدین نے کہا۔ ''ڈاکوؤں کی جیب سے مال نکلوا لینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ فجے ڈاکو تو مقتول حمید الحسن کا دوست تھا۔ یہی غنیمت سمجھو کہ اس نے اس وقت تم کو زندہ چھوڑ دیا اور عدالت کو اپنا کام کرنے دیا۔''

صفدر علی نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے بشیر الدین کی اس ڈاکوؤں والی کہانی پر بالکل یقین نہیں ہے۔

''لیکن یہ رقم بھی تمہیں ایک شرط کے ساتھ ہی مل سکے گی۔'' بشیر الدین نے صفدر علی کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ شرط تمہارے اور تمہارے بیوی، بچوں کے حق میں ہی ہے۔''

''کیسی شرط.....؟'' صفدر علی نے چونک کر کہا۔

''وہ شرط یہ ہے کہ پیسے پکڑو اور یہاں سے نکل جاؤ۔'' بشیر الدین نے کہا۔ ''اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بعد سے تم چکوال، نصیر پور یا گوجرانولہ میں کہیں نظر نہ آنا..... یہاں سے کہیں بہت دور چلے جاؤ، تمہارے اور تمہارے بچوں کے حق میں یہی بہتر ہے، یہ علاقہ اب تمہارے رہنے کے قابل نہیں رہا۔''

''مگر کیوں.....؟'' صفدر علی آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ''کیوں چلے جائیں ہم لوگ یہاں سے..... تم ہمیں یہاں سے نکالنے والے ہوتے کون ہو؟'' غصے کے مارے اس کی آواز تھرانے لگی۔ ''یہ ہمارا گھر ہے۔''

''کہیں اور گھر بنالو۔'' حُسنہ نے کہا۔ ''خدا کی زمین بہت وسیع ہے، مگر یہاں سے چلے جاؤ۔''

''نہیں.....! ہم یہاں سے ہرگز نہیں جائیں گے۔'' صفدر علی نے درشت اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ہمیں ہمارے گھر سے کوئی نہیں نکال سکتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' بشیر الدین نے کہا۔ ''اس صورت میں، میں تم کوئی رقم نہیں دے سکتا، رقم تم کو صرف اس شرط پر ملے گی کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

''ہم اس جگہ کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟'' صابرہ نے کہا۔ ''یہاں میری زمین جائیداد بھی ہے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' بشیر الدین نے فوراً کہا۔ ''بیچ دو..... میں خریدنے کے لیے تیار ہوں یا پھر سب کچھ اپنی بیٹی دردانہ کے نام کردو..... آخر یہ اسی کے باپ کی تو جائیداد ہے نا.....''

''دردانہ اپنے باپ کی اکیلی وارث نہیں ہے۔'' صابرہ کسی زخمی شیرنی کی طرح دھاڑی۔ ''دردانہ کا ایک سگا بھائی بھی ہے..... میرا بیٹا فرید.....!''

''فرید.....؟ ہی ہی ہی.....'' بشیر الدین گہرے طنزیہ اور استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ''تمہارا بیٹا فرید.....! ارے فرید کا تم لوگوں نے جو حشر کیا ہے، وہ میں خوب جانتا ہوں..... آج تمہیں فرید یاد آرہا ہے۔''

''کیا معلوم کہاں ہوگا۔'' حُسنہ نے کڑے تیوروں سے صابرہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''زندہ بھی ہوگا یا نہیں..... تم لوگوں نے تو اپنی طرف سے اسے مار ہی دیا۔''

''اور ایک بات اور سن لو۔'' بشیر الدین نے صفدر علی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں اس سارے کام کے لیے تمہیں تین ماہ کا وقت دے رہا ہوں۔ تین ماہ کے اندر اندر اپنے بچوں کو لے کر اس علاقے سے نکل جاؤ۔ پھر کبھی اپنی شکل نہ دکھانا۔''

''لیکن تم تین مہینے کی شرط کیوں لگا رہے ہو؟'' شکوراں نے پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ اس سے تین مہینے کے بعد خیر الدین اور دردانہ کی شادی ہونے والی ہے۔'' بشیر الدین نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''اور ان دونوں کی شادی سے پہلے پہلے تم لوگوں کو یہاں سے چلا جانا چاہئے، خود دردانہ بھی یہی چاہتی ہے۔''

''کیا بکتے ہو.....؟'' صابرہ حلق پھاڑ کر چیخی۔ ''خیر الدین اور دردانہ کی شادی.....؟ نہیں..... نہیں یہ کبھی نہیں ہوسکتا..... میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔''

''کیوں نہیں ہوسکتا؟'' حُسنہ نے چمک کر کہا۔ ''اور کیسے روک لوگی تم..... دردانہ ماشاء اللہ بالغ ہے..... عاقل ہے..... وہ اپنے بارے میں اپنی مرضی سے خود فیصلہ کرسکتی ہے۔ اس نے اور خیر الدین نے ایک ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

صفدر علی جیسے پتھر کا ہوگیا تھا..... وہ بالکل بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے کا رنگ سیاہ ہو رہا تھا۔

''تم لوگ چاہو تو دردانہ اور خیر الدین کو شادی کی مبارکباد پہلے ہی دے سکتے ہو۔'' بشیر الدین نے کہا۔ ''کیونکہ ان کی شادی کے موقع پر تم یہاں موجود نہیں ہوگے اور اب ہم لوگ چلتے ہیں تمہارے پاس سوچنے کے لیے وقت ہے۔ رقم میں نے بتا دی ہے اور وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ اگر تم لوگ یہاں سے جانے کے تیار ہو تو میں وہ رقم تم کو دے دوں گا۔ زیادہ سے زیادہ تین مہینے میں اس علاقے سے چلے جانا۔''

ان لوگوں کے جاتے ہی صابرہ زور زور سے رونے لگی۔ وہ دردانہ کو بری طرح کوس رہی تھی۔ اسے بددعائیں دے رہی تھی۔ جس نے اسے اور صفدر علی کو ساری دنیا میں اور بھی زیادہ ذلیل و خوار کرنے پر کمر باندھ لی تھی۔

صفدر علی، صابرہ کے خجالت آمیز دکھ کو پوری طرح سمجھ رہا تھا۔

''دردانہ کے بارے میں مت سوچو۔'' صفدر علی نے اپنی بیوی کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ جو کچھ کر رہی ہے۔ اسے ویسا کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ تم یہ سوچو کہ ہم کیا کریں..... ہمیں اب کیا کرنا ہے۔''

''میری مانو تو یہاں سے نکل چلو صفدر علی.....!'' شکوراں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں اور خدا معلوم ان کے پیچھے اور کون کون سے خطرناک لوگ موجود ہیں۔ تمہارا چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔''

''یہی بچے تو میری کمزوری بن گئے ہیں۔ خالہ شکوراں.....!'' صفدر علی نے درد بھری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آواز میں کہا۔ ''ورنہ میں اپنی جان دے دیتا یا بشیر الدین اور خیر الدین کی جان لے لیتا، مگر میں ان معصوم بچوں کو یتیم نہیں بنانا چاہتا۔'' آواز اس کے گلے میں پھنسنے لگی۔

''خدا کے لیے ایسی ہولناک باتیں نہ کرو۔'' صابرہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''خدا ہم سب کی جانوں کی حفاظت کرے۔''

انہوں نے فیصلہ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا۔ انہوں نے یہاں سے، ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ صابرہ کی جائیداد کو فروخت کرنے میں زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ نصیر پور میں ہی کچھ لوگ اس جائیداد کو خریدنے کے خواہشمند تھے۔ جائیداد بک تو گئی، لیکن اس کی وہ قیمت نہ مل سکی جو کہ ملنی چاہئے تھی، لیکن جلدی میں جو کچھ مل گیا۔ وہ بھی غنیمت تھا۔

شکوراں نے خود چکوال جا کر بشیر الدین کو اطلاع دی کہ صفدر علی نے اس کی شرط منظور کر لی ہے اور وہ رقم لے کر آ جائے۔ بشیر الدین اور حُسنہ اگلے ہی دن رقم لے کر نصیر پور پہنچ گئے۔

''تم نے بہت صحیح فیصلہ کیا ہے صفدر علی.....!'' بشیر الدین نے کہا۔ ''تمہیں نہیں معلوم یہاں تمہارے کتنے دشمن پیدا ہو گئے ہیں۔''

ان سب لوگوں کو بشیر الدین کے چہرے سے ٹپکتی ہوئی منافقت اور مکاری صاف نظر آ رہی تھی۔

''کراچی چلے جاؤ۔'' بشیر الدین نے صفدر علی کو مشورہ دیا۔ ''اس پیسے سے وہاں کوئی کاروبار کر لینا، وہ بڑا شہر ہے کوئی تمہیں ڈھونڈنا بھی چاہے گا تو نہیں ڈھونڈ سکے گا۔''

کسی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''اور ہاں خالہ شکوراں.....!'' حُسنہ نے کہا۔ ''یہ سب لوگ تو اب یہاں سے چلے جائیں گے۔ تم ایسا کرو تم ہمارے ساتھ چکوال چلو۔ وہاں ہمارے ساتھ رہو۔ تمہیں وہاں بالکل گھر جیسا آرام ملے گا۔ ہمارے گھر کو بھی اپنا ہی گھر سمجھنا۔''

''نہیں حُسنہ.....!'' خالہ شکوراں نے ایک لمحے کے بھی تامل کے بغیر جواب دیا۔ ''میں صابرہ اور صفدر علی کو اگر چھوڑ بھی دوں تو بھی میں ان بچوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میری جان تو ان میں اٹکی ہوئی ہے۔ یہ جہاں بھی جائیں گے۔ میں ان کے ساتھ ہی جاؤں گی۔''

بشیر الدین اور حُسنہ نے بہت چاہا کہ شکوراں ان کے ساتھ چلنے کے لیے راضی ہو جائے، لیکن اس نے صاف طور پر منع کر دیا۔ بشیر الدین اور حُسنہ چلے گئے۔

صفدر علی خود بھی اب اس علاقے سے بہت دور چلا جانا چاہتا تھا۔ یہاں اس نے جس قدر عیش کئے تھے۔ اسی قدر دکھ بھی اٹھائے تھے اور اب تو بس دکھ ہی دکھ تھے۔ چکوال اس کے لیے علاقہ ممنوعہ تھا۔ گوجرانوالہ اس کے لیے جہنم بن گیا تھا اور نصیر پور کی زمین اس پر تنگ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے اہل خاندان کے ساتھ کراچی جانے کا فیصلہ کیا۔

شکوراں کا کوئی دور کا عزیز کراچی میں رہتا تھا۔ اس نے چکوال جا کر اس کا کراچی کا پتہ پہلے ہی معلوم کر لیا تھا اور اسے خط بھی لکھوا دیا تھا۔

شکوراں کا رشتے دار کراچی میں محمود آباد کے علاقے میں کہیں رہتا تھا۔ صفدر علی اس سے پہلے ایک بار کراچی جا چکا تھا اور اسے اس شہر کی ہولناک وسعتوں کا اندازہ تھا، لیکن شکوراں اور صابرہ نے پہلی بار اس شہر کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ یہاں آتے ہی جیسے ان کے ہوش اڑ گئے تھے۔ انہیں یہاں زمین پر چلتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ ان کی خوش قسمتی کہ انہیں جو ٹیکسی ڈرائیور ملا وہ بہت شریف تھا۔ اس نے کافی جدوجہد کے بعد انہیں ان کی مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیا۔ صفدر علی نے سب سے پہلے تو شکوراں کے دور کے رشتے دار کو جس کا نام فیضان تھا، یہ یقین دلا دیا کہ وہ لوگ اس کے گھر رہنے کے لیے نہیں آئے ہیں اور یہ کہ وہ فوری طور پر کرائے کا مکان دلوانے میں ان کی مدد کرے۔ فیضان نے ایک ہفتے کے اندر اندر ان کو محمود آباد میں ہی ایک مکان کرائے پر دلوا دیا۔

صفدر علی کے پاس اچھا خاصا پیسہ تھا جسے وہ کسی کاروبار میں لگانا چاہتا تھا، لیکن دشواری یہ تھی کہ اسے زمینداری کے علاوہ اور کوئی کام آتا ہی نہیں تھا۔ کراچی آ کر اسے گویا نئے سرے سے زندگی شروع کرنی تھی۔

محمود آباد میں اپنے قیام کے تین سال کے دوران اس نے کئی چھوٹے موٹے کاروبار شروع کئے، لیکن ناکامی ہوئی اور اس کی رقم کا بڑا حصہ ڈوب گیا۔ تین سال کے بعد اسے وہ مکان بھی چھوڑنا پڑا کیونکہ مالک مکان کو اس کی خود ضرورت تھی۔

تب صفدر علی نے کورنگی میں ایک کوارٹر خرید لیا اور کرائے کے مکان سے نجات حاصل کر لی۔ وہ سب لوگ کورنگی منتقل ہو گئے۔ صفدر علی کی اپنی حالت خاصی خراب ہو گئی۔ کیونکہ اس تمام عرصے کے دوران اس نے کمایا بہت کم اور گنوایا بہت زیادہ تھا۔

صفدر علی کو لکھنے پڑھنے سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ خود بھی ناخواندہ تھا اور اس نے اپنے بڑے بیٹے منور علی کو بھی نہیں لکھایا پڑھایا تھا۔ اس کی موجودہ بیوی صابرہ کی نظر میں بھی تعلیم کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہی تھی، لیکن اب حالات بہت بدل چکے تھے۔ نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زمینیں تھیں۔ نہ زمینداری تھی۔ دونوں بچوں کو پڑھانا ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ اکبر علی اور حیدر علی کو اسکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ والدین کی دلی خواہش تھی کہ دونوں بیٹے زیادہ سے زیادہ پڑھ لکھ جائیں۔ کراچی آنے کے بعد انہوں نے یہاں ایک بالکل ہی دوسری دنیا دیکھی تھی۔ جس علاقے میں آ کر انہوں نے قیام کیا تھا۔ وہ کم آمدنی والوں اور غریبوں کی آبادی والا علاقہ تھا۔ مگر یہاں بیشتر گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیاں اسکول جاتے تھے اور یہی حال کورنگی کا بھی تھا۔ یہاں بھی غریب سے غریب خاندانوں کے بچے جن میں لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ اسکولوں میں پڑھتے تھے اور جو لڑکے اسکول نہیں جاتے تھے۔ وہ کوئی نہ کوئی ہنر سیکھنے کے لیے کسی جگہ سے وابستہ ہو جائے تھے۔

لیکن صفدر علی کے دونوں بیٹوں نے اپنے والدین کو سخت مایوس کیا۔ ان دونوں کا دل لکھنے پڑھنے میں بالکل نہیں لگتا تھا۔ شاید یہ خصوصیت انہیں اپنے والدین سے ملی تھی۔

صفدر علی کچھ چھوٹے موٹے کام کر کے گھر کا خرچہ چلاتا رہا، لیکن وہ کوئی بھرپور کامیاب اور نفع بخش کاروبار نہ کر سکا۔ اس نے کافی رقم ایک انوسٹمنٹ کمپنی میں لگائی تھی۔ وہ کمپنی کراچی کے لوگوں سے لاکھوں روپے کا سرمایہ سمیٹ کر راتوں رات بھاگ گئی۔ ہزاروں متاثرین کی طرح صفدر علی بھی کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔

مالی خسارے سے کہیں زیادہ سنگین اور مایوس کن خسارہ اس کے دونوں بیٹوں نے اس کے لیے فراہم کیا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی پڑھنے لکھنے کا شوقین نہیں نکلا۔ بڑا بیٹا اکبر علی ساتویں جماعت میں آ کر رک گیا اور اس نے مزید آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ چھوٹا حیدر علی اس سے ذرا سا آگے بڑھ گیا اور آٹھویں تک پہنچ کر اس نے بھی اسکول جانے سے معذرت کر لی۔ صفدر علی اور صابرہ نے بہت چاہا کہ دونوں بیٹے کم از کم میٹرک تو کر ہی لیں، لیکن انہوں نے اپنا تعلیمی سفر چھوٹے درمیانی اسٹیشنوں پر ہی ختم کر دیا۔ صفدر علی کی مایوسی اور نامرادی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ زندگی کی ہر بازی میں جیسے مات ہی اس کا مقدر تھی۔

دونوں لڑکوں نے الگ الگ طرح کے کام سیکھنے شروع کر دیئے۔ اکبر علی چوڑیاں بنانے والے ایک چھوٹے سے کارخانے میں کام کرنے لگا اور حیدر علی ایک پرنٹنگ پریس میں کام کرنے لگا۔ صفدر علی اور صابرہ کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ اپنے چھوٹے بیٹوں کے لیے تو وہ دونوں بہت بڑے بڑے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ نئے حالات کے تقاضوں کے تحت بدلے ہوئے وہ خواب تھے جو انہوں نے اپنے بڑے بیٹوں کے لیے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ شاید تب انہوں نے ان خوابوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی، لیکن اب

ان خوابوں کی ضرورت تھی، لیکن یہ خواب کوئی واضح شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ کر منتشر ہو گئے۔

شکوراں اس خاندان کے ایک مستقل رکن کی حیثیت سے ان لوگوں کے ساتھ تھی۔ وہ اپنے شہر سے سارے ناتے توڑ کر اب گویا مستقل طور پر کراچی ہی سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھی۔ محمود آباد اور اس کے بعد کورنگی کے علاقے میں رہتے ہوئے وہ خالہ شکوراں کے نام سے مشہور ہوتی گئی اور چھوٹے بڑے سارے ہی لوگ اسے خالہ شکوراں کہتے تھے۔ شکوراں کے محلے کے بیشتر گھروں سے بہت اچھے مراسم تھے اور اپنی خصوصی افتادِ طبع اور مزاجی آہنگ کے باعث اسے کافی مقبولیت حاصل تھی۔

اکبر علی اور حیدر علی اب کام سیکھتے تھے اور کام کرتے تھے۔

صفدر علی اپنے شکستہ درماندہ وجود کے ساتھ کارزارِ حیات میں مسلسل معرکہ آرائی میں مصروف تھا۔ وہ اور صابرہ دونوں اب عمر کی اس منزل میں تھے جہاں انہیں مکمل آرام اور سکون کی ضرورت تھی، لیکن گردشِ حالات نے ان سے سکون و اطمینان چھین لیا تھا۔ دونوں تیزی سے بوڑھے ہو رہے تھے اور عیش و آرام سے بھرپور جوانی کا دور گزارنے کے بعد سن رسیدگی اور بڑھاپے کے عالم میں ایک غم ناک زندگی بسر کر رہے تھے۔ چکوال اور نصیر پور سے ان کا کوئی براہِ راست رابطہ نہیں تھا۔ اگر کبھی کبھار کوئی اطلاع مل جاتی تھی تو وہ صرف شکوراں کے رشتے دار فیضان کے ذریعے جو دو تین سال بعد ایک بار چکوال کا چکر لگا لیتا تھا۔ اسی کی زبانی معلوم ہوا کہ بشیر الدین اور اس کی بیوی حُسنہ خوب ٹھاٹھ سے چکوال میں زندگی گزار رہے ہیں اور ان کا بیٹا خیر الدین گوجرانوالہ میں اپنی بیوی دردانہ کے ساتھ رہ رہا ہے اور بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا گیراج چلا رہا ہے۔ شکوراں ہی فیضان اور اس کے گھر والوں سے رابطہ رکھتی تھی اور ان کے پاس کبھی کبھار آتی جاتی رہتی تھی۔ اسی کے ذریعے کچھ خبریں ملتی رہتی تھیں۔

گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ سب کچھ بہت تیزی کے ساتھ بدلتا گیا۔ اس میں صفدر علی اور صابرہ کے لیے خوشیوں کا کوئی خزانہ موجود نہیں تھا۔ ان دونوں کے روز و شب زندگی کے ساتھ کی گئی اس جبری مفاہمت کے تحت گزر رہے تھے، جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

دونوں بیٹوں کی جوانی، صفدر علی اور صابرہ کی تیزی سے بڑھتی ہوئی کہن سالی کی علامت تھی۔ فی الحقیقت وہ دونوں بیٹے ان کے پوتوں اور نواسوں کی عمر کے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکبر علی نے کراچی میں ہی چوڑیاں بنانے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ قائم کرلیا تھا، لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ حیدر آباد منتقل ہوگیا جہاں چوڑیاں بنانے کے کاروبار کی ترقی کے زیادہ امکانات تھے اور کاریگر وغیرہ بھی بہ آسانی مل جاتے تھے۔ اس نے حیدر آباد میں ہی ایک لڑکی پسند کرلی اور اس کے ساتھ شادی کرلی۔ صفدر علی اور صابرہ کو اس بات کا بہت غم تھا کہ اکبر علی نے ان دونوں بڈھے، بڑھیا کو اپنی زندگی سے نکال باہر کیا تھا۔

اکبر علی کی شادی کے کوئی سال بھر بعد صفدر علی کا انتقال ہوگیا۔ صابرہ ایک بار پھر بیوہ ہوگئی۔ صابرہ نے خود تو اپنی بیٹی دردانہ کو اس سلسلے میں اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا۔ نصیر پور سے آنے کے بعد اس کا اپنی بیٹی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ دردانہ نے خود بھی کبھی ماں اور سوتیلے باپ اور بھائیوں سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے اپنے لیے جو ایک الگ دنیا تعمیر کرلی تھی۔ اس میں اس نے ان لوگوں کا داخلہ بند کر رکھا تھا۔ تاہم شکوراں نے فیضان سے کہہ کر دردانہ کو گوجرانوالہ ایک خط لکھوا دیا تھا۔ جس میں اسے اس سانحے کی اطلاع دی گئی تھی۔ دردانہ نے تو اس خط کا جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھا البتہ اس کے شوہر خیر الدین نے ضرور اپنے ماموں کی موت پر اپنی بیوہ ممانی کو چند سطروں پر مشتمل ایک تعزیتی خط فیضان کے ذریعے بھیج دیا تھا اور یوں یہ قصہ ختم ہوگیا۔

صفدر علی کے انتقال کے تقریباً ایک سال کے بعد حیدر علی کی بھی شادی ہوگئی۔ اس کی شادی اسی علاقے کے ایک گھرانے میں ہوئی تھی اور دونوں خاندانوں میں برسوں پرانا میل جول اور آنا جانا تھا۔ لڑکی کا نام زرینہ تھا۔ زرینہ کا خاندان کورنگی میں ہی ایک عرصہ دراز سے رہ رہا تھا۔

صفدر علی کا خاندان چونکہ ایک طویل زمانے سے کورنگی میں رہ رہا تھا اور اس کے دونوں بیٹے کورنگی کی گلیوں میں ہی کھیل کود کر جوان ہوئے تھے۔ اس لیے شادی کے سلسلے میں کسی نے بھی اس خاندان کے متعلق کسی تفتیش اور چھان بین کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لڑکے کماؤ پوت تھے، بس یہ کافی تھا۔

حیدر علی کی شادی کے چند ماہ کے بعد ہی ایک روز فیضان نے شکوراں کو پیشکش کی کہ وہ کچھ عرصے کے لیے چکوال چلی جائے۔

چکوال میں فیضان کی ایک عزیزہ کو جو حاملہ تھی اور اکیلی تھی۔ کسی ایسی عورت کی کچھ عرصے کے لیے ضرورت تھی جو اس کے گھر کی دیکھ بھال کرسکے۔

فیضان نے شکوراں سے کہا کہ صرف تھوڑے عرصے کی بات ہے اور زچگی کے کچھ

دنوں کے بعد وہ واپس کراچی آسکتی ہے۔

شکوراں جب سے کراچی آئی تھی۔ ایک دن کے لیے بھی اپنے شہر واپس نہیں گئی تھی۔ حالانکہ اس کا دل بہت تڑپتا تھا کہ وہ کچھ دن کے لیے چکوال چلی جائے، لیکن صفدر علی اور اس کے خاندان کے ساتھ اس کی وابستگی اس قدر گہری تھی اور اس نے ان سب لوگوں کو اپنی زندگی میں اس قدر زیادہ شامل کرلیا تھا کہ وہ تھوڑے دنوں کے لیے بھی ان سے الگ نہیں رہی تھی۔ بس سوچتی ہی رہ گئی اور وقت گزرتا چلا گیا۔ اب جو فیضان کی طرف سے اس کو پیشکش ہوئی تو یکبارگی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے اس پیشکش کی منتظر تھی۔ اس پر ایک شدید ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی اور اسے ایسا لگا کہ وہ اب چکوال جائے بغیر زندہ ہی نہ رہ سکے گی۔

ویسے بھی صابرہ کے پاس اب اس کی بہو زرینہ موجود تھی جو اپنی بوڑھی ساس کا کافی خیال رکھتی تھی۔ شکوراں نے چکوال جانے پر فوری آمادگی ظاہر کردی اور صابرہ کو یقین دلایا کہ وہ چند ماہ کے بعد واپس آجائے گی۔ صابرہ رونے لگی۔

''خالہ شکوراں.....! چکوال جاؤ گی تو وہاں لوگوں سے پوچھنا شاید میرا فرید کبھی وہاں واپس آیا ہو۔ شاید اس نے کبھی مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی ہو۔''

صابرہ ویسے تو اکثر اپنے گم گشتہ بیٹے کے بارے میں سوچا کرتی تھی، لیکن صفدر علی کی موت کے بعد سے وہ اس کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچتی تھی۔

اکبر علی اور حیدر علی کی بیویوں کو اپنی سسرال کے پیچیدہ خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ خود ان کے شوہروں کو بھی ان تمام واقعات کی تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ انہیں بس اتنا معلوم تھا کہ یہ ان کے باپ اور ماں دونوں کی دوسری شادی تھی اور ان کی کوئی سوتیلی بہن بھی ہے جو گوجرانوالہ میں رہتی ہے، لیکن وہ ان لوگوں سے نہیں ملتی۔ زندگی کی بے تحاشا بھاگ دوڑ اور تیز رفتار گزران وقت کے تلاطم میں کسی کو اس کی فرصت نہیں تھی کہ گڑے مردے اکھیڑے اور نہ ہی کسی کو اس بات سے کوئی دلچسپی تھی۔ اکبر علی اور حیدر علی کو چکوال میں مدفون اپنے ماضی سے کچھ نہیں لینا تھا۔ ان کے لیے تو زندگی صرف وہی تھی جس کا آغاز انہوں نے کراچی سے کیا تھا۔

شکوراں کو گئے ہوئے چند ماہ کا عرصہ گزرا تھا کہ صابرہ اچانک سخت بیمار ہوگئی۔ کوئی خاص بیماری نہیں تھی۔ صرف ضعیف العمری کے متعدد عوارض تھے جنہوں نے یکجا ہو کر اسے بستر سے لگا دیا اور وہ اپنے ناتواں جسم کے ساتھ یہ جنگ زیادہ دنوں تک نہیں لڑ سکی۔ حیدر علی کی شادی کے چند سال بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ شکوراں اس وقت نصیر پور میں تھی۔ فیضان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے اس کو مطلع کروادیا۔شکوراں کے لیے یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔اس نے اپنی زندگی کا سب سے زیادہ طویل عرصہ صابرہ کے ساتھ گزارا تھا۔وہ صابرہ کی زندگی کے تمام اسرار و رموز سے واقف تھی اور وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی زندگی میں پوری طرح سے شریک تھیں۔صفدر علی اور صابرہ کے دونوں بیٹے شکوراں کی گودوں کے کھلائے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں کے سامنے پل کر جوان ہوئے تھے۔شکوراں کے لیے تو وقت یکساں تھا۔نہ برا تھا، نہ بھلا تھا۔بس ایک ہی رفتار تھی اور ایک ہی انداز تھا۔جس کے ساتھ زندگی گزرتی چلی جارہی تھی، لیکن صابرہ کے لیے تو وقت نے کتنے پینترے بدلے تھے اور شکوراں اس وقت سے صابرہ کے بُرے اور بھلے وقت کی ساتھی اور رازداں رہی تھی۔جب سے صابرہ بیاہ کر صفدر علی کے گھر آئی تھی۔تب سے کتنے برس گزر گئے تھے اور ان برسوں میں صابرہ نے دکھوں کے کیسے کیسے عذاب جھیلے تھے۔ان سارے عذابوں کے دوران شکوراں قدم بقدم اس کے ساتھ رہی تھی۔زندگی کا کتنا لمبا سفر تھا جو شکوراں نے صابرہ کے ساتھ طے کیا تھا اور اب صابرہ کی اچانک موت کی اطلاع نے شکوراں کے وجود کو شکست وریخت کا شکار بنادیا۔

اسے صابرہ کی موت کی اطلاع تقریباً ایک مہینے کے بعد مل سکی تھی۔بہت سوچنے کے بعد شکوراں نے یہ طے کیا کہ وہ فی الحال کراچی نہیں جائے گی۔پہلے تو اس کا پکا ارادہ یہ تھا کہ نصیر پور میں فیضان کی رشتے دار خاتون کے ہاں زچگی کے کچھ عرصے کے بعد وہ واپس کراچی لوٹ جائے گی۔وہ صابرہ سے بھی وعدہ کر کے آئی تھی لیکن اب تو صابرہ ہی نہیں رہی تھی۔کراچی میں اس گھر میں اب صرف حیدر علی اور اس کی بیوی زرینہ تھے۔زرینہ کے ساتھ شکوراں کی صرف چند ماہ کی جان پہچان تھی اور شکوراں کو بخوبی احساس تھا کہ وہ زرینہ کی ضرورت نہیں ہے۔زرینہ کے اپنے لوگ موجود تھے۔رہ گیا حیدر علی جو شکوراں کے لیے بیٹوں کی طرح تھا تو اس کا کام بھی شکوراں کے بغیر بآسانی چل سکتا تھا اور چل رہا تھا۔ان حالات میں شکوراں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ فی الحال کراچی نہیں جائے گی، کیونکہ نصیر پور اور چکوال میں اس کی ''مانگ'' بہت زیادہ تھی۔آئے دن کسی نہ کسی گھر سے اسے بلاوا آتا رہتا تھا کہ وہ آکر ساتھ رہے اور گھر کے امور میں ہاتھ بٹائے۔کئی گھرانے تو اس کو کھانے، کپڑے اور رہائش کے ساتھ ساتھ ماہانہ رقم بھی فراہم کرنے کے لیے تیار تھے۔چنانچہ شکوراں وہیں رک گئی اور آنے والے برسوں کے دوران وہ نصیر پور سے چکوال اور چکوال سے نصیر پور کے درمیان گھومتی رہی۔اس دوران کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ کراچی چلی جائے۔کچھ دنوں کے لیے ہی سہی، لیکن چکوال اور نصیر پور کے ''ضرورت مندوں'' نے اس

کو اس کا موقع ہی نہیں دیا۔وہ اپنی موہوم سی خواہش کے باوجود کراچی جا سکی۔

صابرہ کے انتقال کی خبر شکوراں کو ایک ماہ بعد ملی تھی۔اس کے بعد شکوراں نے اس کی بیٹی دردانہ کو گوجرانوالہ میں ایک خط کے ذریعے اس کی ماں کی موت کی خبر پہنچوادی اور ساتھ ہی اپنا موجودہ پتہ بھی لکھوادیا کہ اگر دردانہ چاہے تو اس پتے پر اسے خط لکھ دے۔کچھ دنوں کے بعد اسے دردانہ کا جواب موصول ہوگیا تھا۔دردانہ نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا کہ اس نے اس کو اس کی ماں کی موت کی اطلاع دے دی۔تاہم اس نے ایسا کچھ نہیں لکھا تھا کہ وہ کبھی کراچی جا کر اپنے سوتیلے بھائیوں سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔

شکوراں پھر کراچی نہیں گئی۔وہ چکوال اور نصیر پور میں ہی رہی۔کتنے برس گزر گئے۔صابرہ تو اب زندہ نہیں تھی۔پھر بھی شکوراں نے چکوال میں اکثر لوگوں سے فرید کے بارے میں دریافت کیا، لیکن بیشتر لوگ تو اب اس نام سے بھی واقف نہیں تھے۔یہ تو بہت پرانی ایک بھولی بسری داستان تھی۔فرید کا کچھ پتہ نہیں چلا اور اس سے فرق بھی کیا پڑتا تھا۔اگر فرید کا کوئی پتہ چل بھی جاتا تو شکوراں کس کو اس کے بارے میں بتاتی؟ دردانہ نے تو اپنی سگی ماں تک کو چھوڑ دیا تھا۔بچپن میں گم ہوجانے والے ناپسندیدہ بھائی سے اسے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔

☆======☆======☆

فرید جب اپنے باپ کی تازہ تازہ قبر پر بہت دیر تک آنسو بہا چکا تو تھکے تھکے قدموں سے قبرستان سے باہر نکل آیا۔باپ کی قبر کی مٹی کی نم آلود اور دردانگیز مہک اس کے دماغ میں بسی ہوئی تھی۔وہ باپ کی قبر کی مٹی کی اس خوشبو کو اپنے وجود میں بسا کر لے جارہا تھا۔اس کے پاس یہاں سے لے جانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔باپ کی کوئی اور یادگار اس کے پاس نہیں تھی۔وہ گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جارہا تھا اور اس نے وہاں سے کچھ نہیں لیا تھا۔اس کے جسم پر جو کپڑے تھے۔وہ انہی کے ساتھ گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔وہ اپنی ماں بہن اور کے قاتل چہروں سے صرف خوفزدہ ہی نہیں تھا۔وہ ان سے شدید طور پر متنفر بھی تھا۔وہ اب دوبارہ اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

وہ بغیر سوچے سمجھے منہ اٹھا کر ایک طرف کو چل دیا۔

وہ جلد از جلد اس علاقے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔اسے خوف تھا اپنی ماں اور بہن کی طرف سے صفدر علی کے آدمیوں کی طرف سے کہ وہ لوگ ضرور اس کو پکڑنے کی کوشش کریں گے۔

چلتے چلتے سہ پہر ہوگئی۔سیدھی سڑک پر چلتے ہوئے وہ ٹرکوں اور بسوں کے ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اڈے پر پہنچ گیا۔ بھوک اور پیاس کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ یہاں اڈے پر کئی ہوٹل تھے اور خاصی چہل پہل تھی۔ کئی ٹرک بھی کھڑے ہوئے تھے۔ فرید نے سب سے پہلے تو المونیم کا پانی سے بھرا ہوا ایک جگ اٹھا کر کئی گلاس پانی پیا اور پھر ہوٹل سے اٹھنے والی کھانوں کی بے تاب کر دینے والی خوشبو سے مغلوب ہو کر ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے آدمی کے پاس پہنچ گیا۔

''مجھے ایک وقت کا کھانا دے دو۔'' اس نے کاؤنٹر والے آدمی سے کہا۔ ''اس کے بدلے میں تم جو کام کہو گے۔ میں کر دوں گا۔''

اس کی بات قریبی چارپائی پر بیٹھے ہوئے آدمیوں نے بھی سن لی۔ وہ دو تھے اور کھانا کھا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اسے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

''گھر سے بھاگ کر آئے ہو یا نکالے گئے ہو؟'' اس نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

''میں گھر واپس نہیں جانا چاہتا۔'' فرید نے گول مول سا جواب دیا۔ ''میرا باپ زندہ نہیں ہے اور میں اپنی ماں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔''

''چلو کوئی بات نہیں۔'' اس شخص نے کہا۔ ''تم ہمارے ساتھ رہو..... ہم لوگ ٹرک ڈرائیور ہیں۔ دنیا بھر میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ رہنا، تم کو ٹرک چلانا سکھا دیں گے..... آؤ کھانا کھاؤ۔''

بھوک سے بلبلاتا ہوا فرید فوراً ہی کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ وہ دونوں آدمی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا شخص ان دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

دونوں ٹرک ڈرائیوروں میں سے ایک کا نام عظمت اور دوسرے کا نام توصیف تھا۔ فرید نے ان کے ساتھ رہنا اور ٹرک میں سفر کرنا شروع کر دیا۔ اسے سب سے بڑا اطمینان اس بات کا تھا کہ ان دونوں نے اس کے بارے میں زیادہ چھان بین نہیں کی تھی۔ فرید کسی سے بھی اپنے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لیکن ان ڈرائیوروں کے ساتھ فرید کا قیام دس بارہ دن سے زیادہ نہ رہ سکا۔ اس رات وہ لوگ ایک گاؤں میں عظمت کے کسی جاننے والے کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اچانک سوتے سے فرید کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے مدہم روشنی میں عظمت کو اپنے اوپر جھکا ہوا پایا۔ عظمت کے منہ سے عجیب قسم کی بو آ رہی تھی۔ فرید کی چھٹی حس نے اسے ایک نامعلوم خطرے سے آگاہ کر دیا۔

اس نے عظمت کو ایک طرف دھکیل دیا۔ غصے اور نفرت کی فراوانی نے اس کے

چھوٹے سے جسم میں بلا کی قوت پیدا کر دی تھی۔ جب تک شراب کے نشے میں مدہوش عظمت دوبارہ سنبھل سکے، فرید وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور گھر سے نکل کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔ اس کے رگ و پے میں ایک آگ لگی ہوئی تھی اور اسے دنیا کی ہر چیز سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا کا ہر شخص صرف اس پر ظلم کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔

ٹرک والوں کے ساتھ رہنے کے دوران ایک روز اس نے ان لوگوں کو کسی شخص سے فیصل آباد کے بارے میں باتیں کرتے سنا تھا جو ایک ایسا شہر تھا جہاں بہت سے کارخانے اور مشینیں لگی ہوئی تھیں اور لوگوں کو کام مل جاتا تھا۔ فرید کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی طرح فیصل آباد چلا جائے۔ اس کے پاس کچھ رقم موجود تھی جو اسے ٹرک والوں نے دی تھی۔ رات بھر بھاگتے رہنے کے بعد وہ کسی اور نامعلوم جگہ پہنچ گیا۔ یہاں سے اسے فیصل آباد کے لیے بس مل گئی۔ کرائے کی رقم اس کے پاس تھی۔ وہ فیصل آباد روانہ ہو گیا۔ سارے راستے وہ خوف سے لرزتا رہا۔ کہیں ٹرک والے اسے ڈھونڈتے ہوئے نہ آ جائیں۔ اس کے پاس ایک چادر تھی۔ جس سے وہ اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

فیصل آباد پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ وہ تو اس کے چکوال کے مقابلے میں بہت بڑا شہر تھا۔ سڑکوں پر بے شمار انسان چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے اور گاڑیوں کی بھرمار تھی۔ وہ اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا اور ٹرک والوں کے خوف سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر پایا تھا کہ اسے ایک جگہ ایک سائبان کے نیچے لگی ہوئی مشینوں پر کئی کم عمر اور نوجوان لڑکے کڑھائی کا کام کرتے ہوئے نظر آئے۔ ان میں اس کی اپنی عمر کے لڑکے بھی شامل تھے۔ وہ کچھ دیر رک کر انہیں کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اگر یہ لڑکے یہ کام کر سکتے ہیں تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ اس کے دل کے اندر سے ایک آواز بلند ہوئی۔ ایک عمر رسیدہ خرانٹ قسم کا آدمی اندر موجود تھا۔ اس نے کڑی نظروں سے فرید کو گھورا۔ ''کیا ہے.....؟''

''میں..... میں کام کرنا چاہتا ہوں۔'' فرید نے دبے لفظوں میں کہا۔

اس آدمی کی نظریں کچھ اور کڑی ہو گئیں۔ اس نے فرید سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کر دی۔ فرید کے پاس بتانے کے لئے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

کارخانے کے چالاک اور عیار مالک نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ گھر سے بھاگا لڑکا ہے۔ ایسے مجبور اور بے سہارا لڑکے تو بہت کم اجرت پر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔اس نے اس کو کام پر رکھ لیا اور اس سے بہت کم اجرت پر جو وہ دوسرے سیکھنے والے لڑکوں کو دیتا تھا۔فرید نے سب کچھ قبول کرتے ہوئے اس سے درخواست کی کہ اسے رہنے کے لیے بھی کوئی ٹھکانہ فراہم کر دیا جائے۔کارخانے کے مالک عبدالصمد نے اس کو اپنے گھر کی ایک بیرونی کوٹھری میں جو خالی پڑی تھی۔رہنے کی جگہ دے دی۔اس طرح کارخانے کا کام ختم ہو جانے کے بعد وہ اور اس کی بیوی رات گئے تک فرید سے مختلف گھریلو کام بھی لے سکتے تھے۔

عبدالصمد ایک بہت ہوشیار کاریگر تھا اور وہ اپنے شاگردوں کو بھی زیادہ سے زیادہ اچھا ہنرمند بنانا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کے لیے بہتر طور پر کام کر سکیں۔فرید نے دل لگا کر کام سیکھا اور جلدی ہی وہ مشینوں کے ذریعے کڑھائی کا کام اچھی طرح سیکھ گیا۔

لیکن یہ جگہ اس کو ایک عقوبت خانہ لگتی تھی۔دن بھر کارخانے میں کام کرنے کے بعد رات گئے تک عبدالصمد اور اس سے زیادہ اس کی بیوی اسے گھر کے مختلف کاموں میں لگائے رکھتے تھے۔جس کے لیے اس الگ سے کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔اسے ناشتہ اور کھانا بھی اسی گھر میں ملتا تھا۔جس کی اس سے قیمت وصول کی جاتی تھی۔نتیجہ یہ تھا کہ جو وہ کماتا تھا۔وہ تقریباً سب کا سب یہیں برابر ہو جاتا تھا اور وہ بہت تھوڑے سے پیسے بچا پاتا تھا۔

ساتھ کام کرنے والے لڑکوں میں سے کسی سے بھی اس کی دوستی نہیں تھی۔وہ خود کو سب سے الگ تھلگ رکھتا تھا اور کسی کو بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا تھا۔سوائے اس کے کہ اس کا باپ مر چکا ہے اور وہ اپنی ماں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تھا۔وہ اپنے تمام دردِ محرومی اور خوف کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔جیسے جیسے اس کا شعور زیادہ پختہ ہوتا جاتا تھا۔ویسے ویسے یہ جان لیوا احساس اس کے دل میں زیادہ شدید ہوتا جاتا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ صرف حد درجہ اذیت ناک ہی نہیں۔بلکہ ناقابل برداشت طور پر شرم ناک بھی ہے اور اس شرم ناک داستان کو وہ کبھی بھی اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا۔بلکہ اس سارے کرب کو اپنے سینے کے اندر سمیٹے ہوئے گھٹ گھٹ کر جی رہا تھا اور جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا ویسے ویسے اس کے ذہن کے دریچے زیادہ روشن ہوتے جاتے تھے۔جیسے جیسے انسانی رشتوں کے جملہ اسرار و رموز اور ان کی نزاکتیں اس پر زیادہ سے زیادہ منکشف ہوتی جاتی تھیں۔ویسے ویسے اس کا ذلت، شرمندگی، تنہائی اور محرومی کا احساس زیادہ سے زیادہ شدید ہوتا جاتا تھا۔اس کے ذہن کے پردے پر ایک تصویر تقریباً ہمہ وقت مسلط رہتی تھی۔یہ صفدر علی کی تصویر تھی..... ایک خونی منظر بار بار اس کی

نظروں کے سامنے ابھرتا تھا..... صفدر علی اس کے باپ پر چھری سے وار کر رہا ہے۔وہ اپنے باپ کی مدد کے لیے دوڑتا ہے، لیکن اس کی ماں اور بہن اس کو سختی کے ساتھ پکڑ لیتی ہیں اور آگے بڑھنے سے روک دیتی ہیں اور صفدر علی چھری کے پیہم وار کرتا جا رہا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس منظر کی ہر تفصیل اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو جاتی اور صرف ایک چہرہ باقی رہ جاتا جو پھیل کر بڑا ہو جاتا اور پورے منظر پر حاوی ہو جاتا..... یہ صفدر علی کا چہرہ تھا..... ایک قابل نفرت چہرہ.....! اس چہرے کو مردہ حالت میں اپنے جوتوں سے مسلنے کی خواہش اس کی زندگی کی سب سے زیادہ توانا اور بھرپور خواہش تھی۔اسی سلگتی ہوئی خواہش اور شرمندگی کے اندھے بوجھ کے تلے دبا ہوا اپنی داستان حیات کے خوں چکاں اوراق کو دنیا کی نظروں سے چھپائے ہوئے وہ زندگی کے تنہا جنگل میں بھٹک رہا تھا۔

دو سال تک تو وہ عبدالصمد کے کارخانے میں کام کرتا رہا، لیکن پھر اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔وہ اب یہاں مزید نہیں رہ سکتا تھا۔اس جگہ سے اس نے کبھی بھی کوئی وابستگی محسوس نہیں کی تھی۔تاہم اتنا ضرور ہوا تھا کہ یہاں رہ کر وہ ایک اچھا کاریگر بن گیا تھا اور اب کسی بھی دوسری جگہ کام کر سکتا تھا۔وہ اس شہر سے بھی خوب واقف ہو چکا تھا اور اجنبیت کا وہ احساس جو شروع شروع میں اس پر شدت کے ساتھ غالب رہتا تھا۔اب ختم ہو گیا تھا۔اس نے عبدالصمد کے کارخانے میں یکلخت کام چھوڑ دیا۔عبدالصمد حیران رہ گیا۔وہ اس کارآمد ملازم سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔اس نے فوراً ہی اس کے پیسے بڑھانے پر آمادگی ظاہر کر دی، لیکن فرید نے سختی کے ساتھ انکار کرتے ہوئے وہاں سے کام چھوڑ دیا اور ایک دوسری جگہ کام کرنے لگا۔یہاں اس نے تقریباً ڈھائی سال تک کام کیا۔پھر وہ کارخانہ بند ہو گیا اور وہ ایک تیسری جگہ ملازم ہو گیا۔اس کو اب زیادہ پیسے مل رہے تھے۔یہاں سے کچھ دور واقع موچیوں کے ایک باڑے میں ایک کوٹھری میں اسے رہنے کی جگہ بھی مل گئی۔یہاں وہ تھوڑا بہت کھانا بھی پکا لیتا تھا اور ایک وقت کا کھانا ہوٹل سے کھا لیتا تھا۔نئے کارخانے میں بھی اس کی کسی سے دوستی نہیں تھی۔لوگوں کے ساتھ اس کے تعلقات قطعی طور پر مشینی نوعیت کے تھے۔ان میں کسی بھی نوعیت کی دلی اور جذباتی وابستگی شامل نہیں تھی۔

روز رات کو جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹتا تو اس کی آنکھوں کے سامنے وہی ایک جانا پہچانا منظر ابھرتا اور پھر وہ سارا منظر سکڑتے سکڑتے غائب ہو جاتا اور صرف ایک چہرہ اس پورے منظر کی جگہ لے لیتا..... وہی ایک منحوس اور قابل نفرت چہرہ جسے مردہ حالت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اپنے جوتوں سے مسلنے کی خواہش اس کی زندگی کی سب سے زیادہ توانا اور بھرپور خواہش تھی اور اس ایک خواہش کے علاوہ باقی تمام خواہشیں دم توڑ چکی تھیں۔ اس کا وجود ایک پتھر میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔

وقت گزر رہا تھا اور اسے مزید وقت گزرنے کا انتظار تھا..... وہ اپنے پتھر وجود کی ساری توانائیوں کو آنے والے وقت کے لیے مجتمع کر رہا تھا۔ جب اس کے پاؤں اتنے مضبوط اور طاقتور ہو جائیں گے وہ ان سے اس چہرے کو مردہ حالت میں مسل سکے جو ہر رات اس کی نظروں کے سامنے ابھرتا تھا۔

اسے اس تیسرے کارخانے میں کام کرتے ہوئے تقریباً ڈھائی سال کا عرصہ گزر چکا تھا کہ اچانک اس کے پتھر جیسے وجود میں ایک ایسے نرم احساس نے سر ابھارنا شروع کر دیا۔ جس سے وہ بالکل ناواقف تھا اور اس احساس کو جنم دینے والی ایک نوعمر لڑکی فیروزہ تھی جو باڑے کے مالک عطاء اللہ کی بیٹی تھی۔

باڑے کا مالک عطاء اللہ قریب ہی رہتا تھا اور وہ خاصا خوشحال آدمی تھا۔ اس کی ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ فیروزہ بھائیوں سے بڑی تھی اور وہ عمر کی اس منزل سے گزر رہی تھی جب آنکھوں میں خود بخود رنگا رنگ خواب اترنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ فرید سے دو ایک سال چھوٹی تھی۔

فرید خود بھی اب ایک نوجوان لڑکا تھا اور زندگی کے اس دور میں داخل ہو چکا تھا جب ہر لڑکی اچھی اور پیاری لگتی ہے اور اس سے باتیں کرنے کو، ہنسنے کو، اس کے پاس بیٹھنے کو جی چاہتا ہے، لیکن فرید کے دل میں ابھی تک ایسی کوئی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی۔

فیروزہ اپنے باپ کے ساتھ اور اس کے بغیر بھی باڑے میں آتی رہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ باڑے کی ایک الگ تھلگ کوٹھری میں رہنے والا فرید نامی نوجوان کڑھائی کا کاریگر ہے اور ایک کارخانے میں کام کرتا ہے۔ فرید سے کبھی کبھار اس کی ایک آدھ بات بھی ہو جاتی تھی۔ اس روز فیروزہ کڑھائی کا ایک نمونہ لے کر فرید کے پاس اس کی کوٹھری میں آ گئی۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ فرید سے کوئی بات کرنے کے لیے خود اس کی کوٹھری میں آئی تھی۔ فرید اس کی آمد سے ایک دم سٹپٹا گیا، لیکن فیروزہ بالکل سٹپٹائی ہوئی نہیں تھی۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ فرید سے بات کر رہی تھی۔

''یہ کڑھائی دیکھو فرید.....!'' اس نے کہا۔ ''کیا تم اپنے کارخانے میں مشین پر ایسی کڑھائی کا کام بنا سکتے ہو؟''

''بالکل بنا سکتا ہوں۔'' فرید نے کڑھائی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اس میں کیا مشکل ہے؟''

''تو مجھے بنا کر دو۔'' فیروزہ نے ایک میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ سیدھی نظروں سے فرید کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں..... بنا دوں گا۔'' فرید نے کہا۔ ''تم کپڑا دے دینا، تاگوں کے رنگ بتا دینا۔''

''رنگ بالکل یہی ہوں گے جو میں تم کو دکھا رہی ہوں۔'' فیروزہ نے کہا۔ ''کپڑا میں تم کو کل لا کر دے دوں گی۔''

فیروزہ چلی گئی۔ بہت دنوں کے بعد فرید کو کوئی چیز اچھی لگی تھی اور وہ تھا فیروزہ کا آنا۔ اگرچہ اس میں بظاہر ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی، لیکن فرید کو یہ اچھا لگا تھا۔

اگلے دن فیروزہ دوبارہ اس کے پاس آئی۔ آج وہ دوسرے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ فرید نے پہلی بار اس کے کپڑوں پر غور کیا اور اسے فیروزہ ان کپڑوں میں کل سے زیادہ اچھی لگی۔ فیروزہ اپنے ساتھ وہ کپڑا لے کر آئی تھی جس پر کڑھائی مطلوب تھی۔ آج وہ کچھ زیادہ دیر تک رکی اور فرید کو اپنی مطلوبہ کڑھائی کے بارے میں، رنگوں اور ڈیزائن کے بارے میں بتاتی رہی۔

فرید نے اگلے ہی دن فیروزہ کے کپڑے پر کڑھائی کر دی اور شام کو فیروزہ کپڑا لینے آ گئی۔ فرید کو اس کا انتظار تھا۔ انتظار کی کیفیتوں کا تجربہ فرید کو اس سے پہلے بھی بارہا ہوا تھا، لیکن یہ کیفیت تو بہت مختلف لگ رہی تھی۔ اس میں ایک عجیب سی نامعلوم سی تڑپ شامل ہو گئی تھی۔ یہ کوئی بوجھل، اکتا دینے والی اور بیزار کن کیفیت نہیں تھی۔ بلکہ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جس میں آرزومندی کی جھلک موجود تھی۔

فرید نے بڑی محنت کے ساتھ فیروز کا بتایا ہوا ڈیزائن کاڑھ کر بنا رکھا تھا اور اس ڈیزائن کو تیار کرتے وقت اس کی نگاہوں کے سامنے بار بار فیروزہ کی تصویر ابھر رہی تھی۔ وہ فیروزہ کو یہ لباس پہنے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اس لباس میں فیروزہ کچھ اور بھی اچھی لگ رہی تھی۔

فیروزہ نے اس کڑھائی کو بہت پسند کیا اور خوش ہو کر فرید کی تعریف کی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے کرتے کی جیب میں سے کچھ پیسے نکالے اور فرید کو دینے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ کیا.....؟'' فرید نے حیرت سے کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

''تمہیں تمہاری محنت کے پیسے دے رہی ہوں اور کیا۔'' فیروزہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں فیروزہ .....!'' فرید نے آہستہ سے کہا۔ ''پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے..... یہ تو تھوڑا سا کام تھا۔''

''اچھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں آئندہ تم سے کوئی کام نہ کرواؤں؟'' فیروزہ نے ترچھی نظروں سے ایک بہت دلنشیں مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے کہا اور فرید کو ایسا لگا جیسے نرم، خوشبودار اور خنک ہوا کا ایک جھونکا یکبارگی اس کے وجود میں اتر گیا ہو۔

''نہیں ..... یہ بات نہیں ہے۔'' اس نے اپنے وجود میں اترنے والی ٹھنڈک اور خوشبو کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''تم کو جب بھی اور جتنے بھی کپڑوں پر کڑھائی کروانی ہو، میرے پاس لے کر آ جانا..... میں کڑھائی کر دوں گا۔''

فیروزہ کچھ دیر تک رکنے کے بعد اس کے پاس سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد فرید کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کے ہمہ وقت تنے رہنے والے اعصاب میں کچھ ڈھیلا پن پیدا ہو گیا ہے۔ مدتوں بعد اس نے اپنے لباس اور حلیے پر توجہ دی اور اگلے دن وہ فیروزہ کا انتظار کرنے لگا۔ شاید وہ کوئی اور کپڑا لے کر آئے۔

لیکن فیروزہ نہیں آئی۔ وہ اسے باڑے میں بھی نظر نہیں آئی۔ کئی دن گزر گئے اور فیروزہ نہیں آئی۔ فرید پر ایک بار پھر تناؤ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔

فرید کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار کوئی خوشگوار سا خواب دیکھا تھا جو آنکھ کھلتے ہی منتشر ہو گیا اور اس کے بکھرے ہوئے اجزا فضا میں اس طرح غائب ہو گئے کہ اب انہیں کہیں بھی تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لیکن کئی دن کے بعد اچانک فیروزہ ایک بار پھر اس کے پاس آ گئی۔ فرید نے دیکھا کہ فیروزہ وہی لباس پہنے ہوئے تھی جس پر فرید نے کڑھائی کی تھی۔ اس کا چہرہ کسی تروتازہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں جگمگاتے ہوئے ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

''دیکھو..... میں ان کپڑوں میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' فیروزہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پہچان رہے ہو نا؟ یہ تمہارے کاڑھے ہوئے کپڑے ہیں۔''

''کیوں نہیں پہچانوں گا۔'' فرید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرے ہاتھ کا کام ہے۔''

''ہاں، تمہارے ہاتھ کا کام ہے اور میرے جسم کی زینت ہے۔'' فیروزہ نے کہا اور فرید کے سارے وجود میں بجلی کی سی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے ہزاروں لباسوں پر کڑھائی کی تھی، لیکن ایسے الفاظ تو اس نے کبھی کسی عورت کی زبان سے نہیں سنے تھے۔

''تم..... اتنے دنوں سے غائب کہاں تھیں؟'' فرید نے حوصلہ پا کر بے تکلفی کا انداز اختیار کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''میں..... میں اصل میں گاؤں گئی ہوئی تھی۔'' فیروزہ نے کھنکتے ہوئے لہجے میں اپنی رسیلی آواز میں اور بھی زیادہ رس گھولتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے رشتے داروں میں ایک شادی تھی اور تمہارے کاڑھے ہوئے یہ کپڑے بھی پہلی بار میں نے وہیں پہنے تھے، مجھے بہت اچھا لگا۔''

فرید کے وجود پر ہلکی ہلکی کپکپی طاری ہو رہی تھی۔ یہ کیسی میٹھی میٹھی اور زندگی بخش دلدل تھی جس میں وہ دھنسا جا رہا تھا۔

''یہ لو۔'' فیروزہ نے اپنا ہاتھ فرید کی طرف بڑھایا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک چھوٹی سی تھیلی تھی۔ جس میں کوئی چیز تھی۔ ''میں تمہارے لیے لائی ہوں۔''

''یہ کیا ہے؟'' فرید نے ہچکچاتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس سے پوچھا۔

''یہ پینڈیاں ہیں۔'' فیروزہ نے کہا۔ ''میں گاؤں سے تمہارے لیے لے کر آئی ہوں۔ بڑی مشکل سے بچا پائی ہوں۔''

فرید نے ہاتھ بڑھا کر پینڈیاں اس سے لے لیں۔ فیروزہ کے چلے جانے کے بعد ایک بالکل ہی نیا احساس اس کے اندر جاگ رہا تھا۔ کوئی اس کی طرف بھی توجہ دے سکتا ہے۔ وہ بھی کسی کی نرم نگاہی کا مرکز بن سکتا ہے۔ یہ وہ احساس تھا جو اس کے وجود کی کرختگی، درشتی اور مردم بیزاری کو جیسے کم کیے دے رہا تھا۔

اگلے روز اس نے کارخانے میں اپنے کئی ساتھیوں سے بے تکلفی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کیں جس پر انہیں خاصا تعجب بھی ہوا، کیونکہ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

آنے والے دنوں کے دوران فرید اور فیروزہ کی دوستی کافی تیزی سے بڑھ کر پسندیدگی اور محبت میں تبدیل ہو گئی۔ پیش قدمی تو فیروزہ کی طرف سے ہی ہوئی تھی اور فرید نے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو اپنے سر آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ فرید کو پہلی بار اس حقیقت کا تجربہ ہو رہا تھا کہ زندگی میں سب کچھ برا اور بدصورت ہی نہیں ہے۔ بلکہ کچھ خوبصورت بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم رات کو ذہن کے پردے پر ابھرنے والا وہ خوفناک منظر جس کا اختتام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک قابلِ نفرت چہرے کی شکل میں ہوتا تھا۔ اب بھی اس کے افکار پریشان کا ایک حصہ بنا ہوا تھا، لیکن اب یہی سب کچھ نہیں تھا۔ اس چہرے کو مردہ حالت میں پیروں سے مسلنے کے ساتھ ساتھ، کسی دوسرے چہرے کو پیار کر لینے کی، اسے اپنا بنا کر دل میں بٹھا لینے کی ایک مہکتی ہوئی آرزو بھی اس کے فکری دھارے میں شامل ہوگئی تھی۔

فرید نے ابھی تک یہ سوچنا شروع نہیں کیا تھا کہ اس مسلسل بڑھتے ہوئے تعلق خاطر کا انجام کیا ہوگا۔ وہ تو بس سرشاری کی ایک ایسی فضا میں تیرتا پھر رہا تھا جس میں اس کے اور فیروزہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

وہ خود تو فیروزہ سے ملنے کے لیے نہیں جا سکتا تھا۔ فیروزہ ہی اس کے پاس آتی رہی تھی اور اس کے پاس آنے کے لیے ایک اچھا بہانہ بھی موجود تھا۔ وہ کوئی بھی کپڑا لے کر اس کے پاس اس بہانے سے آجاتی تھی کہ اسے اس پر کڑھائی کروانی ہے۔ اس کے گھر والوں کو اس میں کوئی شبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ فرید کے پاس آنے کے علاوہ اور کہیں بھی نہیں جاتی تھی۔

لیکن تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں لوگوں کی نظروں سے چھپی نہیں رہتیں۔ فرید اور فیروزہ تو ایسے مدہوش تھے کہ انہوں نے دوسروں کے بارے میں سوچا ہی نہیں، لیکن دوسرے ان کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ رہے تھے۔

فیروزہ ہر دو تین دن کے بعد فرید کے پاس چکر لگا لیتی تھی۔ دونوں کی ملاقات اگرچہ مختصر ہوتی تھی، لیکن ان کی سرشاری اور مدہوشی کی کیفیت کے تسلسل کے لیے یہ مختصر سی ملاقات ہی بہت کافی ہوتی تھی۔

پھر ایک بار پورا ایک ہفتہ گزر گیا اور فیروزہ نہیں آئی۔ باڑے کے مالک عطاء اللہ کے گھر میں بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہاں سب کچھ ٹھیک تھا۔ اگر کوئی خاص بات ہوتی تو سب کو ہی پتہ چل جاتا۔ پچھلی بار جب فیروزہ آئی تھی تو وہ دو دن کے بعد آنے کا وعدہ کر کے گئی تھی لیکن وہ نہیں آئی۔ وہ باڑے میں بھی آتی جاتی نظر نہیں آئی۔ کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔ فرید زندگی میں پہلی بار ہجر کی تڑپا دینے والی کیفیت سے دوچار ہوا تھا۔ اپنی کوٹھری کے باہر ہونے والی ہر آہٹ پر اس کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ شاید وہ آگئی، لیکن اس کا تو کہیں پتہ نہیں تھا۔ فرید کی مجبوری یہ تھی کہ وہ خود اس گھر کے جا کر اس ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ ایسی کوئی روایت ہی نہیں بنی تھی۔ اسے کبھی فیروزہ

کے گھر جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

ساتویں دن جب فرید دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے کارخانے سے نکل کر اپنی کوٹھری کی طرف آرہا تھا تو شمشاد نامی ایک چھوٹا سا لڑکا اس کے پاس آیا۔ وہ شمشاد کو جانتا تھا۔ شمشاد فیروزہ کے گھر کے قریب ہی رہتا تھا۔ شمشاد نے جلدی سے اپنی بند مٹھی فرید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ فیروزہ آپا نے دیا ہے۔'' اور مٹھی کھول دی۔ مٹھی میں ایک تڑا مڑا کاغذ دبا ہوا تھا۔ فرید نے جلدی سے وہ کاغذ اٹھا کر اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ شمشاد وہاں سے جانے لگا تو اس نے اس کو روک لیا۔

''ٹھہرو۔'' اس نے کہا۔ ''اور اپنی جیب میں سے کچھ پیسے نکال کر شمشاد کو دیے۔ ''یہ رکھ لو۔''

''پیسے تو مجھے فیروزہ آپا نے بھی دیئے تھے۔'' شمشاد نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''دیکھو..... کسی کو بتانا نہیں۔'' فرید کی آواز میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔

''معلوم ہے۔'' شمشاد نے کہا۔ ''بڑی آپا مجھے اچھی طرح سمجھا چکی ہے۔'' اور وہ پیسے لے کر فوراً غائب ہوگیا۔ فرید کو نہیں معلوم تھا کہ یہ بڑی آپا کون ہیں۔

فرید نے اپنی کوٹھری کے اندر آ کر لرزتی ہوئی انگلیوں سے اس تڑے مڑے کاغذ کو کھولا۔ اس پر چند سطروں کی ایک مختصر تحریر تھی۔ فیروزہ نے اس کو شام کو ایک چھوٹے سے پارک میں بلایا تھا۔ فرید پر شدید جذباتی ہیجان طاری ہوگیا۔ اسے ایسا لگا کہ اس کے اردگرد کی ہر چیز بڑی تیزی کے ساتھ بدلتی جا رہی ہے۔ ایک نئی دنیا وجود میں آرہی ہے۔ یہ دنیا صرف اس کے لیے ہے اور وہ اس دنیا کا محور ہے۔

وہ شام کو مقررہ وقت سے پہلے ہی مقررہ جگہ پر پہنچ گیا اور کچھ ہی دیر کے بعد اس نے دو لڑکیوں کو ہاں آتے دیکھا۔ ان میں سے ایک لڑکی تو فیروزہ تھی اور دوسری کوئی اور تھی۔ فرید اس لڑکی کی شکل تو پہچانتا تھا، لیکن اس کا نام وغیرہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے تو اپنے اردگرد کے لوگوں میں کبھی دلچسپی لینے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

دونوں لڑکیاں فرید کے پاس آگئیں۔ فیروزہ کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی اور وہ پریشان نظر آرہی تھی۔ اس کی ہمیشہ ستاروں کی طرح جگمگانے والی آنکھیں بجھی بجھی تھیں اور اس کا ہمیشہ دمکنے والا چہرہ ویرانی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

''ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے فرید۔'' فیروزہ نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔ ''میں سلمیٰ کو ساتھ لے کر آئی ہوں۔ کیونکہ اس کے بغیر میں نہیں آسکتی تھی۔ سلمیٰ کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھائی کے ذریعے ہی میں نے تم کو پرچہ بھجوایا تھا۔''

''اچھا اچھا.....'' فرید نے جلدی سے کہا۔''تو.....تو..... یہ شمشاد کی بہن ہیں..... بڑی آپا؟''

''ہاں۔'' سلمٰی نے خود ہی جواب دیا۔''میں شمشاد کی سب سے بڑی بہن ہوں۔ اب میری بات سنو فرید بھائی۔ فیروزہ کے گھر والوں کو تم دونوں پر شبہ ہو گیا ہے اور انہیں تمہارا میل جول بالکل پسند نہیں ہے۔ انہوں نے فیروزہ کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی ہے اور وہ اس کی شادی طے کر رہے ہیں۔''

''میرے تایا کے گھر والے بہت پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔'' فیروزہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔''میرے ماں باپ نے اگر ایک بار ہاں کر دی تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکے گا، وہ زبان دے کر پھر پلٹ نہیں سکتے جو کچھ کرنا ہے، جلدی کرو۔''

''تم فوراً فیروزہ کے گھر والوں کو فیروزہ کے لیے اپنا پیغام دے دو۔'' سلمٰی نے کہا۔ ''میں فیروزہ کی والدہ کو خود بھی سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ وہ تمہارا رشتہ قبول کر لیں۔ مگر جلدی کرو فرید بھائی.....''

فرید کا سر چکرا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان لوگوں کو کیا جواب دے۔ حالات نے جس قدر تیزی کے ساتھ پلٹا کھایا تھا۔ اس کے باعث وہ ششدر ہو گیا تھا۔ اس نے محبت تو کر لی تھی، لیکن وہ اس کے مضمرات سے بالکل ناواقف تھا اور اب جبکہ سنگین حقائق سے اس کا واسطہ پڑ رہا تھا تو وہ حواس باختہ ہو گیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے جواب دیا۔''میں ..... کرتا ہوں''۔

''بس اب ہم لوگ چلیں گے فرید بھائی۔'' سلمٰی نے کہا۔''میں بڑی مشکل سے بہانے سے ذرا سی دیر کے لیے فیروزہ کو اپنے ساتھ لا سکی ہوں۔ اگر کسی نے ہمیں یہاں دیکھ لیا تو چاچا اور چاچی ہماری جان نکال لیں گے۔''

جاتے وقت فیروزہ نے اپنی زخمی نظروں سے فرید کی طرف دیکھا کہ فرید کا دل دہل کر رہ گیا۔ فیروزہ اپنی رازدار سہیلی سلمٰی کے ساتھ وہاں سے چلی گئی اور فرید ایک بینچ پر ڈھیر ہو گیا۔

شادی؟ اس بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ فیروزہ کی محبت میں ڈوب کر اس بات کو بالکل بھول گیا تھا کہ محبت کی ہر واردات کو کسی نہ کسی طور پر اس کے انجام تک پہنچانا بھی ضروری ہوتا ہے اور اب اچانک بغیر کسی پیشگی اطلاع کے وہ لمحہ آن پہنچا تھا جب

اس کو فوری طور پر ایک اہم فیصلہ کرنے کی ضرورت تھی۔

فیروزہ کے ساتھ شادی..... شادی..... اس راہ میں کتنی مشکلات تھیں۔ سب سے بڑی مشکل تو خود اس کی اپنی ذات تھی۔ ایک نامعلوم اور خفیہ ذات، جس کے بارے میں دوسرے کچھ بھی تو نہیں جانتے تھے۔ خود فیروزہ کو اس نے اپنے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بتایا تھا کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔ درصل اسے فیروزہ کے ساتھ کبھی اس قدر تفصیلی گفتگو کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ وہ اپنے بارے میں اسے کچھ زیادہ بتا سکے۔

بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر ان سوالات کے جوابات تیار کر لیے جو اس سے پوچھے جا سکتے تھے۔ فرید کو جھوٹ بولنا کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا اور اس نے جھوٹ سے ہمیشہ نفرت کی تھی، لیکن جب سچ کا زہر روح کو ہلاک کر کے رکھ دے تو پھر کبھی کبھی جھوٹ کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔

اس نے جب اپنے کارخانے کے مالک کرامت علی سے کہا کہ وہ اس سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہے تو کرامت علی سخت حیران ہوا۔

فرید نے تو آج تک اس سے کسی چیز کے لیے بھی درخواست نہیں کی تھی۔ وہ تو ایک متین انداز میں کام کرنے والا نوجوان تھا جو دن بھر میں الفاظ کی بہت معمولی سی تعداد کو خرچ کرتا تھا۔

''ہاں ہاں کہو۔'' کرامت علی نے تجسس سے بھرپور لہجے میں کہا۔''بتاؤ..... کیا چاہئے ہے تم کو؟''

اس کے جواب میں فرید نے جو کچھ کہا اسے سن کر کرامت علی دنگ رہ گیا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ فرید اس سے اس قسم کی فرمائش کرے گا۔ اس نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اس پتھریلے اور کرخت انسان کے دل میں کسی لڑکی کے لیے محبت اور پسندیدگی کا نرم و شیریں جذبہ بھی جاگ سکتا ہے۔

''میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے استاد۔'' فرید نے غم آلود لہجے میں کرامت علی سے کہا۔ جسے کارخانے میں کام کرنے والے تمام لڑکے ''استاد'' کہتے تھے۔''والدین ختم ہو گئے اور کوئی ہے نہیں۔ تم میرے سرپرست اور بزرگ کی حیثیت سے فیروزہ کے والد عطاء اللہ کے پاس میرا پیغام لے کر چلو اور ان پر اشارتاً یہ بات بھی واضح کر دو کہ میں اور فیروزہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' کرامت علی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔''اگر ایسی بات ہے تو میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضرور تمہارا پیغام لے کر چلوں گا۔ تم بہت اچھے کاریگر ہو۔ اچھی کمائی کر لیتے ہو اور آئندہ اس سے بھی زیادہ اچھی کمائی کر سکو گے۔ میرے خیال میں تو عطاء اللہ کو تمہاری بات مان لینی چاہئے۔ میری اس سے اچھی دعا سلام ہے، میں پوری کوشش کروں گا۔''

کرامت علی اسی روز دن ڈھلے فرید کو اپنے ساتھ لے کر عطاء اللہ کے گھر پہنچا۔

عطاء اللہ ان دونوں کو دیکھ کر سخت حیران ہوا اور ساتھ ہی یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ اسے فرید کو اپنے گھر میں دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے

فرید کے لیے فیروزہ کے گھر میں قدم رکھنے کا یہ پہلا موقع تھا اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس گھر کے تمام در و دیوار سے ایک مانوس، محبت بھری اور حیات آفریں خوشبو پھوٹ رہی ہے۔ یہ وہ گھر تھا جہاں فیروزہ رہتی تھی۔ اس گھر کی فضاؤں میں فیروزہ کے وجود کی روشنی گھلی ہوئی تھی۔

عطاء اللہ تے دعا سلام کے بعد ان دونوں کو کمرے میں بٹھایا اور کوئی گفتگو شروع کرنے سے پہلے سوالیہ نظروں سے کرامت علی کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں کا مفہوم بہت واضح تھا جن تک پہنچنے میں کرامت علی کو کسی بھی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

''ایک ضروری کام کے سلسلے میں تمہاری خدمت میں حاضر ہوا تھا بھائی عطاء اللہ۔''

کرامت علی نے فوراً ہی مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔ وہ عطاء اللہ کو زیادہ دیر تک تجسس اور اضطراب میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

''ہاں ہاں کہو، ضرور کہو بھائی کرامت علی۔'' عطاء اللہ نے کہا۔

''بات یہ ہے کہ بھائی عطاء اللہ یہ جو بچہ، فرید ہے نا، میرے کارخانے میں کافی زمانے سے کام کر رہا ہے اور بہت اچھا، ایماندار اور محنتی لڑکا ہے۔ میں نے اسے کسی بھی بری عادت میں مبتلا نہیں پایا۔ یہ دنیا میں بالکل اکیلا ہے۔ والدین موجود نہیں ہیں۔ میری درخواست ہے کہ تم اسے اپنی غلامی میں لے لو۔ تمہاری بیٹی فیروزہ اس کے ساتھ خوش رہے گی انشاء اللہ.....''

''جہاں تک میں جانتا ہوں بھائی کرامت علی، اس کی ذات برادری کا کوئی پتہ نہیں۔'' عطاء اللہ نے سپاٹ اور خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''تم تو اچھی طرح جانتے ہو، ہم اونچی برادری کے لوگ ہیں۔ اپنے سے کمتر درجے والی برادری میں بیٹی نہیں دیتے۔ اس کا تو کوئی بھی یہاں موجود نہیں ہے اور ہم اس کے خاندان وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اس لیے''

''اپنے خاندان کے بارے میں تم خود بتاؤ فرید۔'' کرامت علی نے عطاء اللہ کی بات کاٹتے ہوئے فرید سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تمہارا کوئی بزرگ، کوئی عزیز رشتے دار وغیرہ کہیں ہے؟''

''میرا کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے۔'' فرید نے جواب دیا۔ ''والدین کا انتقال ہو چکا ہے اور..... کوئی اور عزیز ہے نہیں۔''

''نہیں بھئی نہیں۔'' عطاء اللہ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہمارے خاندان میں لڑکی برادری سے باہر دینے کا ویسے بھی رواج نہیں ہے۔ ہم اپنے برابر کی غیر برادری کی لڑکی لے تو سکتے ہیں، لیکن اپنی لڑکی برادری سے باہر نہیں دیتے۔''

''مجھے معلوم ہے بھائی عطاء اللہ۔'' کرامت علی نے بہت نرمی کے ساتھ کہا۔ ''مگر قاعدے قانون اپنی جگہ اور بچوں کی خوشی اپنی جگہ۔ ہمیں پرانے رسم و رواج کے لیے بچوں کی خوشیاں تو قربان نہیں کر دینی چاہئیں۔ اگر دونوں بچوں کی خوشی اسی میں ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں تو ان کی بات مان لینی چاہئے۔''

''یہ لڑکا تمہارے کارخانے کا نوکر ہے جس کے بارے میں تم خود بھی کچھ نہیں جانتے۔'' عطاء اللہ نے کہا۔ ''اور اگر جانتے بھی ہوتے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس رشتے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ فیروزہ کا رشتہ ہم صرف اپنی برادری میں ہی کریں گے۔''

عطاء اللہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس کو سن سن کر فرید کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا سارا وجود ٹھٹھرتا اور سکڑتا جا رہا ہے اور خون اس کی رگوں میں منجمد ہوا جا رہا ہے۔ کرامت علی نے عطاء اللہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی اور بار بار ایسے اشارے دیئے جن سے یہ واضح ہوتا تھا کہ فیروزہ اور فرید ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، لیکن عطاء اللہ نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس نے صاف انکار کر دیا اور کرامت علی فرید کے ساتھ وہاں سے بے نیل و مرام واپس آ گیا۔

''میں ایک بار پھر اس کے پاس جاؤں گا۔'' وہاں سے آنے کے بعد کرامت علی نے فرید سے کہا۔ ''اور اکیلا جاؤں گا۔ اس کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ شاید مان جائے۔''

اگلے دن کرامت علی نے دوبارہ کوشش کر کے بھی دیکھ لیا۔ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس نے فرید کو بتا دیا اور اس کو مشورہ دیا کہ وہ فیروزہ کا خیال چھوڑ دے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے بیٹا۔'' کرامت علی نے کہا۔ ''اگر تم شادی کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے بہت سی لڑکیاں مل سکتی ہیں۔ اگر تم کہو گے تو کسی بھی دوسری جگہ بات چلائی جا سکتی ہے۔''

''نہیں، ابھی نہیں استاد۔'' فرید نے مریل آواز میں کہا۔ ''پھر کبھی دیکھیں گے۔''

اس کے صرف تین دن کے بعد فیروزہ کی اس کے تایا زاد بھائی کے ساتھ باقاعدہ منگنی کا اعلان کر دیا گیا۔ شادی منگنی کے ایک ماہ کے بعد ہونے والی تھی۔

درد کی یہ ایک بالکل نئی لیکن بڑی طاقتور لہر تھی جس نے فرید کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ سرشاری کی اس کیفیت کا عرصہ بہت مختصر ثابت ہوا تھا اور وہ اس کی زندگی میں مزید دکھوں کا اضافہ کر کے چلی گئی تھی۔

فیروزہ اب کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ فرید کی خشک اور ویران آنکھیں باڑے میں، اس کے گھر کے آس پاس، سڑک اور گلی میں اسے تلاش کرتیں، لیکن طرح طرح کے دوسرے مناظر سے ٹکرا ٹکرا کر تھک جاتیں۔ فیروزہ کی صورت کہیں بھی نظر نہ آتی۔ فرید کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس سے ملاقات کر سکے۔

اس روز وہ درد کی آنچ میں سلگتے ہوئے اپنے وجود کے ساتھ کارخانے سے واپس آیا تو اس کے کچھ ہی دیر کے بعد سلمٰی اپنے چھوٹے بھائی شمشاد کے ساتھ وہاں آن پہنچی۔ شمشاد کو اس نے کوٹھری کے دروازے کے باہر کچھ دور کھڑا کر دیا۔ سلمٰی کے ہاتھ میں کئی کپڑے تھے۔ وہ کڑھائی کروانے کے بہانے فرید کے پاس آئی تھی۔

''فیروزہ گھر سے باہر نہیں نکل سکتی۔'' سلمٰی بہت ہلکی سرگوشیوں میں جلدی جلدی بولتے ہوئے فرید کو بتانے لگی۔ ''ان لوگوں نے اسے گھر میں قید کر رکھا ہے، لیکن وہ کہتی ہے کہ تمہارے بغیر مر جائے گی۔ وہ اپنے تایا کے بیٹے ساتھ شادی کے لیے بالکل تیار نہیں ہے۔ وہ مر جائے گی۔ اگر تم اسے بچا سکتے ہو تو بچا لو۔''

''مجھے بتاؤ..... بتاؤ..... میں کیا کر سکتا ہوں؟'' فرید نے بے تابی کے ساتھ کہا۔

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''اتنی ہمت ہے تمہارے اندر کہ اسے لے کر یہاں سے کہیں دور بھاگ جاؤ اور اس سے نکاح کر لو؟'' سلمٰی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''ہاں ہے، بالکل ہے۔'' فرید نے سر اٹھا کر جواب دیا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے شعلے نکلنے لگے تھے۔ فیروزہ کے لیے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

''تو سنو..... وہ یہی چاہتی ہے۔ اس نے ہی مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ تم لوگوں کے پاس بس آج کی رات ہے۔ شاید کل اس کے گھر والے اسے یہاں سے دور ایک گاؤں میں اس کے ماموں ممانی کے پاس لے جا رہے ہیں۔ جہاں اسے شادی کے وقت تک رہنا ہوگا۔ پھر کوئی موقع نہیں ملے گا۔ وہ آج رات تمہارے ساتھ نکل جانے کے لیے تیار ہے۔ تم لوگ سیدھے لاہور چلے جاؤ۔ لاہور میں میری بڑی خالہ زاد بہن رہتی ہیں وہ اور ان کے شوہر بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔ میں نے ان کے نام خط لکھ دیا ہے۔ وہ میں تم کو دے رہی ہوں۔ ان کے پتے پر ان کے گھر چلے جانا۔ وہ لوگ تمہاری پوری مدد کریں گے۔''

''وہ یہاں خبر تو نہیں کر دیں گے؟'' فرید نے پوچھا۔ ''مجھے اپنی تو کوئی فکر نہیں ہے مگر فیروزہ.....''

''وہ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔'' سلمٰی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میری خالہ زاد بہن نے بھی اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔ وہ لوگ ان جاہل دیہاتیوں سے بہت مختلف ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' فرید نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔ ''میں بالکل تیار ہوں..... اور اس سے کہہ دینا کہ اپنے ساتھ گھر سے اپنے چند جوڑی کپڑوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ لے کر آئے۔ میرے پاس کافی پیسے موجود ہیں۔''

''آج رات کو.....'' سلمٰی نے اسے وقت اور جگہ بتاتے ہوئے کہا۔ ''تم پہنچ جانا۔ فیروزہ بھی وہاں آ جائے گی۔ وہ برقعے میں ہوگی۔ میں نے اس کے لیے برقعے کا بندوبست کر دیا ہے۔ بس سیدھے لاہور..... اور اب میں چلتی ہوں۔ یہ خط رکھ لو۔'' اس نے ایک بند لفافہ فرید کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کو بہت احتیاط کے ساتھ رکھنا۔ ویسے میں نے اپنی بہن کا پتہ فیروزہ کو بھی اچھی طرح یاد کرا دیا ہے اور ہاں..... میں تمہارے پاس کڑھائی کے لیے آئی تھی، لیکن تم نے منع کر دیا کہ تمہیں فرصت نہیں ہے۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کے ساتھ ہی وہ وہاں سے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد فرید نے لفافے پر لکھے ہوئے پتے کو غور سے بار بار پڑھا اور اسے یاد کر لیا۔ یہ پتہ تو اس کے دل پر اب اس طرح نقش ہو چکا تھا کہ زندگی بھر مٹ نہیں سکتا تھا۔

اس رات فرید بڑی خاموشی سے مقررہ وقت پر مقررہ جگہ پہنچ گیا۔ وہ جگہ فیروزہ کے گھر کے قریب ہی تھی۔ فرید اپنے ساتھ چند جوڑے کپڑے اور اپنی ساری جمع شدہ رقم لے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر آیا تھا۔ وہ مقررہ وقت سے ذرا پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا اور اب وہ ایک برقعے والی لڑکی کا انتظار کر رہا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ مقررہ وقت آیا اور گزر گیا۔ پھر ایک گھنٹہ گزرا لیکن کوئی برقعے والی لڑکی نمودار نہیں ہوئی۔ فرید کا دل ڈوبا جا رہا تھا اور خاک اڑاتے ہوئے نیم تاریک راستے کو گھورتے گھورتے اس کی آنکھیں پتھراتی جا رہی تھیں۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ فرید کا سارا جسم سن ہوا جا رہا تھا۔ وہ درد کے ایک مجسمے میں تبدیل ہو کر انتظار کی المناک کیفیت سے گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ رات کا آخری پہر آن پہنچا۔ پھر کہیں دور سے اذان کی آواز سنائی دی۔ فرید نے اپنی پتھر آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ دور افق پر سپیدۂ سحری نمودار ہو رہا تھا۔

وہ بے جان اور تھکے تھکے قدموں سے واپس روانہ ہوا لیکن وہ فوراً ہی باڑے میں نہیں آ گیا۔ وہ رک رک کر، مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ اب تو اکا دکا لوگوں کی آمد رفت بھی شروع ہو گئی تھی۔ چند بیل گاڑیوں کا ایک قافلہ اس کے پاس سے گزرا۔ سوئی ہوئی زندگی بیدار ہونا شروع ہو گئی تھی۔

وہ خاموشی سے واپس باڑے میں آ گیا اور سیدھا اپنی کوٹھری میں جا کر چارپائی پر گر پڑا۔ اس ناکام مہم اور رات بھر کی ہر لمحہ چوکس بیداری نے اس کے اعصاب کو بری طرح تھکا دیا تھا۔ اگر فیروزہ آ جاتی تو تھکاوٹ کا نام و نشان بھی نہ ہوتا اور اس کے سارے وجود میں برقی قوت پیدا ہو جاتی۔ فیروزہ کا ہاتھ تھام کر وہ ساری دنیا سے لڑتا ہوا۔ دنیا کے آخری سرے تک جانے کے لیے تیار تھا..... لیکن فیروزہ کے نہ آنے سے اس کی ساری توانائی جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

اس نے تھوڑی دیر کے لیے سونا چاہا، لیکن اس کو نیند نہیں آئی۔ وہ مقررہ وقت پر کارخانے چلا گیا۔

درجنوں سوالات اور خدشات تھے جو زہریلے سانپوں کی طرح اس کے دل و دماغ میں سرسرا رہے تھے اور اس کو بار بار ڈس رہے تھے۔ کیا ہوا؟ وہ کیوں نہیں آئی؟ کیا اس کے گھر والوں کو پتہ چل گیا یا اس نے اپنا ارادہ بدل دیا؟ کیا وہ خوفزدہ ہو گئی؟ کیا کسی اور دباؤ کا شکار ہو گئی؟ کوئی نہیں تھا جو فوری طور پر اس کے ان سوالات کا جواب دے سکتا۔

جواب اسے شام کو ہی مل سکا جب وہ کارخانے سے واپس آیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد سلمیٰ شمشاد کے ساتھ وہاں آئی۔ اس کے ہاتھ میں کئی کپڑے تھے اور اس کے چہرے پر غم اور تشویش کی دھول اڑ رہی تھی۔ وہ جب بولی تو اس کی آواز آنسوؤں میں گندھی ہوئی تھی۔

''اس کی ماں کو اس پر کچھ شک ہو گیا تھا اور اس نے سرِ شام ہی سے اس کی نگرانی شروع کر دی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد اسے کمرے میں بند کر دیا گیا اور صبح تک وہاں سے نہیں نکلنے دیا گیا۔ اب وہ گھر سے ایک قدم باہر نہیں نکال سکتی۔ زیادہ تر وقت اسے کمرے میں بند رکھا جا رہا ہے اور کل صبح کو اسے گاؤں روانہ کر دیا جائے گا۔''

''پھر؟'' فرید نے بے تابی کے ساتھ پوچھا۔ ''پھر اب کیا کرنا چاہئے؟''

''فی الحال تو انتظار کرو۔'' سلمیٰ نے کہا ''ابھی تو وہ گھر سے نکل ہی نہیں سکتی۔ اسے گاؤں جانا ہی ہوگا۔ اسے گاؤں پہنچ جانے دو۔ ہم بعد میں کچھ سوچیں گے اور اب میں چلتی ہوں۔''

لیکن فیروزہ گاؤں نہیں جا سکی۔ وہ کہیں بھی نہیں جا سکی۔ وہ اس گھر سے باہر قدم ہی نہیں نکال سکی۔

اگلے دن صبح کو محلے میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ عطاء اللہ کی بیٹی فیروزہ کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا اور وہ کوئی جواب نہیں دے رہی تھی۔ گھر والوں نے دروازہ توڑ دیا۔ فیروزہ کی لاش چھت کے پنکھے سے بندھی ہوئی رسی سے جھول رہی تھی اور نیچے ایک اسٹول الٹا پڑا ہوا تھا۔

گھر والوں نے پولیس کو بتایا کہ اس کی ماں نے اسے کسی بات پر ڈانٹا تھا۔ جس سے دل برداشتہ ہو کر اس نے خودکشی کر لی۔

اگرچہ کرامت علی اور سلمیٰ کئی لوگوں کو حقیقت حال کا علم تھا، لیکن کسی نے بھی پولیس کو اطلاع بہم نہیں پہنچائی کہ فیروزہ کی خودکشی کی اصل وجہ کیا تھی۔

وہ ایک چھوٹا سا نخلستان جو فرید کی زندگی کے اجاڑ اور ویران صحرا میں ایک مختصر سی مدت کے لیے نمودار ہوا تھا، یکبارگی خزاں کی آگ میں جل کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر اپنی اسی دنیا میں واپس لوٹ گیا، جہاں سے کچھ دنوں کے لیے وہ گویا چھٹی پر گیا ہوا تھا۔

''اگر میں اپنے اپنے خاندان کے بارے میں لوگوں کو کھل کر بتا سکتا۔ اگر میری زندگی میں ایسے شرمناک واقعات پیش نہ آئے ہوتے جن کا میں کسی کے سامنے ذکر بھی نہیں کر سکتا، تو شاید عطاء اللہ مجھے مسترد نہ کرتا۔ ہماری برادری بھی کوئی گری پڑی برادری نہیں ہے۔'' وہ زخمی دل کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ ''صفدر علی ..... صفدر علی ..... تُو نے مجھے تباہ کر دیا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب اس کے ذہن میں پکنے والا لاوا اور بھی زیادہ شدت اختیار کر چکا تھا۔ صفدر علی اب صرف اس کے باپ کا قاتل نہیں تھا۔ صفدر علی نے ایک اور انسان کو بھی قتل کر ڈالا تھا۔ اس نے فیروزہ کو قتل کر دیا تھا۔ اگر صفدر علی نے یہ سب کچھ نہ کیا ہوتا تو وہ عطاء اللہ کو اپنے خاندان اور برادری کے بارے میں سب کچھ بتا کر اسے مطمئن کر سکتا تھا۔ اسے اپنے آپ کو چھپانے کی ضرورت نہ تھی۔

اس بھیانک اور خون آلود منظر میں، جو اسے ہر رات نظر آتا تھا اب ایک نیا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس میں اب فیروزہ کی رسی سے جھولتی ہوئی لاش بھی شامل ہو گئی تھی۔

''اچھے لوگ دنیا سے بڑی جلدی اٹھ جاتے ہیں۔'' اس کے دل میں ہوک اٹھی۔ ''ابا بہت اچھے تھے مر گئے۔ فیروزہ بہت اچھی تھی مر گئی۔ برے لوگ زندہ رہتے ہیں اور لمبی عمر پاتے ہیں۔'' اس کے مزاج کی ساری زہریلی برہمی، خشونت اور آتش فشانی پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ اس کے وجود پر حملہ آور ہو گئی تھی۔

فرید کو اپنے گھر سے نکلے ہوئے تقریباً آٹھ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ جن لوگوں کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر آیا تھا ان پر کیا گزری، اس کی ماں اور بہن کیسی ہیں اور کس حال میں ہیں اور اس کے باپ کے قاتل صفدر علی کو کوئی سزا بھی ہوئی یا نہیں۔ اس نے جان بوجھ کر اپنے شہر کا رخ نہیں کیا تھا۔ وہ وہاں اسی وقت جانا چاہتا تھا جب وہ اپنی زندگی کا آخری بھرپور قدم اٹھانے کے لیے پوری طرح تیار ہو۔

فیروزہ سے ملاقات سے پہلے اس نے سوچا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنے شہر جائے، لیکن پھر فیروزہ درمیان میں آ گئی اور کچھ دنوں کے لیے سب کچھ بدل گیا، لیکن یہ خوشگوار تبدیلی تو بہت ہی ناپائیدار ثابت ہوئی۔ جھلستی ہوئی گرمی اور دھوپ میں نرم ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا تھا اور سرسراتا ہوا گزر گیا اور اب ایک بار پھر وہی روح تک کو جلا دینے والی گرمی آگ برسا رہی تھی۔

فرید نے اب چکوال جانے کا فیصلہ کر لیا۔ فیروزہ کی موت کے بعد زندگی میں آگ کی لپٹوں کے علاوہ کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ آگ کی یہ لپٹیں اس کی ایک ایک سانس میں بس گئی تھیں۔

فیروزہ کی موت کے بعد دنیا ایک بھیانک خلا میں تبدیل ہو گئی تھی۔ جہاں تنہائی، ویرانی، محرومی اور دل شکستگی کے قہر آلود عذابوں کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔

فیروزہ کی موت کے صرف ایک ہفتے کے بعد اس نے کارخانے کے مالک کرامت علی کو بتا دیا کہ وہ کام چھوڑ کر جا رہا ہے۔

کرامت علی اس کے دل کی حالت کو بخوبی سمجھتا تھا۔ اس نے اس کو سمجھانے کی اور روکنے کی کوشش کی، لیکن فرید کو تو اس شہر کے در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ ان بے رحم در و دیوار نے فیروزہ کو نگل لیا تھا۔

وہ فیصل آباد سے چکوال کے لیے روانہ ہو گیا۔ چکوال سے اس کی روانگی اور دوبارہ وہاں جانے کے درمیان تقریباً آٹھ سال کا طویل عرصہ حائل تھا۔ وہ بچے سے جوان ہو چکا تھا۔ خدوخال بدل گئے تھے۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کی ماں بھی اس کو نہیں پہچان سکے گی۔

وہ چکوال پہنچا تو سب سے پہلے قبرستان گیا اور اپنے باپ کی قبر کو تلاش کرنے لگا، لیکن یہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اس کے باپ کی کچی قبر کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جہاں اس قبر کو ہونا چاہئے تھا، وہاں اب کئی پکی قبریں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے گورکن سے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ اپنی شناخت کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ قبرستان سے اس نے اپنے گھر کا رخ کیا۔ وہ اپنے گھر کو، اس گھر کو جہاں اس کے ابا رہتے تھے۔ باہر سے ایک نظر دیکھ لینا چاہتا تھا۔

لیکن گھر تو وہاں تھا ہی نہیں..... جہاں اس گھر کو ہونا چاہئے تھا۔ وہاں ایک موٹر گیراج تھا۔ اس نے گیراج کے مالک کے پاس جا کر پوچھا۔ ''یہاں پہلے کبھی حمید الحسن صاحب رہا کرتے تھے۔''

''حمید الحسن؟'' گیراج کے مالک نے اس کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں..... ہاں..... مگر وہ تو بہت پرانی بات ہے۔ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟''

''وہ میرے والد کے دوست تھے۔'' فرید نے کہا۔ ''میں لاہور سے آیا ہوں۔ میرے والد نے مجھ کو ان کا پتہ دیا تھا اور کہا تھا کہ ان سے ضرور مل کر آنا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں وہ کہاں ملیں گے؟''

''وہ اب کہیں نہیں ملیں گے بیٹا۔'' گیراج کے مالک نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''ان کا تو برسوں پہلے انتقال ہو گیا تھا اور ان کی بیوہ نے یہ مکان بیچ دیا تھا۔ مکان بیچ کر وہ اپنی بیٹی کے ساتھ نصیر پور چلی گئی تھیں۔ اب معلوم نہیں، کہاں ہیں۔''

''اوہ..... اچھا..... تو..... حمید الحسن صاحب کیا کچھ بیمار ہو گئے تھے؟ میرے والد کو تو ان کی موت کی کوئی اطلاع ہی نہیں ہے۔''

''انہیں قتل کر دیا گیا تھا بیٹے۔'' گیراج کے مالک نے کہا۔ ''انہیں ان کے ایک دوست صفدر علی نے کچھ لین دین کے جھگڑے میں قتل کر دیا تھا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اوہ..... بڑے افسوس کی بات ہے۔'' فرید نے کہا۔ ''پھر قاتل کو سزا تو ضرور ہوئی ہوگی؟''

''تھوڑی سی سزا ہوئی تھی۔'' گیراج کے مالک نے کہا۔ ''یاد نہیں، کتنے سال کی، لیکن وہ بہت جلدی چھوٹ کر آ گیا تھا اور پھر وہ بھی چکوال سے نصیر پور ہی چلا گیا تھا۔ خدا جانے اب زندہ ہے یا مر گیا۔''

''اچھا چاچا، تمہارا شکریہ.....''

''بیٹھو..... پردیسی ہو، کچھ کھا پی لو۔'' گیراج کے مالک نے نرمی سے کہا۔

''شکریہ چاچا۔ اب چلوں گا۔ آج ہی واپس جانا ہے۔ والد صاحب کے کہنے پر ان کے پرانے دوست سے ملنے کے لیے ادھر آ گیا تھا۔ افسوس کہ وہ بے چارے تو زندہ ہی نہیں ہیں۔''

فرید وہاں سے نکلا تو اس کے رگ و پے میں بھڑکنے والی آگ اور بھی زیادہ تیز ہو چکی تھی اور اس کا رواں رواں جل رہا تھا۔ ''تو..... اس کو صرف معمولی سی سزا ہوئی اور وہ رہا بھی ہو گیا اور وہ نصیر پور میں ہے..... اور اماں بھی مکان بیچ کر نصیر پور چلی گئیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپا کی شادی منور علی کے ساتھ ہو گئی ہوگی اور وہ سب لوگ نصیر پور میں ہی رہ رہے ہوں گے۔ تو اب مجھے نصیر پور کا رخ کرنا چاہیے۔''

نصیر پور ایک خاصا بڑا گاؤں تھا اور یہاں ایک مسافر خانہ بھی تھا جو ایک زمیندار نے اپنے مکان کے ایک حصے میں قائم کر رکھا تھا۔ فرید یہاں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

وہ آگے جانے والے ایک مسافر کی حیثیت سے نصیر پور میں داخل ہوا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ گاؤں میں کسی اجنبی کی آمد گاؤں والوں کے لیے ایک خبر اور ایک سوالیہ نشان ہوتی ہے۔ اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اسے اپنے بارے میں کیا کہنا ہے۔ اسے اس گاؤں میں اجرت پر کپڑوں پر کڑھائی کرنے والے لوگوں کی تلاش تھی۔ اس کے پاس کام بہت تھا لیکن اسے نصیر پور میں زیادہ قیام کرنے اور یہاں کسی کو اپنے بارے میں تفصیل سے بتانے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ نصیر پور میں اس کا قیام بہت مختصر ثابت ہوا۔

نصیر پور آنے کے بعد اس نے یہاں کے اکلوتے مسافر خانے میں قیام کیا اور یہاں آتے ہی اس نے بلا تاخیر اپنا کام شروع کر دیا۔

مسافر خانے کا بوڑھا ملازم تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کے لیے کھانا لے آیا۔ فرید نے اس کے ساتھ سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔

''یہاں کے زمینداروں میں کوئی شخص صفدر علی نامی بھی ہے؟'' اس نے بوڑھے

ملازم سے پوچھا۔ ''وہ چکوال سے یہاں آ کر آباد ہوا ہے۔ اس کا گھر کہاں ہے؟''

''اس کا گھر اب کہیں بھی نہیں ہے۔'' بوڑھے ملازم نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''اس کی اور اس کی بیوی کی کافی جائیداد تھی چکوال اور نصیر پور میں، لیکن اس کے بہن بہنوئی نے دھوکے سے ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا اور اسے اور اس کی بیوی کو یہاں سے نکال باہر کیا۔''

''اس کی بیوی؟'' فرید نے قدرے حیرت سے کہا۔ ''لیکن اس کی بیوی تو شاید مر چکی تھی؟''

''اس نے صابرہ نامی ایک عورت سے دوسری شادی کر لی تھی۔'' بوڑھے ملازم نے جواب دیا۔ ''صابرہ بیوہ تھی، اس کا میاں ایک جھگڑے میں صفدر علی کے ہی ہاتھوں مارا گیا تھا اور اسے سزا ہو گئی تھی۔ پھر جیل سے رہا ہونے کے بعد اس نے اس کی بیوہ کے ساتھ نکاح کر لیا۔ شاید اس طرح وہ اپنے گناہ کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔''

فرید کے دل و دماغ میں موت کے سناٹے سرسرا رہے تھے۔

''صفدر علی کے بیٹے منور علی کے ساتھ صابرہ کی بیٹی دردانہ کی شادی ہو گئی تھی۔'' بوڑھا اسے بتا رہا تھا۔ ''وہ لوگ گوجرانوالہ میں تھے، لیکن پھر صفدر علی کا بیٹا ایک حادثے میں مر گیا اور اس کی بیوہ نے صفدر علی کی بہن کے بیٹے خیر الدین سے نکاح کر لیا۔ شاید وہ لوگ اب بھی گوجرانوالہ میں رہتے ہیں۔ معلوم نہیں..... بس جی..... سب قسمت کے کھیل ہیں..... شام کو بھی کچھ کھاؤ گے؟''

''صفدر علی اور صابرہ اب کہاں ہیں؟'' فرید اپنی مرتعش آواز پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''وہ لوگ اب کہاں رہ رہے ہیں؟''

''کسی کو نہیں معلوم بیٹا.....'' بوڑھے نے جواب دیا۔ ''زمانہ گزر گیا۔ بس اتنا معلوم ہے کہ وہ لوگ کراچی چلے گئے تھے، پھر ان کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم..... تم..... کیا ان لوگوں کو جانتے ہو؟''

''نہیں۔'' فرید نے جواب دیا۔ ''میں ان لوگوں کو نہیں جانتا، لیکن میرے والد مرحوم صفدر علی کے پرانے دوست تھے۔ وہ اکثر اپنے اس دوست کا ذکر کرتے تھے جو پہلے چکوال میں رہتا تھا اور پھر نصیر پور چلا گیا تھا۔''

''ہاں ہاں..... یہ بالکل ٹھیک ہے۔'' بوڑھے ملازم نے جلدی سے کہا۔ ''صفدر علی پہلے چکوال میں ہی رہتا تھا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ نصیر پور میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شام کو کچھ کھاؤ گے؟''

''نہیں۔'' فرید نے بالآخر اس کے کئی بار پوچھے گئے سوال کا جواب دے ہی دیا اور بوڑھا ملازم مطمئن ہو کر گردن ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

غم فرید کے کلیجے کو پھاڑ کر باہر نکل آنا چاہتا تھا۔ صدمے کا بوجھ اس قدر شدید تھا کہ وہ اس کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے اس بوجھ کو اتارنے کی ضرورت تھی، اسے اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی ضرورت تھی۔

وہ مسافر خانے سے باہر نکل آیا۔ اس عمارت کے پیچھے کچھ فاصلے پر گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ فرید سیدھا وہاں چلا گیا۔ اس کے آس پاس دور دور تک بالکل سناٹا تھا۔ اس سناٹے میں جس قدر درد گھلا ہوا تھا، وہ سارے کا سارا فرید کے وجود میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ غم ناک ہوا ہلکی ہلکی سسکیاں لیتی ہوئی لڑکھڑا کر چلتی ہوئی فرید کے ساتھ ساتھ نوحہ کناں قدم بہ قدم چل رہی تھی۔ جنگل میں بہت دور تک اندر جانے کے بعد فرید گھنے درختوں سے گھرے ہوئے ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنا منہ پورا کھول کر باہر کی ساری ہوا کو اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک سلگتی ہوئی سرگوشی میں کہا۔ ''اماں.....'' اور اس کے ساتھ ہی اب تک کا رکا ہوا وہ سیلاب جس کے آگے بندھے ہوئے بند کو وہ بڑی مشکل سے سنبھالے ہوئے تھا، ایک دم پھٹ پڑا۔ ''اماں..... اماں..... یہ تم نے کیا کر ڈالا اماں؟ اماں..... آپا کی شادی اگر منور سے کرنی تھی تو چلو کر دی..... لیکن تم نے..... تم نے اماں..... تم نے صفدر علی سے شادی کر لی؟ تم نے ابا کے قاتل کے ساتھ شادی کر لی؟ ہائے اماں۔ یہ تم نے کیا کر ڈالا۔ صفدر علی سے شادی..... ہائے اماں..... تم مر کیوں نہ گئیں۔ کاش تم مر جاتیں۔ صفدر علی سے شادی کرنے سے پہلے تم مر جاتیں اماں..... کاش میں تم کو قتل کر سکتا۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ تم میری ماں ہو۔ میں تم کو قتل نہیں کروں گا، لیکن اس کتے کے بچے صفدر علی کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ میں اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک اسے تلاش کروں گا۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا اور جان سے مار دوں گا۔ اماں..... تم نے اس سے شادی کیوں کی؟ کیوں کی تم نے اس سے شادی؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟'' وہ وحشت کے عالم میں اپنا منہ پیٹ رہا تھا اور اپنے سر کے بال نوچ رہا تھا رو رہا تھا، چلا رہا تھا۔ اس کی آواز کبھی بالکل ہلکی ہو جاتی تھی اور کبھی بلند ہو جاتی تھی اور کبھی صرف سینے میں گھٹ کر رہ جاتی تھی لیکن اس کی آواز کو سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے چاروں طرف دور دور تک کوئی انسان موجود نہیں تھا۔

اس عالم میں نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ مسافر خانے کے بوڑھے ملازم سے اپنی ماں اور صفدر علی کے بارے میں سننے کے بعد اس پر جو ایک خون آشام جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی، اس میں کافی کمی ہو گئی۔ رونے، چلانے اور اپنا سر اور منہ پیٹنے اور بال نوچنے کے بعد اب وہ اپنے آپ پر اس حد تک قابو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ اس کا ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔

اس رات مسافر خانے میں اس نے بوڑھے ملازم سے صفدر علی کے بارے میں ایک آخری سوال پوچھا۔ ''کیا اس گاؤں میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جسے صفدر علی کا کراچی کا پتہ معلوم ہو؟ ہو سکتا ہے میں اگلے چند ماہ بعد کراچی جاؤں تو میں اپنے باپ کے پرانے دوست سے بھی ملاقات کر لوں گا۔ میرے والد اس کا بہت ذکر کرتے تھے۔''

''نہیں بیٹا۔'' بوڑھے ملازم نے کہا۔ ''کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔ کراچی جانے کے بعد وہ ادھر دوبارہ کبھی نہیں آیا۔ البتہ صابرہ کی بیٹی دردانہ جو صابرہ کے پہلے شوہر کی اولاد ہے۔ گوجرانوالہ میں رہتی تھی۔ اس کے میاں کا نام خیرالدین ہے اور اس کا شاید کوئی موٹر گیراج وغیرہ ہے۔ یہاں کسی کو ٹھیک سے نہیں معلوم کہ وہ لوگ اب بھی گوجرانوالہ میں ہی رہتے ہیں یا نہیں۔''

فرید اگلی صبح خاموشی سے گوجرانوالہ روانہ ہو گیا۔ وہاں تلاش بسیار کے بعد اس نے خیرالدین کا موٹر گیراج تلاش کر لیا اور خیرالدین کو بھی۔ اس نے صفدر علی کے سالے بشیر الدین اور اس کے خاندان کے تمام لوگوں کو اپنے بچپن میں چکوال میں دیکھا تھا اور جب اس نے برسوں کے بعد خیرالدین کو دیکھا تو اس نے اس کی شکل وصورت میں بچپن کے گم گشتہ خدوخال کو تلاش کر لیا لیکن خیرالدین کے لیے اس کو پہچاننا ناممکن تھا۔ اس نے خیرالدین سے اپنا تعارف صفدر علی کے ایک پرانے دوست کے بیٹے کے طور پر کرایا اور کہا کہ وہ اپنے مرحوم باپ کی ہدایت اور خواہش کے مطابق اس سے ملنا چاہتا ہے۔ خیرالدین اس کے ساتھ بہت خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آیا۔

''ماموں کو کراچی گئے ہوئے کافی لمبا عرصہ گزر گیا۔'' اس نے فرید سے کہا۔ ''بدقسمتی سے ہمارا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور ہمیں ان کا موجودہ پتہ نہیں معلوم ہے۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ جب وہ نصیر پور سے گئے تھے تو کراچی میں کوئی علاقہ ہے محمود آباد، وہاں رہتے تھے۔ مکان نمبر وغیرہ ہمیں نہیں معلوم، اور اب وہ لوگ کہاں رہ رہے ہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم.....''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے جناب۔" فرید نے کہا۔ "آپ کا شکریہ..... میں چلتا ہوں۔"

خیرالدین نے فرید کو، جس نے اپنا نام مشتاق بتایا تھا۔ کھانے پر روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن "مشتاق" نے انکار کر دیا۔ نصیر پور آنے کے بعد سے اس کو ہر کھانا زہر میں ڈوبا ہوا لگتا تھا اور وہ زہر کم سے کم کھانا چاہتا تھا۔

اور اب اس کی بے لگام وحشت، اس کے رگ و پے میں بھڑکتا ہوا جنون، اس کی بے قابو شوریدہ سری، اس کو کراچی کی طرف دھکیل رہی تھی۔ وہ کراچی جانا چاہتا تھا۔ اس کو صرف ایک سراغ مل سکا تھا محمود آباد..... اس نے کراچی جا کر صفدر علی کو تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ گوجرانوالہ میں اس نے صرف ایک دن قیام کیا اور پھر وہیں سے وہ کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔

روز رات کو نظر آنے والا منظر اب اور بھی زیادہ بھیانک ہو گیا تھا۔ اب اسے صفدر علی کا جو چہرہ نظر آتا تھا۔ اس میں کچھ تبدیلی ہو گئی تھی۔ چھری ہاتھ میں لیے ہوئے ابا کے جسم پر وار کرتے ہوئے صفدر علی کے چہرے پر ایک استہزائیہ اور حقارت آمیز مسکراہٹ بھی تھی۔ جس میں صابرہ کو اپنی بیوی بنا لینے کا غرور شامل تھا۔ یہ استہزائیہ، پُرغرور اور فاتحانہ مسکراہٹ فرید کو لمحہ بہ لمحہ ہلاک کیے ڈال رہی تھی۔

☆======☆======☆

فرید کراچی پہنچا تو اس پر یکبارگی اس شہر کا خوف طاری ہو گیا..... اس نے کراچی کے بارے میں صرف سنا ہی سنا تھا۔ وہ کبھی اس شہر میں نہیں آیا تھا۔ اب جو اس نے اس کی سرزمین پر قدم رکھا تو یہاں ہر طرف بے تحاشا اُمڈتے ہوئے انسانوں کو دیکھ کر اس کی عقل حیران ہو گئی۔ یا خدا..... ! یہ شہر تھا یا کوئی پاگل خانہ..... ہر شخص پیدل یا کسی سواری میں دیوانوں کی طرح کسی نامعلوم سمت میں بھاگا چلا جا رہا تھا۔

اگلے کئی دن تو اسے اپنی حیرت پر قابو پانے میں گزر گئے۔ وہ کینٹ اسٹیشن کے علاقے میں ایک سستے اور معمولی سے مسافر خانے میں ٹھہر گیا تھا، لیکن اسے اندازہ تھا کہ وہ کوئی کام دھندہ کیے بغیر زیادہ دنوں تک یہاں کے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔

اسے کراچی کے علاقوں اور محلوں کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ محمود آباد ایک ایسا چھوٹا سا محلّہ ہو گیا جہاں کسی بھی شخص کو تلاش کرنا آسان ہو گا، لیکن جب ایک رکشا میں بیٹھ کر وہ محمود آباد پہنچا تو اس کا دماغ چکر کھانے لگا۔ اس کے چاروں طرف دور دور تک پھیلا ہوا محمود آباد ہی محمود آباد تھا اور اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی تلاش کا آغاز کہاں سے کرے، محمود آباد تو خود اپنی جگہ پر ایک پورا شہر معلوم ہو رہا تھا۔

صبح سے لے کر شام تک وہ محمود آباد کی گلیوں میں بھٹکتا رہا، لیکن کوئی بھی شخص اسے چکوال سے آ کر یہاں رہنے والے صفدر علی اور اس کی بیوی کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا۔ لوگ اس سے مکان کا نمبر وغیرہ پوچھتے تھے۔ اسے تو کچھ بھی نہیں معلوم تھا سوائے صفدر علی اور چکوال کے نام کے۔

تھک ہار کر شام کو وہ واپس مسافر خانے چلا گیا تھا۔ پہلے ہی دن کے تجربے سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کراچی میں صفدر علی کی تلاش ایسی ہی ہو گی جیسے سمندر میں کسی قطرے کی تلاش..... اس پر سخت مایوسی طاری ہو گئی، لیکن اس مایوسی نے اس کے جنون اور اس کی وحشت میں کوئی کمی نہیں کی تھی بلکہ اضافہ کیا تھا۔

وہ ہفتوں محمود آباد کے گلی کوچوں میں بھٹکتا رہا، بلوچ کالونی کے پاس سے شروع ہو کر کالا پل تک پھیلا ہوا لاکھوں کی آبادی کا علاقہ اپنی جگہ پورا شہر تھا۔ وہ صفدر علی کو نہ ڈھونڈ سکا۔ دراصل صفدر علی جس مکان میں کرائے پر کچھ عرصے کے لیے آ کر رہا تھا۔ اب نہ وہ مکان باقی تھا نہ اس کا مالک..... مالک کب کا مر چکا تھا اور مکان کی جگہ دکانیں بن گئی تھیں۔ کسی کو یاد بھی نہیں تھا کہ یہاں کبھی کوئی مکان تھا۔

محمود آباد میں صفدر علی کی تلاش میں ناکامی کے بعد فرید کی زندگی کے ایک مزید سخت اور بھیانک دور کا آغاز ہو گیا، ناکامی نے اس کی جھنجلاہٹ، خشونت اور مردم بیزاری میں اور بھی زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا بس ایک تلاش تھی جو اسے زندگی کے صحرا میں اِدھر سے اُدھر بھٹکاتی پھر رہی تھی۔

سال پر سال گزرتے گئے اور وہ اسی طرح بھٹکتا رہا، وہ کراچی کے مختلف علاقوں میں رہ کر صفدر علی کو ڈھونڈتا پھرا۔ وہ مشینوں پر کڑھائی کے کام کا ماہر کاریگر تھا اور اسے مختلف کارخانوں میں بڑی آسانی کے ساتھ کام مل جاتا تھا۔

کام کرنا اور صفدر علی کو تلاش کرنا بس اس کے علاوہ زندگی میں اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ویران اداس اور تنہا راتوں میں اس کی آنکھوں کے سامنے فیروزہ کا ہنستا مسکراتا، دمکتا ہوا چہرہ ابھرتا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھانسی پر لٹکے ہوئے ایک مسخ شدہ مردہ چہرہ میں بدل جاتا اور اس کے پیچھے سے صفدر علی کا چہرہ ابھرتا۔ جس پر ایک پُرغرور اور فاتحانہ مسکراہٹ موجود ہوتی۔ صفدر علی کے ہاتھ میں اس کی ماں کا ہاتھ ہوتا۔ فرید کو اپنے باپ کی اور فیروزہ کی لاشوں پر ہنستے ہوئے صفدر علی اور اپنی ماں کے چہرے نظر آتے اور پھر سارے چہرے،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سارے مناظر آہستہ آہستہ غائب ہو جاتے اور صرف صفدر علی کا چہرہ باقی رہ جاتا۔ بھیانک خون آشام اور پُرغرور مسکراہٹ لئے ہوئے۔ فرید پر ایک تشنجی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس کے ہاتھوں، پیروں میں اینٹھن ہونے لگتی اور دماغ جیسے پھٹنے لگتا۔ اسے یوں لگتا جیسے اس کے دماغ کے ٹکڑے اڑ جائیں گے۔ اس کا رواں رواں ایک ایسی آگ میں جلنے لگتا جسے وہ کسی طرح نہیں بجھا پا رہا تھا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اسے تمام انسانوں سے نفرت ہو گئی تھی، لیکن وہ تمام انسانوں سے لاتعلق ضرور ہو گیا تھا۔ اس کی اپنی ایک آگ تھی جس میں وہ رات دن جلتا اور سلگتا رہتا تھا۔ وہ جہاں بھی جا کر رہتا تھا یا کام کرتا تھا۔ وہاں ایک مکمل اجنبی کی طرح رہتا تھا۔ وہ نہ کسی کو اپنے بارے میں کچھ بتاتا تھا نہ خود کسی کے بارے میں جاننے کی کوئی خواہش رکھتا تھا۔ ہمیشہ قائم رہنے والی برہمی نے اس کے چہرے کے نقوش کو کرخت اور درشت بنا دیا تھا۔ وہ کسی کا دوست نہیں تھا۔ نہ اس کا کوئی دوست تھا۔ فیروزہ کے ساتھ محبت میں ناکامی کے بعد پھر نہ اس نے کسی دوسری لڑکی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا نہ شادی کے بارے میں سوچا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے دنیا کے تمام لطیف و نرم جذبات کے لیے اپنے دل کے دروازے بند کر لیے تھے۔ وہ پتھر ہو گیا تھا اور اس کے پتھریلے پن میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی وحشت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

کراچی کے گلی کوچوں کی خاک چھانتے ہوئے اس کی جوانی ڈھل گئی۔ وہ سن رسیدگی کی منزل میں داخل ہو گیا۔ آلام کے پیچاک میں لپٹا ہوا اس کا وجود ایک چلتے پھرتے الاؤ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس دوران کئی لڑکیوں اور عورتوں نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ برسرِ روزگار تھا۔ ہنرمند تھا۔ بیوی، بچوں کا بوجھ برداشت کر سکتا تھا۔ بہت سے والدین اور بھائیوں نے اسے اپنی بیٹی یا بہن کے لیے اپنانے کی کوشش کی لیکن اس کے پتھریلے وجود میں کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی زندگی کا بس ایک ہی مقصد رہ گیا تھا۔ صفدر علی کی تلاش اور اس کی ہلاکت.....!

یہ خونی مقصد اسے برسوں تک دربدر کی خاک چھنواتا رہا۔ وہ کراچی میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں بھاگتا رہا اور انسانوں کے اس زبردست بحرِ ذخار میں ایک ایسے قطرے کو تلاش کرتا رہا جو نہ جانے کہاں اور کس طرف بہہ رہا تھا۔ منہ زور سمندر کے تھپیڑوں نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ اس کے سر کے بال خشک اور مردہ گھاس میں

تبدیل ہو گئے۔ جلد کی رنگت جھلس گئی۔ آنکھیں میں بیابان اتر آئے اور چہرے پر جھریاں نمودار ہونے لگیں، لیکن صفدر علی اسے کہیں نہیں مل سکا۔

برسوں تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد ان دنوں وہ ڈرگ کالونی میں رہ رہا تھا اور وہیں ایک کارخانے میں کام کر رہا تھا۔ اسے یہاں رہتے اور کام کرتے ہوئے چار سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور اب وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کارخانے سے کام چھوڑ دے اور کسی دوسرے علاقے میں چلا جائے کہ وہ کارخانہ ہی بند ہو گیا۔ تین بھائی مل کر چلا رہے تھے اسے، ان تینوں میں آپس میں جھگڑا ہو گیا اور کارخانہ کچھ عرصے کے لیے بند ہو گیا۔ خیال تھا کہ جلد ہی بھائیوں میں کوئی تصفیہ ہو جائے گا اور کارخانہ دوبارہ چالو ہو جائے گا، لیکن فرید کو انتظار کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اسے نہ تو اس علاقے سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس کارخانے سے..... اس نے چند دن کے اندر اندر لانڈھی کے ایک کارخانے میں کام حاصل کر لیا۔ کچھ دنوں تک تو وہ ڈرگ کالونی میں ہی رہا۔ وہ وہاں ایک کوارٹر کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ اس نے لانڈھی میں رہائش کی تلاش جاری رکھی۔ اسے لانڈھی میں تو رہائش نہیں ملی البتہ کورنگی میں اسے ایک کوارٹر کا ایک کمرہ کرائے پر مل گیا۔ وہ اگلے ہی دن وہاں منتقل ہو گیا۔

زندگی کے خارزار میں بھاگتے بھاگتے اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے اور اعضاء جیسے شل ہو کر رہ گئے تھے۔ زندگی کے ویران صحرا میں ایک موہوم اور ڈراؤنی پرچھائیں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اس کا دل ہر قسم کے لطیف احساسات سے یکسر عاری ہو چکا تھا۔

اس میں اب بہت زیادہ بھاگتے رہنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ مسلسل ناکامی اور بڑھتی ہوئی عمر اس کی توانائی کو متاثر کر رہی تھی۔ کارخانے میں کام ختم کرنے کے بعد وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک اِدھر اُدھر کا چکر لگاتا۔ راہ میں ملنے والے انسانوں کے چہروں میں ایک برسوں پہلے گم ہو جانے والے چہرے کو تلاش کرتا اور پھر مایوس ہو کر واپس آ جاتا۔

کورنگی آنے کے بعد ایک دن اچانک اس کو وہ چہرہ نظر آ گیا۔

اس نے اس شخص کو گلی میں اس کے گھر کے باہر چبوترے پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ اس کے مالک مکان فرقان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ فرید کے قدم جہاں کے تہاں تھم گئے۔ اس کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی کے عالم میں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہاں وہ شخص

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صفدر علی تھا..... یہ صفدر علی کا چہرہ تھا..... فرید نے آخری بار جب صفدر علی کو دیکھا تو وہ اپنے جسم پر یہی چہرہ سجائے ہوئے تھا، لیکن وہ اس موجودہ چہرے کے مقابلے میں زیادہ عمر رسیدہ تھا۔

لیکن کیا وہ صفدر علی ہوسکتا تھا؟ فرید کے دل میں ایک لرزش پیدا ہوئی اور وہ اس شخص کو گھورتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس شخص نے اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے فرقان نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

اپنے کمرے میں آکر بستر پر گر جانے کے بعد اس نے ان دونوں چہروں کا موازنہ کرنا شروع کیا۔ یہ چہرہ جو اس نے ابھی دیکھا، یہ ایک جوان آدمی کا چہرہ تھا۔ جبکہ صفدر علی کے چہرے کو تو اب ایک بہت بوڑھا چہرہ ہونا چاہئے تھا۔ فرید خود بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو رہا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ صفدر علی بوڑھا ہی نہ ہوا ہو۔ بلکہ اس وقت کے مقابلے میں یہ چہرہ زیادہ کمسن اور جوان نظر آرہا تھا تو کیا صفدر علی نے کسی معجزے کے تحت وقت کی لکیر پر آگے کے بجائے پیچھے کی جانب سفر کیا تھا اور وہ مزید بوڑھا ہونے کے بجائے مزید جوان ہوگیا تھا؟

اس نے اس خیال کو اپنے دماغ سے جھٹک دیا۔ نہیں! ناممکن تھا۔ وہ شخص صفدر علی نہیں ہوسکتا تھا۔ صفدر علی کے سر کا تو اب ایک ایک بال بالکل سفید ہو جانا چاہئے تھا۔ اس شخص کے سارے بال کالے تھے۔ اس کی مونچھیں بھی بالکل سیاہ تھیں۔

یہ بات طے تھی کہ وہ شخص صفدر علی نہیں ہوسکتا تھا یہ..... ایک اتفاق تھا کہ اس شخص کی شکل صفدر علی سے اس قدر ملتی تھی کہ اس پر صفدر علی کا گمان ہوتا تھا۔ چہروں کی اس قسم کی غیر معمولی مشابہت کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ فرید نے ایسے کئی لوگ دیکھے تھے جن کا آپس میں دور و نزدیک کا کوئی بھی تعلق نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود ان کی شکلوں میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی تھی۔

اس نے اس بات کو بھول جانے کی کوشش کی اور اس شخص کے بارے میں کچھ بھی نہیں جاننا چاہا، وہ شخص صفدر علی نہیں تھا بس اتنا کافی تھا۔ اس شخص کا نام حیدر علی تھا اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ فرید کو اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم تھا۔

اس کے بعد اسے اکثر حیدر علی نظر آتا اور حیدر علی کو دیکھتے ہی فرید کی عجیب کیفیت ہو جاتی۔ اس کے دماغ میں لاوا پکنے لگتا اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتیں اور وہ اپنے دل

میں اس شخص کے لیے جس سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ شدید ترین نفرت محسوس کرتا۔ اس کا جی چاہتا کہ جھپٹ کر جائے اور دونوں ہاتھوں سے حیدر علی کا گلا گھونٹ دے۔ اس شخص کی شکل ہو بہو صفدر علی جیسی تھی اور اس لیے اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ حیدر علی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔

فرید کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ حیدر علی سے اس کا سامنا نہ ہو۔ مگر مشکل یہ تھی کہ وہ کم بخت عام طور سے اپنے گھر کے چبوترے کے باہر بیٹھا رہتا تھا اور فرید کے گھر آنے جانے کا راستہ ہی وہی تھا۔ پھر بھی فرید کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کی طرف نہ دیکھے اور منہ پھیر کر نکل جائے۔ محلے کے دیگر لوگوں کی طرح وہ اس شخص سے بھی کوئی ربط ضبط نہیں رکھتا تھا۔ مگر اس دن تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے حیدر علی کو اپنے مکان کے باہر چبوترے پر اکیلا بیٹھا ہوا پایا۔ کچھ لوگ وہاں سے کچھ دور کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ قریب پہنچتے ہی غیر ارادی طور پر فرید کی نظریں حیدر علی کی طرف اٹھ گئیں۔ حیدر علی اس کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

یکبارگی فرید کے سارے وجود میں ایک آگ بھڑک اٹھی۔ حیدر علی کا چہرہ مکمل طور پر صفدر علی کا چہرہ بن گیا۔ صفدر علی اسے دیکھ کر تحقیر اور استہزاء کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ شان تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''دیکھ لے بیٹا دیکھ لے..... میں نے تیرے باپ کو تو ختم کر ہی دیا اور تیری ماں کو بھی نہیں چھوڑا۔ تیری ماں اب میری عورت ہے..... ہی ہی ہی.....'' صفدر علی بڑے زور سے ہنسا۔ اس کی شکل بہت بھیانک ہوگئی تھی اور اس کے لمبے لمبے نوکیلے اور خونخوار دانتوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

پھر فرید کے دماغ میں دھواں بھر گیا۔ اسے تن بدن کا کچھ ہوش نہیں رہا۔ اس نے جنون کی کیفیت میں قریب پڑی ہوئی بھاری آہنی سلاخ اٹھائی اور اسے پوری قوت کے ساتھ حیدر علی کے سر پر دے مارا اور جب وہ حیدر علی کے سر پر وار کر رہا تھا تو اس کو اور وہاں موجود لوگوں میں سے کسی کو بھی یہ بات نہیں معلوم تھی کہ حیدر علی اس کا چھوٹا سوتیلا بھائی ہے اور اس کی ماں صابرہ اور اس کے دوسرے شوہر صفدر علی کا بیٹا ہے اور صفدر علی اور صابرہ برسوں پہلے مر چکے ہیں۔

فرید کو جب لوگوں نے دوڑ کر پکڑا تو فرید کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے وجود کے اندر برسہا برس سے بھڑکی ہوئی تیز و تند آگ یکبارگی سرد پڑ گئی ہے۔ وہ خود کو بالکل ٹھنڈا محسوس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رہا تھا اور اب زندگی بھی بے معنی بے مقصد ہوگئی تھی۔ اب تو زندہ رہنے کی ضرورت نہیں بھی نہیں تھی۔

☆======☆======☆

ماریہ بلگرامی نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ اس انتہائی الجھی ہوئی داستان کو صاف اور سادہ انداز میں اس طرح مرتب کیا کہ اس کے تمام خفیہ گوشے اور سارے اسرار و رموز منکشف ہوگئے۔

جس میٹنگ میں یہ تفصیلی رپورٹ دو مرحلوں میں پیش کی گئی، اس میں شریک ہونے والوں میں ڈی ایس پی غلام نبی، سب انسپکٹر اشرف علی، لیڈی سب انسپکٹر خالدہ مکرم اور اسسٹنٹ سب انسپکٹر جواد حسین شامل تھے۔

جب دوسری میٹنگ میں رپورٹ کا دوسرا آخری حصہ پڑھ گیا تو کچھ دیر تک فضا میں گہری خاموشی طاری رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سب لوگ سحر زدہ ہو کر بولنا بھول گئے ہوں۔

''تمہاری محنت اور جانفشانی کی داد نہیں دی جاسکتی ماریہ.....!'' آخر ڈی ایس پی غلام نبی نے اس گہرے سکوت کو توڑا۔ ''تم نے اور خالدہ نے کس قدر دور جا کر اور کتنی گہرائی میں چھپے ہوئے حقائق کو نکالا ہے اور اب اس ساری داستان کے صرف ان حصوں کو عدالت کے سامنے لانا ہے جن کا فرید کی زندگی سے اور اس کی اس مخصوص نفسیاتی کیفیت کی تشکیل سے تعلق ہے۔ تم نے اس قدر شدید محنت ایک ایسے انسان کو موت سے بچانے اور اسے زندگی کی طرف واپس لانے کے لیے کی ہے جو خود زندگی سے متنفر تھا اور مر جانا چاہتا تھا۔''

''یہ سب کچھ تو کسی طلسماتی داستان کی طرح حیرت انگیز اور ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے۔'' ایس آئی اشرف علی نے کہا۔

''لیکن یہ پریوں کی طلسماتی داستان نہیں ہے۔'' ڈی ایس پی غلام نبی نے بھاری آواز میں گہری افسردگی کے ساتھ کہا۔ ''یہ جیتے جاگتے انسانوں کے ان المیوں کی پیچ در پیچ داستان ہے جو ہمارے چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں، لیکن جن کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں۔ اوپری سطح پر جو لہریں ہلکورے لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ذرا ان کو ہٹا کر گہرائی میں جھانک کر دیکھو تو کیسے کیسے زور آور طوفان نظر آتے ہیں۔''

''باہم مربوط داستانوں کے اس سلسلے میں ہمیں انسانی رشتوں کے کتنے ہی عجیب و غریب پہلو نظر آتے ہیں۔'' اے ایس آئی جواد حسین نے کہا۔

''اور اب، جبکہ ملزم کے بارے میں بہت کچھ تفصیل سے معلوم ہو چکا ہے اور ملزم قانون کے ساتھ تعاون کرنے پر بھی آمادہ ہے تو پھر ملزم کو عدالت میں لے جانے کے لیے اس کا کیس بڑی محنت اور ہوشیاری کے ساتھ تیار کرنا ہوگا۔'' ڈی ایس پی غلام نبی نے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں سرکاری وکیل سے بھی بات کرلوں گا۔ وہ بھی انسانی بنیادوں پر ملزم کی مدد کرے گا..... قانون کا بنیادی مقصد انسان کی مدد کرنا ہے۔ انسان کی مدد کرنے کے لیے کبھی اس کو سزا دینا ضروری ہوتا ہے تو کبھی اس کو سزا سے بچانا بھی ضروری ہوتا ہے''

☆======☆======☆

ماریہ بلگرامی اور خالدہ مکرم کافی دنوں کے بعد ایک بار پھر حیدر علی کی بیوہ زرینہ کے گھر میں موجود تھیں۔ انہوں نے فرقان کی بیوی زبیدہ کو بھی وہاں بلوایا تھا۔ زبیدہ خاص طور سے پریشان ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں اب اور کیا پوچھ گچھ ہونے والی تھی۔

''ہم نے اس کیس کو پورے طور سے حل کرلیا ہے۔'' خالدہ مکرم نے زرینہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اور اب یہ معاملہ باقاعدہ طور پر عدالت میں آنے والا ہے۔ ہم لوگ تمہارے پاس اس لیے آئے ہیں کہ تم کو بتا دیں کہ فرید نے تمہارے شوہر کو کیوں قتل کیا تھا۔ یہ قتل بلاوجہ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ایک لمبی کہانی تھی۔ ہم تم کو مختصراً بتائیں گے۔ یہ بتاؤ زرینہ کہ تم نے اپنے سسر صفدر علی مرحوم کو تو دیکھا ہوگا۔ تمہیں ان کی شکل یاد ہے؟''

''یاد کیوں نہیں ہے۔'' زرینہ نے فوراً جواب دیا۔ ''میرے میاں کو اٹھاؤ اور ان کو بٹھاؤ..... بالکل میرے میاں کی شکل کے تھے۔ بڑے بھائی اکبر علی کی شکل تو اپنے باپ سے بالکل نہیں ملتی تھی، لیکن میرے میاں اپنے باپ کے ہم شکل تھے، لیکن آپ میرے سسر کی شکل کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''اس لیے کہ تمہارے سسر نے برسوں پہلے فرید کے باپ کو قتل کیا تھا چکوال میں اور اس فوراً بعد فرید گھر سے بھاگ گیا تھا۔ بعد میں صفدر علی نے فرید کی ماں صابرہ سے شادی کرلی تھی۔ فرید برسوں سے صفدر علی کی تلاش میں تھا اور اسے مار کر اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ وہ صفدر علی کو تو تلاش نہ کرسکا، لیکن اسے جب ایک ایسا شخص نظر آیا جس کی شکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صفدر علی سے ملتی جلتی تھی تو اس نے جنون کے عالم میں اسے قتل کر دیا اور ایسا کرتے وقت اسے یہ قطعی نہیں معلوم تھا کہ حیدر علی اس کا سوتیلا چھوٹا بھائی اور اس کی ماں اور صفدر علی کا بیٹا ہے۔''

''نہیں.....'' زرینہ بڑے زور سے چیخی۔ س کی آواز اس کے گلے میں پھنس رہی تھی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ فرید، حیدر علی کا بھائی ہے؟ صابرہ بیگم کا بیٹا.....؟''

''ہاں زرینہ.....!'' ماریہ بولی۔ ''ہم لوگوں نے ہفتوں اور مہینوں کی بھاگ دوڑ کے بعد سارے حالات معلوم کر لیے ہیں۔ بے شک فرید کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ حیدر علی اس کے باپ کے قاتل صفدر علی کا بیٹا ہے۔ اس نے حیدر علی کو صرف اس لیے قتل کر دیا کہ اس کی شکل صفدر علی سے ملتی تھی اور فرید برسوں کی لمبی تلاش اور بھاگ دوڑ کے باوجود صفدر علی کو تلاش نہیں کر پایا تھا۔ قسمت کا پھیر دیکھو، وہ کراچی میں اس محلے میں آ کر رہا جہاں صفدر علی اور صابرہ کا انتقال ہو چکا تھا اور فرید کو ان ساری باتوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ تمہارے میاں کی یہ بدنصیبی تھی کہ وہ اپنے باپ کا ہم شکل تھا اور صرف اسی وجہ سے وہ فرید کے قاتلانہ جنون کی بھینٹ چڑھ گیا۔''

زرینہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ زبیدہ دم بخود تھی..... وہ بولنا چاہتی تھی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''تمہیں یہ سب کچھ بتانا اس لیے ضروری تھا کہ جب تم گواہی کے لیے عدالت میں آؤ تم تمہیں وہاں یہ باتیں سن کر زیادہ حیرانی نہ ہو۔'' خالدہ مکرم نے کہا۔ ''تم کو یہ بات پہلے سے معلوم ہو جانی چاہئے کہ فرید نے تمہارے میاں کو کیوں قتل کیا تھا..... تمہیں عدالت میں پہنچ کر کسی نئے صدمے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔''

زرینہ اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں سینکڑوں سوالات اٹھ رہے تھے، لیکن خالدہ مکرم اور ماریہ بلگرامی نے اس گفتگو کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ان کے پاس ساری تفصیلات بیان کرنے کا وقت نہیں ہے اور یہ کہ عدالت میں سماعت کے دوران بیشتر واقعات کی تفصیل سامنے آ جائے گی۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ان کے بیان کے بغیر کیس کی صحیح تصویر سامنے نہیں آ سکے گی۔

''البتہ ایک ضروری بات سن لو۔'' ماریہ بلگرامی نے کہا۔ ''فرید نے اپنی زبان کھول دی ہے اور اب وہ قانون کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونی

چاہئے کہ ہم اس کے صدمات کو سمجھیں اور اگر ممکن ہو تو اس سے ہمدردی بھی کریں۔''

دونوں خواتین چلی گئیں۔ زرینہ اور زبیدہ نے ان کی زبانی جو کچھ سنا تھا۔ وہ ان کے دلوں کو دہلا دینے کے لیے ان کو پاگل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ زرینہ کا شوہر اور اس کا قاتل ایک دوسرے کے سوتیلے بھائی تھے اور دونوں میں سے کوئی بھی اس حقیقت سے باخبر نہیں تھا۔

اگلے دن شام تک یہ خبر پوری گلی میں اور آس پاس کی تمام جگہوں میں پھیل چکی تھی کہ حیدر علی کا قاتل اس کا سوتیلا بھائی ہے اور فرید کو اصل تلاش تو صفدر علی کی تھی جو اس کے باپ کا قاتل تھا، لیکن وہ اسے تلاش نہیں کر سکا اور اس نے غیظ و غضب کے عالم میں ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا جس کی شکل قاتل سے ملتی جلتی تھی۔

قتل کے اس واقعے کی بازگشت کورنگی کے اس علاقے کی گلیوں میں ایک بار پھر سنائی دینے لگی، لیکن اس بار اس کے ساتھ بہت سی نئی معلومات بھی شامل تھیں اور جس گلی میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ وہاں کے تو ایک ایک گھر میں اس کا ذکر اور اس پر خیال آرائی ہو رہی تھی۔

اس روز زرینہ نے اپنے گھر کے دروازے پر کسی رکشا کے پھٹپھٹا کر رکنے کی آواز سنی اور اس کے ذرا دیر بعد دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ زرینہ خود اٹھ کر دروازے تک پہنچی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر ایک بوڑھی عورت ایک چمڑے کا اٹیچی کیس اور ایک گٹھری لئے کھڑی تھی۔ زرینہ نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ یہ ایک جانا پہچانا چہرہ تھا، لیکن زرینہ کو فوری طور پر یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اس کو کہاں دیکھا ہے۔

''زرینہ بیٹی.....!'' اچانک اس بوڑھی عورت نے کہا۔ ''پہچان نہیں رہی ہو مجھے؟ ارے میں شکوراں ہوں..... شکوراں.....''

''خالہ شکوراں.....؟'' زرینہ کے دماغ میں ایک دم سے بجلی کوندی۔ اسے وہ بوڑھی عورت فوراً ہی یاد آ گئی جو اس کی سسرال کا ایک حصہ تھی اور جو اس کی شادی کے کچھ ہی عرصے بعد وہاں سے چکوال چلی گئی تھی جہاں کی وہ رہنے والی تھی۔

''ہاں..... ہاں..... خالہ شکوراں۔'' شکوراں نے زور سے کہا اور زرینہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ کتنے ہی پرانے زخم ایک بار پھر کھل گئے۔ خالہ شکوراں جب یہاں سے گئی تھی تو اس وقت صابرہ بھی زندہ تھی اور حیدر علی تو خود خالہ شکوراں کو اسٹیشن تک چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں عزیز ہستیاں اس دنیا میں موجود نہیں تھیں۔

زرینہ، خالہ شکوراں کے سینے سے لگ گئی اور وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر زاروقطار رونے لگیں۔ ''ارے میں نے تو اسے گودیوں میں کھلایا تھا۔'' شکوراں رو رو کر کہہ رہی تھی۔ ''میں تو اپنے ہاتھوں سے اس کے سارے کام کرتی تھی۔ اسے خود نوالے بنا بنا کر کھلاتی تھی..... اسے بھی اور اکبر علی کو بھی..... ہائے بھلا یہ بھی کوئی اس کے مرنے کے دن تھے..... ارے موت تو مجھ بڑھیا کو آنی چاہئے تھی جواب تک نہ جانے کیوں زندہ بیٹھی ہے؟''

بہت دیر کے بعد جب گریہ زاری اور نالہ وشیون کا یہ اضطراری طوفان تھما تو شکوراں برآمدے میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی اور دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔

''میں تو یہاں سے ایسی گئی کہ پھر آ ہی نہ سکی۔ صابرہ کی موت کی اطلاع مجھے ایک مہینے کے بعد ملی۔ فیضان اللہ کے خط سے معلوم ہوا تھا اور حیدر علی کے مارے جانے کی خبر بھی ابھی تھوڑے دنوں پہلے ملی۔ بس میں نے سوچا کہ جا کر پُرسہ تو دے آؤں۔ چند روز رہ کر واپس چلی آؤں گی۔''

''کیوں خالہ شکوراں.....؟'' زرینہ نے کہا۔ ''واپس کیوں چلی جاؤ گی؟ تم تو یہیں رہتی تھیں..... یہی تمہارا گھر ہے..... اب آ گئی ہو تو واپس نہ جانا۔''

''جیتی رہو بیٹی.....! خدا تمہاری عمر دراز کرے، مگر اب میں عمر کی اس منزل میں ہوں کہ کسی وقت بھی بلاوا آ سکتا ہے اور میں وہیں مرنا چاہتی ہوں جہاں میں نے جنم لیا تھا۔ اسی مٹی میں مل جانا چاہتی ہوں۔ تم لوگوں سے ملنے چلی آئی ہوں..... خدا حیدر علی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ وہ بے چارہ تو کیسا نیک بچہ تھا۔''

''تمہیں ان کی موت کے بارے میں کس نے اطلاع دی خالہ شکوراں.....؟''

''پولیس والے آئے تھے میرے پاس نصیر پور میں۔'' شکوراں نے کہا۔ ''چکوال کے پاس گاؤں ہے۔ ان میں کراچی سے آنے والی دو عورتیں بھی شامل تھیں۔ وہ بھی پولیس والیاں تھیں۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں سارے گڑے مردے اکھاڑ کر رکھ دوں۔ وہ لوگ اس قتل کی تحقیقات کر رہے تھے۔''

''اچھا تو ان لوگوں نے وہاں تک پہنچ کر تفتیش کی ہے؟'' زرینہ نے حیرت سے کہا۔

''انہوں نے ہی مجھے بتایا ہے کہ قاتل فرید مقتول حیدر علی کا سوتیلا بھائی تھا۔ دونوں کی ماں

ایک ہی تھی۔''

''ہاں بیٹی.....!'' شکوراں نے کہا۔ ''یہ بات میں نے ہی انہیں بتائی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ کراچی آنے سے پہلے صابرہ نے، صفدر علی نے اور میں نے ہم سب نے مل کر یہ طے کیا تھا کہ ہم کراچی جا کر بالکل نئی زندگی شروع کریں گے اور ساری پرانی باتوں کو بھول جائیں گے، اور ہم نے سب کچھ بھلا بھی دیا۔ مگر پرانی دشمنی پھر بھی ہماری جان کو آ گئی..... فرید، صفدر علی کو تو نہ تلاش کر سکا، لیکن اپنے باپ کے قتل کا بدلہ اس نے صفدر علی کے بیٹے کو قتل کر کے لے لیا۔''

''نہیں خالہ شکوراں.....!'' زرینہ نے کہا۔ ''ایسا نہیں ہے۔ پولیس والوں نے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ فرید کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ حیدر علی اس کا سوتیلا بھائی اور صفدر علی کا بیٹا ہے۔''

''اچھا؟'' شکوراں نے حیرت سے کہا۔ ''تو پھر اس نے حیدر علی کو کیوں مار دیا؟''

''اس لیے کہ حیدر علی کی شکل بالکل اپنے باپ کی سی تھی۔'' زرینہ نے کہا۔ ''فرید کو اس چہرے سے نفرت تھی۔ اس نے صفدر علی کے بیٹے کو نہیں بلکہ صفدر علی کے چہرے کو قتل کیا ہے۔''

محلے کے سارے ہی پرانے لوگ خالہ شکوراں سے واقف تھے۔ خالہ شکوراں کی برسوں بعد واپسی کی خبر محلے میں پھیل گئی اور بہت سی عورتیں اس سے ملنے کے لیے آئیں۔ انہوں نے خالہ شکوراں سے بہت کچھ جاننا چاہا، لیکن خالہ شکوراں ایک جہاندیدہ اور رکھ رکھاؤ والی عورت تھی۔ وہ اس خاندان کا ایک جزو تھی اور اس نے اس کے احترام کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا تھا۔ اب بھی اس نے اس کے احترام میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ اس نے محلے کے گھروں میں صفدر علی اور صابرہ کے کوئی بکھان نہیں کیے۔ لوگوں کو بس اتنا ہی معلوم ہو سکا جتنا کہ خالہ مکرم اور ماریہ بلگرامی نے زرینہ اور زبیدہ کو بتایا تھا۔ پولیس والوں کے سامنے زبان کھولنا تو شکوراں کی مجبوری تھی، لیکن محلے والوں کے سامنے زبان کھولنا اس کی مجبوری نہیں تھی۔ اس نے تو برسوں تک طویل عرصے تک یہاں رہنے کے دوران اپنی زبان ہمیشہ بند رکھی تھی۔

☆======☆======☆

حیدر علی کے مقدمہ قتل کی سماعت شروع ہو چکی تھی اور ماریہ بلگرامی وکیل صفائی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طور پر ملزم کا دفاع کر رہی تھی۔ ملزم قانون اور اپنے وکیل صفائی سے پوری طرح تعاون کر رہا تھا۔ وہ اب بدلا ہوا انسان تھا۔ اس کے اندر زندہ رہنے کی امنگ پیدا ہو گئی تھی۔ ماریہ نے اپنی غیر معمولی محنت کے ذریعے اس کے اندر سوئے ہوئے انسان کو جگا دیا تھا۔

ماریہ عدالت کے سامنے اس نفسیاتی پس منظر کی تفصیلات پیش کر رہی تھی۔ جس نے فرید کو ایسا بھیانک جرم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

قتل کی واردات کے بعد سے فرقان اور زبیدہ کے گھر کا وہ کمرہ خالی پڑا ہوا تھا اور فرقان اتنا زیادہ خوف زدہ تھا کہ اس نے اسے دوبارہ کرائے پر نہیں دیا تھا، لیکن اب معاملہ تقریباً سلجھ گیا تھا۔ فرید کے وجود کی دہشت ختم ہو گئی تھی۔ فرقان اور زبیدہ سوچ رہے تھے کہ اس کمرے کو پھر سے کرائے پر اٹھا دیں۔ ان کی آمدنی کا ایک ذریعہ بند پڑا تھا۔

اس روز شام کو اچانک ایک طویل عرصے کے بعد مختار ان کے گھر آیا جو فرید سے پہلے اس کمرے میں کرائے پر رہتا تھا۔ وہ دونوں میاں، بیوی مختار کے آنے سے بہت خوش ہوئے۔ وہ یہاں سے جانے کے بعد پہلی مرتبہ آیا تھا۔

''ابا کا انتقال ہو گیا۔'' مختار نے انہیں بتایا۔ ''دکان پر دونوں چھوٹے بھائیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ دکان میں سارا روپیہ انہی کا لگایا ہوا ہے۔ میں بھائیوں سے جھگڑا نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے دکان پر لعنت بھیج دی اور ایک بار پھر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے کورنگی کے اسی کارخانے میں کام پکڑ لیا ہے۔ جہاں میں پہلے کام کرتا تھا اور اب میں یہاں رہائش کی تلاش میں ہوں۔ تمہارے کمرے میں تو کوئی کرایہ دار رہ رہا ہو گا؟''

''نہیں.....!'' فرقان نے جلدی سے کہا۔ ''کمرہ تو خالی پڑا ہے۔'' اور اس نے مختصراً اسے قتل کی واردات کے بارے میں بتایا۔

''ارے حیدر علی ہائے ہائے.....! وہ تو میرا بڑا اچھا دوست تھا۔ اس کے ساتھ تو میرے بڑے اچھے مراسم تھے اور زرینہ بھی مجھے بڑے بھائی کی طرح سمجھتی تھی۔ افسوس..... اس عمر میں بے چاری بیوہ ہو گئی۔''

''ہم سب کو اس کے بیوہ ہونے کا بہت دکھ ہے۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''وہ بالکل تنہا ہو گئی ہے۔''

''تنہائی کا عذاب تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' مختار نے اداسی کے ساتھ کہا۔

''آج سے کئی سال پہلے جب میری بیوی نفیسہ بغیر اپنی کوئی نشانی چھوڑے ہوئے اس دنیا سے سدھار گئی تو میں کس قدر تنہا ہو گیا اور تب سے تنہا ہی ہوں۔ جب تک نفیسہ زندہ تھی تو ہم دونوں ساتھ رہتے تھے۔ اس کی موت کے بعد میں نے کورنگی کے کارخانے میں نوکری کر لی اور یہاں آ کر رہنے لگا۔ پھر ابا نے دکان کر لی اور انہوں نے اپنے پاس بلا لیا۔ ابا گزر گئے تو چھوٹے بھائیوں اور ان کی بیویوں نے میرا وہاں رہنا دوبھر کر دیا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ فی الحال میں اس گھر سے چلا جاؤں۔ وہ سب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مکان بیچ دیا جائے اور ہر ایک کو اس کے حصے کی رقم مل جائے۔ مجھے بھی یہ منظور ہے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔''

''میں نے تو تم سے کتنی بار کہا مختار بھائی کہ تم اپنا گھر بسا لو۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''میں نے تو تمہارے لیے کئی لڑکیاں بھی دیکھیں۔ مگر تم راضی ہی نہیں ہوئے''۔

''بس کیا بتائیں بھابی.....!'' مختار نے ایک لمبی اور گہری سانس لے کر کہا۔ ''نفیسہ کی موت کے بعد سے ہمارا تو دل ہی ٹوٹ گیا..... خیر..... تو اب یہ بتاؤ کہ کیا کمرہ خالی ہے۔ کرائے پر دینے کا ارادہ ہے؟''

''بالکل ارادہ ہے۔'' فرقان نے فوراً کہا۔ ''اور تم سے اچھا کرایہ دار بھلا اور کون ملے گا؟''

مختار اگلے ہی دن اس کے کمرے میں ایک بار پھر منتقل ہو گیا۔ جہاں سے وہ تقریباً سال بھر پہلے چلا گیا تھا۔ اسی روز شام کو زبیدہ کو ساتھ لے کر زرینہ کے پاس تعزیت کے لیے گیا۔ وہ بڑی دیر تک زرینہ سے باتیں کرتا رہا۔ خالہ شکوراں نے مہمانوں کے لیے چائے بنائی۔ مختار، خالہ شکوراں کو نہیں جانتا تھا۔ زرینہ نے اسے بتایا کہ خالہ شکوراں اس کی سسرالی رشتے دار ہیں اور چکوال سے آئی ہیں۔

اس دن کے بعد سے مختار اکثر زرینہ کے گھر جانے لگا۔ شکوراں اس کے آنے سے خاص طور سے بہت خوش ہوتی تھی اور اصرار کرتی تھی کہ وہ کھانا کھا کر جائے۔ وہ اسے روک کر خود باورچی خانے میں چلی جاتی تھی اور زرینہ اور مختار باتیں کرتے رہتے تھے۔ شکوراں باورچی خانے میں آتی ہوئی ان کی ہلکی ہلکی آوازیں سنتی اور اس کے وجود میں مسرت کی ہلکی ہلکی لہریں اٹھتی رہتیں۔

حیدر علی کی برسی کے موقع پر فاتحہ خوانی اور اس کے بعد کھانے کی تقریب میں محلے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کافی لوگ شریک ہوئے تھے۔ کھانا پکوانے کا کام مختار نے اپنے ذمے لیا تھا اور بڑے اہتمام سے اچھا کھانا پکوایا تھا اور کھلوایا تھا۔ اسے رات کو کافی دیر تک زرینہ کے گھر پر رکنا پڑا تھا۔ سب سے آخر میں اس نے خالہ شکوراں اور زرینہ کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔

حیدر علی کی برسی کے کوئی دو ماہ کے بعد ایک رات مختار خاص طور سے زبیدہ کے پاس آیا اور اور کہنے لگا۔ ''بھابی.....! تم بار بار مجھ سے کہتی تھیں کہ میں اپنا گھر بسالوں۔ میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔ اب میں دوبارہ اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں۔''

''واقعی.....؟'' زبیدہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر میں تمہارے لیے کوئی لڑکی تلاش کروں؟''

''نہیں بھابی.....!'' مختار نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔ ''لڑکی تو میں نے تلاش کر لی ہے۔ اب مجھے تم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''ارے تو جلدی سے بتاؤ نا کون ہے وہ؟'' زبیدہ نے بے تابی کے ساتھ کہا۔ ''محلے کی ہی کوئی لڑکی ہے یا تمہارے رشتے داروں وغیرہ میں.....؟''

''محلے کی ہی ہے بھابی.....!'' مختار نے کہا۔ ''بات یہ ہے بھابی کہ..... کہ..... میں زرینہ کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہوں۔''

''زرینہ سے.....؟'' زبیدہ ایک دم چونک کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ''زرینہ سے؟ کیا واقعی.....؟''

''ہاں بھابی.....!'' مختار نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''لیکن.....! لیکن کیا وہ تیار ہو جائے گی؟'' زبیدہ نے کہا۔ ''تم کو اس بارے میں کوئی اندازہ ہے؟''

''زرینہ بہت اچھی لڑکی ہے بھابی اور وہ مجھے ہمیشہ ہی اچھی لگی ہے۔'' مختار نے کہا۔ ''جب وہ حیدر علی کی بیوی تھی تب بھی اس کی بہت عزت کرتا تھا اور اب میں اسے اپنی زندگی کی ساتھی بنانا چاہتا ہوں..... اور وہ بھی اس کے لیے تیار ہے۔''

''تیار ہے.....؟'' زبیدہ نے چونک کر کہا۔ ''کیا تمہاری، میرا مطلب ہے اس سے کوئی بات ہوئی ہے؟''

ہاں.....!'' مختار نے کہا۔ ''لیکن اس طرح نہیں جس طرح تم سمجھ رہی ہو۔ یہ سارا کام خالہ شکوزاں نے کیا ہے۔ انہوں نے ہی پہلے مجھ سے اور پھر زرینہ سے بات کی

تھی۔ زرینہ تو اس بات سے بہت خوف زدہ تھی، لیکن خالہ شکوراں نے اس کی ہمت بڑھائی۔ انہوں نے ہی اس کو ساری اونچ نیچ سمجھا کر اس بات کے لیے آمادہ کر لیا اور پھر اسے میرے سامنے بٹھا کر اس سے میری بات کرادی۔ وہ مجھ سے نکاح کرنے پر تیار ہے اور یہ سارا کارنامہ خالہ شکوراں کا ہے۔''

''مبارک ہو!'' زبیدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بہت بہت مبارک ہو..... تم نے ایک بیوہ کا ہاتھ تھام کر بہت بڑا کام کیا ہے۔ خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔''

''یار.....! تم بڑے چھپے رستم نکلے۔'' فرقان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم نے چپکے ہی چپکے سب کچھ کر ڈالا اور ہمیں کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے دی۔''

''نہیں فرقان بھائی.....! ایسا نہیں ہے۔'' مختار نے کہا۔ ''ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور سب سے پہلے تم لوگوں کو بتا رہا ہوں۔ جو کچھ بھی ہوگا۔ تم لوگوں کے ہاتھوں ہی ہو گا۔''

''دعائیں دو خالہ شکوراں کو۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''اس عورت میں کتنی سمجھ ہے..... اس نے زرینہ کو دوسرے نکاح پر راضی کر لیا اور ایسا اس نے صرف تم دونوں کو خوش دیکھنے کے لیے کیا۔''

اگلے دن زبیدہ نے زرینہ کے گھر جا کر زرینہ سے اس بارے میں بات کی اور بعد میں شکوراں کو بھی گفتگو میں شریک کر لیا۔

''میں نے اس کو بہت سمجھایا۔ شکوراں نے زبیدہ سے کہا۔ ''زندگی ایسے موقع بار بار نہیں دیتی۔ وہ شخص تم کو اور تمہاری بچی کو اپنانے کے لیے تیار ہے۔ جو مر گیا اس کا غم اپنی جگہ، لیکن مر جانے والوں کے ساتھ انسان خود تو نہیں مر جاتا۔ جو زندہ رہ جاتا ہے۔ اسے زندہ رہنے کی سبیل بھی تلاش کرنی پڑتی ہے۔ زرینہ اس بات سے پریشان تھی کہ دنیا والے کیا کہیں گے۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ اس بات کو بالکل ہی بھول جائے۔ یہ اس کا اپنا مسئلہ ہے۔ دنیا والوں کا نہیں ہے۔ دوسری شادی کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔''

حیدر علی کی پہلی برسی کے تقریباً چھ ماہ کے بعد مختار اور زرینہ کا نکاح ہو گیا۔ سارے محلے والوں کو یہ بات معلوم تھی کہ اس شادی کے کرانے میں خالہ شکوراں نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ زرینہ کے تحفظ کے لیے اس کے آگے ڈھال بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے سارے محلے والوں کو یہ بات بتائی تھی اور بار بار بتائی تھی کہ زرینہ دوسری شادی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے تیار نہیں تھی اور یہ کہ اس نے خود زرینہ کو مجبور کیا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ خالہ شکوراں نے ساری ذمہ داری خود قبول کر لی تھی۔

زرینہ تو اس نیک اور مہربان دوست کو بہت ہی کم جانتی تھی جو برسوں پہلے حیدر علی سے اس کی شادی کے کچھ ہی عرصے بعد اس گھر سے چلی گئی تھی اور پھر پلٹ کر نہیں آئی تھی اور اب برسوں کے بعد وہ دوبارہ آ گئی تھی۔ زرینہ کو اس کے میاں کی موت کا پُرسہ دینے کے لیے...... اور اس کی آمد نے زرینہ کی زندگی کو ایک نیا مفہوم عطا کر دیا تھا۔ یہ شکوراں ہی تھی جس نے مختار کی حوصلہ افزائی کی اور زرینہ کو بھی شادی کے لیے راضی کر لیا۔

نکاح کے بعد مختار، زرینہ کے گھر میں ہی منتقل ہو گیا تھا اور اس نے وہ کمرہ چھوڑ دیا تھا۔ فرقان کو جلد ہی دوسرا کرایہ دار مل گیا۔

خالہ شکوراں کی کراچی میں موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ماریہ نے اس کو مقدمے کی سماعت کے دوران عدالتی گواہ کے طور پر پیش کیا اور اس کے بیان کے ذریعے اپنے صفائی کے مؤقف کے لیے حمایت حاصل کی۔

شکوراں نے فرید کو آخری بار اس وقت دیکھا تھا جب وہ تقریباً دس سال کا بچہ تھا اور اب برسوں کے بعد اس نے اس کو عدالت کے کٹہرے میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کی شکل میں دیکھا...... اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا...... یہ فرید تھا حمید الحسن اور صابرہ کا بیٹا...... جسے صابرہ نے ٹھکرا دیا تھا، لیکن بیٹی کے منہ موڑ لینے کے بعد وہ کتنے دکھ کے ساتھ اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کو یاد کرتی تھی اور اس کی واپسی کی متمنی تھی۔ وہ اس کے بارے میں اکثر باتیں کرتی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔

''اچھا ہوا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔'' شکوراں نے اپنے دل میں کہا۔ ''اپنے ایک بیٹے کے ہاتھوں اپنے دوسرے بیٹے کے قتل کا صدمہ وہ کس طرح برداشت کرتی؟ وہ اپنے آنسوؤں کے ذخیرے کو اپنے دونوں بیٹوں کے درمیان کس طرح تقسیم کر سکتی تھی؟ آنسوؤں کی تقسیم کا یہ عمل اس کے لیے کس قدر اذیت ناک ہوتا اور یہ بھی اچھا ہے کہ صفدر علی زندہ نہیں ہے...... وہ اگر زندہ ہوتا تو...... تو...... فرید کے ہاتھوں قتل ہو جاتا اور صابرہ کو نہ جانے کتنے عذاب جھیلنے پڑتے۔''

پیشی کے اختتام پر شکوراں نے فرید سے ملاقات کی اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگے۔ فرید کو اس دن کے بعد سے جب وہ اپنے گھر سے نکل کر بھاگا

تھا۔ اسے شکوراں بہت اچھی طرح یاد تھی۔ وہ عمر رسیدہ عورت صفدر علی کی بیوی زینت کی بیماری کے زمانے میں صفدر علی کے گھر جا کر رہی تھی اور پھر انہی لوگوں کے ساتھ رہنے لگی تھی...... وہی عورت جو زینت کی موت کے بعد صفدر علی کے ساتھ ان لوگوں کے گھر آئی تھی آپا کے لیے منور علی کا پیغام لے کر اور ابا نے صاف منع کر دیا تھا...... فرید کو ساری باتیں یاد تھیں۔ وہ سب کچھ ماضی میں دفن ہو چکا تھا...... اب نہ ابا تھے، نہ اماں تھیں، نہ صفدر علی تھا، نہ منور علی تھا، وہ سب لوگ مٹی ہو کر مٹی میں مل چکے تھے اور گزرے ہوئے دور کی ایک پرچھائیں خالہ شکوراں کی صورت میں اس کی نظروں کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی...... افوہ کتنی بوڑھی ہو گئی تھی خالہ شکوراں......!

اس کے اور خالہ شکوراں کے پاس ایک دوسرے سے کہنے سننے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ دونوں بالکل الگ الگ سمتوں سے چلتے ہوئے آ رہے تھے اور قسمت نے انہیں ایک مشترکہ عارضی پڑاؤ پر پہنچا دیا تھا۔

''تو ٹھیک تو ہے بیٹا......؟'' شکوراں نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ اس سے پوچھا۔

''ہاں خالہ شکوراں......! میں ٹھیک . . .'' فرید نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم کیسی ہو؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں بیٹا......!'' شکوراں نے جواب دیا۔ ''خدا تجھ کو خوش رکھے۔''

سپاہی فرید کو لے گئے۔ شکوراں واپس گھر آ گئی۔ اس نے اپنی سرتوڑ کوششوں کے ذریعے فرید کے ہاتھوں قتل ہونے والے حیدر علی کی بیوہ کی دوسری شادی کروا دی تھی اور اب وہ فرید کی رہائی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ جس روز عدالت میں حیدر علی کے مقدمہ قتل کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ اس دن عدالت میں اور لوگوں کے علاوہ شکوراں بھی موجود تھی۔ زرینہ جو کافی پہلے تو پیشیوں میں آتی رہتی تھی۔ آج موجود نہیں تھی۔ نکاح کے بعد سے اس نے پیشی کے دن عدالت میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کی گزشتہ بساط کو لپیٹ چکی تھی اور اب اس کے سامنے زندگی کا ایک نیا افق روشن ہو رہا تھا۔ اس کے گھر میں ایک نیا مہمان آنے والا تھا۔ وہ پھر سے ماں بننے والی تھی...... مختار کے ہونے والے بچے کی ماں...... اور یہ تصور ہی اس کے لیے حد درجہ نشاط انگیز تھا۔ اس کے دل میں اب اس بات کی کوئی تڑپ موجود نہیں تھی کہ عدالت فرید کو پھانسی پر لٹکا دے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زرینہ کے وابستگان میں سے کوئی عدالت میں موجود نہیں تھا۔ اس کیس سے سب کی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔

ماریہ نے فرید کا کیس بہت پُر زور دلائل کے ساتھ لڑا تھا اور ملزم کے ساتھ پیش آنے والے گھریلو حالات کی روشنی میں اس کی ذہنی حالت کا تجزیہ کرتے ہوئے عدالت سے اس کے لیے رحم اور رعایت کی استدعا کی تھی۔

عدالت نے سارے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اور اس قاتلانہ حملہ کے تمام محرکات اور نفسیاتی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ملزم کی مخصوص ذہنی حالت کے پیش نظر اسے پانچ سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ ماریہ کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''فی الحقیقت یہ سزا میری توقع سے بہت کم ہے۔'' ماریہ نے فرید سے کہا۔ ''پانچ سال سے بھی کم عرصے میں تم رہا ہو جاؤ گے اور اس کے بعد تم ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہو..... ابھی تو تمہیں بہت دنوں تک جینا ہے۔''

''میں..... رہا ہونے کے بعد کیا کروں گا؟'' فرید نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کرنے کے لیے تو بہت کچھ ہے بیٹا.....!'' ماریہ کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی شکوراں نے اس کے سر کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''جب تم رہا ہو کر آؤ گے تب تک میں تو زندہ نہیں ہوں گی۔ ورنہ میں خود تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈ دیتی..... مگر ماریہ صاحبہ یہ کام ضرور کریں گی۔ وہ کسی بہت اچھی عورت سے تمہاری شادی کرا دیں گی۔ بس پھر اطمینان سے زندگی گزارنا، اللہ اپنا فضل کرے گا۔''

''ہاں خالہ شکوراں.....!'' ماریہ نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے خود فرید کے بارے میں یہی سوچ رکھا ہے۔ یہ پانچ سال سے کم کی مدت میں رہا ہو جائے گا۔ پھر میں اس کے لیے کام کا بھی بندوبست کر دوں گی۔ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔''

''خدا تمہیں خوش رکھے بیٹی.....!'' شکوراں نے دعائیہ انداز میں کہا۔ ''اب مجھ پورا یقین آ گیا ہے کہ اگر تم نہ ہوتیں تو آج عدالت فرید کو صرف پانچ سال قید کی نہیں بلکہ پھانسی کی سزا دیتی۔ اس کو یہ نئی زندگی تم نے ہی دی ہے۔''

شکوراں گھر آ گئی۔ پچھلے چند ماہ سے اس کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ زرینہ ماں بننے والی تھی اور اسے احتیاط اور آرام کی ضرورت تھی۔ خالہ شکوراں جس کی عمر کا بیشتر حصہ ایسے ہی کاموں میں گزرا تھا۔ اس کا پوری طرح سے خیال رکھے ہوئے

تھی۔ زرینہ کے لیے شکوراں کا وجود کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔

کچھ دنوں کے بعد زرینہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ زرینہ خوشی کے مارے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ برسوں پہلے ایک بیٹی کے علاوہ اس کے پھر کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی تھی اور بیوہ ہو جانے کے بعد تو پھر سب کچھ ختم ہو گیا تھا، لیکن برسوں کی خشک سالی اور خزاں رسیدگی کے بعد اس کی زندگی کے اجڑے ہوئے گلشن میں ایک بار پھر بہار کی نرم و تازہ ہوا کے جھونکے سرسرانے لگے تھے اور وہ ان ہواؤں میں اڑتی چلی جا رہی تھی۔

شکوراں نے نانی، دادی اور ماں بن کر اس بچے کی پرورش کرنی شروع کر دی۔ زرینہ کو یقین تھا کہ اگر اس کی اپنی ماں یا ساس زندہ ہوتی تو وہ بھی اس بچے کے لیے اتنا زدہ نہیں کر سکتی تھی۔ زرینہ کو تو بچے کا بہت کم کام کرنا پڑتا تھا۔

بچہ چھ ماہ کا ہو گیا تو شکوراں نے زرینہ کو بتایا کہ اب وہ واپس نصیر پور جا رہی ہے۔

مختار اور زرینہ پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ ان دونوں نے تو خالہ شکوراں کو اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھ کر اپنے اندر جذب کر لیا تھا اور ان کو یقین تھا کہ شکوراں اب ان کے پاس سے کہیں نہیں جائے گی، لیکن شکوراں نے تو ایک دم جانے کی ٹھان لی۔

''زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں بیٹا.....!'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''کون جانے کب بلاوا آ جائے۔ میں اپنے گاؤں کی مٹی میں مل جانا چاہتی ہوں۔ ویسے تو بیٹا! مٹی مٹی سب برابر ہوتی ہے۔ ہر جگہ کی مٹی ایک ہی جیسی ہوتی ہے اور سارے مُردے بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مٹی میں مل کر سب مٹی ہی تو ہو جاتے ہیں۔ مگر میں اس مٹی میں مل جانا چاہتی ہوں جس میں میرے پُرکھے دفن ہیں۔ وہ راتوں کو خواب میں آ کر مجھے اپنے پاس بلاتے ہیں۔ میں اب ان کی طرف لوٹ رہی ہوں۔ بچے کا خیال رکھنا، خدا اس کی عمر دراز کرے۔ میں تمہیں نصیر پور میں اپنے رشتے دار کا پتہ دے کر جاؤں گی۔ مجھے خط لکھنا اور اگر کبھی موقع ملے تو نصیر پور آنا..... بہت اچھی جگہ ہے..... بہت کھلی ہوئی..... بہت سرسبز و شاداب..... چکوال پہنچ جاؤ گے تو وہاں سے نصیر پور آنا بہت آسان ہے۔''

خالہ شکوراں چلی گئی۔ مختار اور زرینہ اسے ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے گئے تھے۔ وہ آخر وقت تک اسے اس بات پر راضی کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے تھے کہ وہ نہ جائے۔

اس رات زرینہ کا گھر خالہ شکوراں کے وجود سے خالی تھا۔ مختار اپنے بستر پر بے خبر سو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہا تھا اور زرینہ اپنے ننھے سے بچے کو سینے سے لگائے جاگ رہی تھی۔ گھر میں بڑا گہرا سناٹا تھا..... زرینہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی دور دراز نامعلوم جگہ سے کوئی مہربان فرشتہ فضاؤں میں اڑتا ہوا آیا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک محبت کرنے والے شوہر کا ہاتھ دے کر اور اس کی گود میں ایک پیارا سا بچہ ڈال کر چپکے سے اسی دنیا میں واپس چلا گیا تھا۔ جہاں سے وہ آیا تھا۔

☆====== ختم شد ======☆